UNIVERSAL
LIBRARY
OU_188644
UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—881—5-8-74—15,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵ ک۲۳۴ Accession No. U. 15364

Author ک - ک

کرشن چندر

Title ہمارے سپنے

This book should be returned on or before the date last marked below.

تعارف

کرشن چندر

صفحات :- ۳۰

۱

قرۃ العین حیدر کے افسانے میں اُس زمانے سے پڑھ رہا ہوں، جب ان میں آدھے سے زیادہ الفاظ اُردو کے بجائے انگریزی کے ہوا کرتے تھے۔ جُوں جُوں اُنکے افسانوں میں پختگی آتی گئی۔ انگریزی الفاظ خود بخود کم ہوتے گئے۔ اب اُنکے ہاں صرف پھولوں اور چند ایک درختوں کے انگریزی نام رہ گئے ہیں۔ اور وہ بھی وہ جنکے لئے شاید اُردو میں اچھے ترجمے دستیاب نہیں ہوتے۔ اُنکے کردار بھی اب شائستہ اُردو بولنے لگے ہیں۔ اور طرزِ تحریر میں بھی اب وہ سطحی جلا نہیں رہی جو کانونٹ کی مرغوب تعلیم کا خاصہ سمجھی جاتی ہے۔ نہ تفکر میں اب وہ شوخ ناتجربہ کاری ہے۔ جسے درصل الجان سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اب اُنکی تحریروں میں اک ایسے مغموم گہراؤ کی جھلک آتی جارہی ہے۔ اور اک ایسے جمالیاتی ضبط کا پتہ چلتا ہے۔ جسے ادیب حاصل کرکے سچائی اور نیکی کیلئے اپنے تجسّس کا اظہار کرتا ہے۔ اور اُسکی تحقیق میں اپنے ماحول اور اپنے سماج کو ناقدانہ نگاہوں سے دیکھتا ہے

اور اپنے شعور میں تنظیم نہ اپنے علم میں سائنس اور تجربے میں منطق اور عقلیت کو جگہ دیتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں ادبی عظمت کا سراغ ملتا ہے۔ گو اس منزل تک پہنچنے کیلئے بڑی کاوش کی ضرورت ہے۔ کیونکہ زندگی کی ہر تلخ سچائی اک ایسا نشتر ہے جس کا پہلا وار ادیب کے سینے پر ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر ہماری افسانوی دنیا کی سنڈریلا ہے۔ جو ہاتھ میں شیشے کا سلیپر تھامے شہزادوں کے محلات میں گھومتی ہے۔ اور نیلے دریچوں سے اندر جھانک کر اُن آراستہ کمروں تک جا پہنچتی ہے۔ جہاں یورپی کے تعلقہ دار اور ٹھاکر اور رانیاں بڑے خوبصورت اور جذباتی انداز میں جاگیردارانہ محبت کا آخری کھیل کھیلنے میں مصروف ہیں۔ سُبک خرام فوجی افسر اور مغرور آئی سی ایس شہزادے، اور اجنبی دیس کے سپید دیوتا نازک حسیناؤں سے خراجِ تحسین وصول کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگیوں کا محور سماجی نہیں ہے شخصی ہے عقلی نہیں ہے۔ جذباتی ہے۔ یہ لوگ بڑے خوبصورت محلات میں رہتے ہیں۔ اُجلے اُجلے مکلف لباس زیبِ تن کئے۔ ویسے ہی فقرے بولتے ہوئے۔ چلتے ہوئے سطحی بے جان فقرے جو انکی زندگیوں کے آئینہ دار ہیں۔ بڑی تیز روشنی میں یہ لوگ رہتے ہیں۔ باہر سے دیکھنے والے کی آنکھیں چُندھیا جاتی ہیں۔ کیونکہ محل کے اِدھر اُدھر اندھیرا ہے۔ اور مرمریں رقص گاہوں کے باہر موت کا سناٹا ہے۔ اور یہ اندھیرا اور یہ سناٹا اک خطرناک سیلن کی طرح اس محل اور اس رقص گاہ کے اندر بڑھ رہا ہے۔ پہلے پہل قرۃ العین حیدر نے صرف رقص گاہ کی روشنی دیکھی تھی۔ اب اُس نے باہر کا اندھیرا بھی دیکھ لیا ہے۔ اور خوف و حیرت سے گھٹی گھٹی بات میں شیشے کا سلیپر لئے یہ ادبی سنڈریلا نیلے دریچوں سے کبھی اندر کو جھانکتی ہے کبھی باہر دیکھتی ہے۔ اسے جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔۔۔۔

قرۃ العین حیدر نے اوپر کے طبقے کی فرحت ناک رنگینیوں کا ذکر بڑی شاداب

زبان میں کیا ہے۔ یہ فرحت ناک رنگینی کہاں سے آئی۔ اس سرخی میں کس کا خون مضمر ہے۔ اسکے ذکر میں انھوں نے بڑی کوتاہی برتی ہے۔ کہیں کہیں گم سے اشارے ہیں۔ جواب واضح ہوتے جارہے ہیں۔ انکے تازہ افسانے میں جو تقسیم ہند سے متعلق ہے اور اکتوبر کے ساتھی میں چھپا ہے۔ یہ اشارے اک گہرے تجسس کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں تو وہ ایک مرد اور ایک عورت کی انفرادی محبت کو چھوڑ کر انسانی محبت اور نفرت کے موضوع پر سوچ رہی ہیں۔ تقسیم ہند کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہی ہیں۔ مذہب کے خداؤں کو زخمی دیکھتی ہے۔ صلیب کو شکستہ پاتی ہیں۔ پھولوں کو مسلا دیکھتی ہیں۔ اور موت کے بھاری پاؤں کو زندگی کے سُبک سینے پر ہر زنجیر کی طرح آویزاں دیکھکر چیخ اُٹھتی ہیں۔ اور انھیں پہلی بار اپنے چاروں طرف موت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ موت دراصل اوپر کے طبقے کی لائی ہوئی موت ہے۔ یہ مرتے ہوئے سماج کی خودکشی ہے۔ جسے وہ زندگی کی شکست سے تعبیر کر رہی ہیں۔ اُوپر کے طبقے نے اپنا آخری داؤں پھینکا ہے۔ اور اُسمیں اُسکی ساری تہذیبی ثقافتی اور اخلاقی قدریں برہنہ ہوگئی ہیں۔ اگر قرۃ العین حیدر نے اس طبقے کے بھیانک روپ کو دیکھ لیا۔ سمجھ لیا۔ اسکا ادبی احاطہ کرلیا۔ تو پھر شاید اس احساس شکست کے فوراً بعد ہی انھیں زندگی کی کرن پھوٹتی ہوئی دکھائی دیگی۔ اور وہ دیکھ لینگی۔ کہ صنوبر کے خوبصورت پیڑ اور شمشاد کے حسین بوٹے اور چنار کے شعلہ رو پتے صرف اس مصرف کے نہیں ہیں کہ وہ امیروں کے باغوں میں اُگا کریں۔ بلکہ وہ توجہ واہوں کی محبت کی آماجگہ ہیں۔ محنت کش کسانوں کی چوپال ہیں۔ اور اس سماجی زندگی کا محور ہیں جسکی جڑیں زمین میں ہیں۔ اور اسلئے انسان کے دل میں ارتقاء کو اک لافانی تصور کی طرح جاوداں ہیں۔

بہرحال ہمیں سنڈریلا کے سنہرے معجزے کا انتظار کرنا چاہیئے۔

شفیق الرحمن کو تفنن بیحد پسند ہے۔ جب وہ لاہور میں میڈیکل کالج ہی میں پڑھتے تھے جب بھی اُنکی یہی حالت تھی۔ وہ مُردوں کو چیرنے پھاڑنے کے بجائے مشاعرے منعقد کرنے میں زیادہ مصروف رہا کرتے تھے ٹینس کے بے حد شوقین تھے۔ اور چونکہ خوبصورت تھے۔ اسلئے اس بات پر بھی ایمان رکھتے تھے کہ دنیا کی کوئی خوبصورت عورت نہیں جو انپر نہ مرتی ہو شفیق تو خیر وجیہہ ہیں وہ یہ اور کرلیں تو کوئی اتنی بُری بات نہیں میں نے تو بڑے بڑے چمرخ قسم کے ادیبوں کو اس قسم کے دعوے کرتے ہوئے سُنا ہے یعنی ایسے لوگ کہ جنکے پاس سے عورت تو کجا اسکو چھچھوندر بھی قریب سے گذر جائے تو دوبارہ دو کوس تک نزدیک نہ آنے کا نام لے۔ یہ ہمارے بورژوائی سماج کی خصوصیت ہے۔ کہ عورت کے معاملے میں ہر مرد بڑا شیخی خور ہوتا ہے۔ اور مور کی طرح اپنے سنہرے خوابوں کے پنکھ پھیلا پھیلا کے دوستوں کو پریشان کرتا رہتا ہے عورت کو صنف حقیر بلکہ جنس خرید و فروخت سمجھتا ہے۔ اور ادھر سے محبت کی ملمع سازی کرتا رہتا ہے شفیق کے شروع کے رومانی افسانے ایسے ہی شیخی خوروں کی محبت کی تضحیک کے افسانے ہیں بعد میں جب جذبات کی آندھی اُتر گئی۔ تو تضحیک طنز میں اور رومان حقیقت میں مبدّل ہونے لگا۔ اور افسانوں میں بورژوائی سماج کی جھوٹی محبت کا راز فاش کیا جانے لگا۔ اور چھوٹے چھوٹے مگر بیحد بلیغ اشاروں میں ایسی محبت کی سوداے بازی کو بے نقاب کیا جانے لگا۔

شفیق رومان سے بیٹھ موڑ کے حقیقت کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ مگر اک بلند سطح سے۔ آنکھوں پر بیش قیمت گاگلز لگائے ہوئے۔ اُنکی بغل میں اُنکی محبوبہ لباس فاخرہ زیب تن کئے کھڑی ہے۔ اور وہ اُسے اپنی دُوربین دے کے کہتے ہیں۔ "ڈارلنگ وہ دیکھو نیچے غریبوں کے جھونپڑے۔ اُس عورت کے چیتھڑے دیکھو۔ اُس معصوم یتیم کے آنسو

ملاحظہ فرمایئے۔ مگر اُنھیں تلاشِ حق میں گھاٹی سے نیچے اُترنا پڑیگا۔ یہ مُیں اُنھیں بہت شروع ہی سے کہہ رہا ہوں مگر اُنکا ہلکا ہلکا مزاحیہ طنزیہ انداز نگارش مجھے بیحد پسند ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب وہ گھاٹی سے نیچے اُتریں۔ تو اپنے قہقہے۔ اپنی ہنسی، اپنا طنزیہ تبسم ساتھ لائیں۔ ہمارے ہاں ان چیزوں کی بہت کمی ہے۔ یہ رنگینی جسمیں بہار کے سارے رنگ موجود ہیں۔ اسکی صحیح پرکھ اور قدر کچھ ہمارا ادب ہی کر سکتا ہے۔ جب چیخوف نے اپنے بہارا فروز رنگوں کو غریبوں کی دنیا میں بکھیر دیا۔ جب اُسکا ہنستا ہوا طنز لٹے ہوئے انسانوں کی سپر بن گیا۔ تو دنیائے ادب کو اک لافانی مصنف نصیب ہوا۔ میں کوئی نئی انہونی ناممکن بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ پرکھی ہوئی آزمائی ہوئی ہے۔ اسکے نشے سے کون کافر انکار کریگا۔ "علی بابا" کی کامیاب پیروڈی اک نتھری نتھری سیال شئے لطیف ہے اسکے ہلکے ہلکے سوندھے پن سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن اسکے سہ آتشہ ہو جانا چاہیئے شفیق کبھی کبھی اپنی ہنسی میں آنسو بھر دیتا ہے۔ اور یہ ایک بہت بڑا کمال ہے لیکن کیا اُسے یہ معلوم نہیں۔ کہ اب ہمیں آنسو نہیں آگ چاہیئے۔ ہنسی کے پردے میں آگ ٹھٹھا مار کر بھڑک اُٹھنے والی آگ۔ شفیق ڈاکٹر ہے۔ وہ ناسور کو بھی پہچانتا ہے اور نشتر کو بھی۔ چیخوف بھی ڈاکٹر تھا۔ اور شروع شروع میں شفیق کے اوّلین دور کے سے افسانے اور مضامین لکھا کرتا تھا۔ شاید میں بہت دور کی سوچ رہا ہوں لیکن سوچنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ کاش ایسا بھی ہو جائے۔ کاش ایسا ہی ہو جائے۔

ہاجرہ مسرور کو میں نے کبھی مسرور نہیں پایا۔ افسانوں میں جب ملیں روتی ہوئی ملیں۔ ایکبار زندگی کی خارجی ہیئت میں بھی دیکھا تھا۔ متانت اور سنجیدگی کا پیروقار مجسّم مرعوب ہونا پڑا۔ انکی افسانہ نگاری کے تدریجی ارتقاء کی صورت یہ ہے۔ کہ یہ اُچھل کود کی شروع ہی سے قائل نہ تھیں۔ اسلئے قرۃ العین حیدر کی معصومانہ چہلوں

عصمت چغتائی کے شروع کے افسانوں کی بھاگ دوڑ سے کنارہ کشی اختیار کر کے انھوں نے شروع ہی سے بڑی بوڑھیوں کا پختہ انداز اختیار کر لیا یعنی جب ہم افسانہ نگار بنے تو سات برس سے چلے۔ یہ ستر برس سے چلیں، شروع شروع میں تو انھوں نے بات بڑھا بڑھا کے اپنی ہی جنس کو یعنی عورتوں کو وہ کوسنے دیئے ہیں کہ معزز خواتین چڑ چڑا گئیں۔ بعد میں شاید انھوں نے سوچا ہوگا۔ کہ اسمیں صرف عورتوں کا قصور نہیں ہے۔ یہ کمبخت مرد بھی ایک نمبر کا جھوٹا اور فتنہ ساز ہے۔ جب یہ سوچا تو ارتقاء کی دوسری منزل آئی یعنی عمل اور ضد۔ اس سے افسانے میں اک ایسا تواتر پیدا ہوا۔ جو اس سے پہلے مفقود تھا۔ عورت اور مرد کی باہمی آویزشوں کھینچا تانیوں اور دھوکے بازیوں کے پول کھولے گئے۔ اور یہ سب کچھ داخلی، شخصی اور نفسیاتی اعتبار سے ہوا۔ اسلئے پہلے سے بہتر پھر بھی نامکمل صورت میں ہوا۔ چنانچہ بعض افسانوں میں جذبات کا غیض و غضب اک مریضانہ مجنونانہ کیفیت اختیار کر لیتا ہے۔ دراصل ابتک ہاجرہ مسرور فرد واحد کو مریض سمجھتی رہیں۔ انھیں یہ پتہ نہ تھا۔ کہ پورا نظام زندگی مریض ہے۔ مدقوق ہے، اور اپنے مدفن کی تلاش میں ہے۔

اور جب مدفن کا پتہ چلا تو گویا عرفان حاصل ہوگیا۔ ہاجرہ کو موت کے دہانے پر جاکر زندگی کی طرف پلٹنا پڑا۔ یہ مقام بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ بہت سے ادیب اس منزل پر پہنچکر قعرِ فنا میں چھلانگ لگا دیتے ہیں، اور تنزل۔ موت، بدی اور فسطائیت سے ایسا رشتہ استوار کرتے ہیں۔ کہ پھر کبھی زندگی کیطرف نہیں لوٹ سکتے لیکن ہاجرہ نے بڑی ہمت سے کام لیا ہے جب سے وہ لوٹکے آئی ہیں انکے افسانوں سماجی شعور جاگ اٹھا ہے۔ یہ انکے افسانوی ارتقاء کی تیسری منزل ہے۔ اور اک روشن اور تاباں مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اب ہاجرہ پہلے کی طرح بڈھی عورتوں کی طرح بات بڑھا بڑھا کے کوسنے نہیں دیتی ہیں۔ چڑچڑاتی نہیں ہیں۔

اُنکے افسانوں کو ہسٹریا کے دورے نہیں پڑتے ہیں۔ اُنکے نئے افسانوں میں اک لطیف طنز آمیز نسائیت ہے۔ اک ایسی گہری سُوجھ بُوجھ ہے۔ جو لوکھ کی طرح خنک اور مائل تخلیق ہے، اور میں تو یہ کہونگا کہ اُنکے بعض بالکل ہی تازہ افسانوں میں تو ایسی نسائیت کا غبار بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور اُنکا اندازِ نگارش اُس بلند سطح پر آرہا ہے جہاں پہنچکر مرد ادیب اور عورت ادیب کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ اس امتیاز کا بیشتر حصہ دراصل بورژوائی مزاج۔ ماحول۔ سماج اور تواتر کا نتیجہ ہے۔ ادب کے صحیح سماجی شعور میں اور اُسکے تاریخی شعور کی سربلندیوں میں اس قسم کے امتیاز کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں ترقی پسند ادب مردانہ ادب اور زنانہ ادب مُرانہ فرکس اور زنانہ فرکس، مذکر سائنس اور مؤنث سائنس کی بے معنی ترکیبوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

کاروبار میں افسانے کا طویل پھیلاؤ سماجی ہے شخصی نہیں ہے۔ یہ ہاجرہ مسرور کے بہت اچھے افسانوں میں سے ہے۔ اسکے کردار شہری ہیں۔ اور اپنے ماحول میں رسے بسے معلوم ہوتے ہیں۔ مرکزی نقطہ وہ انسانی محبت ہے جو لین دین کے منافع خور سماج میں اسقدر مسخ ہوجاتی ہے۔ کہ محبت اور ہوس میں امتیاز کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اور جذبات اسقدر سستی رقیق صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ کہ اُن کی اصل صورت پہچانی نہیں جاتی۔ کاروبار میں ایک فقرہ ہے "مجھے نوچو مجھے کاٹو۔ اور پھر مجھے کچھ پیسے دیدو" دراصل یہ محبت کا نوحہ ہے جسکی حیثیت ہمارے سماج میں اک کاروبار کی سی ہوگئی ہے۔ کیونکہ یہ کاروباری سماج۔ یہ سرمایہ پرستی کا چوربازاری سماج زندگی کی حسین سے حسین شے کو بھی خرید و فروخت کی لپیٹ میں لے آتا ہے ہاجرہ مسرور نے نہایت متنوع اور دلکش الفاظ میں مرتے ہوئے سماج میں محبت کا نوحہ کہا ہے۔ نثر میں ہے لیکن اسکی ساری کی ساری صنعت شاعرانہ ہے۔

ابوالفضل صدیقی اگر جاگیردار نہوتے تو مولوی ہوتے، اگر افسانہ نگار نہوتے تو سکول ماسٹر ہوتے۔ صدیقی اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں۔ جو ہر صورت سے بال بال بچ جاتے ہیں۔ اور اسپر بھی نہیں جانتے کہ وہ بال بال بچگئے ہیں بس اک عجب اندازِ تغافل سے ادھر اُدھر کے تماشائیوں سے بے نیاز ہوکر اپنے راستے پر چلتے جاتے ہیں۔ انھیں وراثت میں زمینداری ملی لیکن عقل باغی ملی۔ بال بال بچگئے۔ اُنھوں نے افسانہ نگاری شروع کی لیکن گہرے تجربے کے بعد۔ دقیق مشاہدے کے بعد اور اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد۔ پھر بال بال بچگئے۔ اور اب بھی وہ اک ایسے تنگ راستے پر چل رہے ہیں جو ترقی پسندوں اور تنزل پسندوں کے بیچ میں جاتا ہے۔ کہ ذرا بھی قدم اِدھر اُدھر ہوا نہیں۔ کہ وہ لڑھکے بگرا بھی تک بال بال بچے ہوئے چلے جارہے ہیں۔ بڑی ہوشیاری سے بڑی مستعدی سے۔ اک بڑی مذہبی قسم کی لگن کیساتھ۔ جسے شاید کسی مذہب سے اتنا تعلق نہیں ہے۔ جتنا اُنکی اُفتادِ طبع سے جو ہر چیز کو اچھیطرح ٹھونک بجاکے دیکھتی ہے۔ صدیقی ڈیکارٹ کے فلسفۂ تشکیک کے ضرورت سے زیادہ قائل معلوم ہوتے ہیں۔ اسلئے وہ دونوں طرف سے ہٹتے ہوئے الگ جارہے ہیں۔ پھر بھی اُنکا راستہ ترقی پسندوں کے بہت زیادہ نزدیک ہے۔ اور تنزل پسندوں سے بہت دُور ہے۔ وہ دور والوں کو دُوری سے دیکھتے ہیں۔ اور نزدیک والوں کو شُبہ سے، اک عاقل دنیادار کیطرح وہ ترقی پسندوں کو اچھیطرح سے ٹھونک بجا کے دیکھ لینا چاہتے ہیں۔ کہ کہیں انمیں خامکاری تو نہیں۔ حالانکہ خامکاری کس ادب میں نہیں ہوتی سوال تو بنیادی اصولوں کا ہے۔

ابوالفضل صدیقی ایک متمول زمیندار کیطرح شکار کے بیحد شایق رہے ہیں ہفتوں مہینے ترائی کے علاقے میں گھوما کئے ہیں۔ وہ جنگل کی سانس سُنتے ہیں ہوا کا رُخ سمجھتے ہیں۔ اور شکار کی بُو سُونگھ سکتے ہیں۔ اُنکے افسانوں میں جہاں جہاں

جنگل کا ذکر ملتا ہے۔ اُسکی تفسیر اسقدر جامع اور مکمل ہوتی ہے۔ کہ خود بخود اعلیٰ ارفع اور خوبصورت ادب کا ٹکڑا بنجاتی ہے۔ تجربے کی گہرائی۔ مشاہدے کی وسعت بیان کی شدت، تینوں کا امتزاج اک نئی سچائی کی صورت میں ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ہم دیر تک اسے پڑھ کے محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔

صدیقی کے افسانوں میں زمینداری دور کے ختم ہو جانے کا احساس تو ملتا ہے لیکن اس خلاء کو پورا کرنے کا جو سماجی شعور ہے۔ اُسکا اتنا پختہ احساس نہیں ملتا کیونکہ وہ ابھی تک ترقی پسند نظریوں کو شبہ کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اس شبہ میں غالب رنگ ہمدردی کا ہے لیکن ابھی جذبۂ رفاقت مفقود ہے۔ اسلئے جہاں زمینداری کا ذکر یاس، قنوط اور سنک سے ہوتا ہے، وہاں زمینداری کے شکار مزدور اور کسانوں کا ذکر یا تو غائب ہوتا ہے۔ اور اگر ہوتا ہے۔ تو اُس یاس قنوط سنک یا تضحیک کے خفیف پہلوؤں سے جس سے سچی رفاقت کی بُو نہیں آتی۔ ہمدردی ضرور ہے لیکن شبہ کیساتھ۔ صدیقی ابھی اپنے طبقے سے الگ نہیں ہوئے اسکی موت کا تعین رکھتے ہوئے بھی ابھی اس سے الگ نہیں ہوئے۔ اپنے طبقے سے الگ ہونا در اصل بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ اور پھر ایک حساس آدمی کیلئے یہ تو جیتے جی مر جانا ہے اور مر کر دوسری زندگی پانا ہے۔ یہ میں کیونکر سمجھ لوں کہ صدیقی ایسے ذی ہوش بالغ شعور کے مالک ادیب دوسری زندگی حاصل کرنا نہیں چاہتے۔

صدیقی اپنے افسانوں میں زیر لب مسکراتے رہتے ہیں۔ وہ اک متین سنجیدہ تبسم کے قائل ہیں۔ قہقہہ مار کے ہنسنا بدتمیزی سمجھتے ہیں۔ آپ اُنکے الفاظ کا رنگ دیکھئے اُنکے فقروں کی بندش۔ اُنکے اسلوب کی گھمبیرتا۔ جیسے کسی نے ہنسی کو نکیل ڈالدی ہو بس آپ اتنا ہنس سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اتنا مُنہ کھول سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں کہیں کہیں وہ اپنے طنزیہ اسلوب میں نذیر احمد دہلوی مرحوم

کے مرثیے کو چھو لیتے ہیں۔ اور کہیں وہ اسکے شاعرانہ اظہار بیان میں بالکل اکبر الہ آبادی ہو جاتے ہیں۔ مُنکر کے کردار اگر نذیر احمد گھڑتے تو اس سے بہتر نہیں گھڑ سکتے۔ اور اکبر الہ آبادی اُنپر شاعرانہ طنز فرماتے تو اس سے بہتر نہیں کر سکتے تھے اس افسانے میں صدیقی نے دولت والوں کی کھوکھلی جنسی قدروں کا تجزیہ کیا ہے۔ اور اُنکے اخلاقی اقدار کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ نہفتہ نفرت جو اس کھوکھلے سماج سے صدیقی کو ہے۔ اک آتش سیال کیطرح اس افسانے کی رگ رگ میں دوڑتی ہے۔ میں ہوتا تو بالکل سکول ماسٹر کیطرح وعظ کرنے لگتا۔ صدیقی بھی مولوی ہونے سے بال بال بچے ہیں۔ ایک دو جگہ وعظ کے بہترین مواقع بہم پہنچے لیکن یہاں بھی صدیقی ــــ بس یوں سمجھیئے کہ بال بال بچگئے۔

صدیقی کی میانہ روی بھی خاص خاص حالات میں بڑی عمدہ شے ہے مگر آجکل ہماری پوری تہذیب و ثقافت ادب اور سیاست کے تقاضے اس قدر شدید صورت اختیار کر چکے ہیں کہ دنیا سے یہ میانہ روی یہ بیچ کا رستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ آج تو آپ یا اِدھر ہیں۔ اور یا پھر اُدھر ہیں۔ کبھی زندگی میں یہ منزل بھی آجاتی ہے کہ دو راہے کو تلوار کی دھار سے کاٹ دینا پڑتا ہے۔ صدیقی نے ابتک زندگی کے جو جاندار مرقع پیش کئے ہیں اُنکے پیش نظر شاید میرا یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ اس مرحلے پر بھی زندگی کا ساتھ دینگے۔

انور کی کہانی "خون" چار زندگیوں کا خون کرتی ہے۔ محل وقوع کلکتہ ہے لیکن اگر آپ ہگلی کے پانیوں کو دیکھیں تو وہ آپکو چار زندگیوں کے خون سے نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کے خون سے سُرخ نظر آئیگا۔ ساجا جہلم کا غیور نوجوان ہے جس نے اپنی بیوی کی عزت بچانے کی خاطر گوڈو کو قتل کر دیا تھا۔ چودہ سال

انڈیمان میں رہ کے واپسی پر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس نظامِ زندگی میں مرد کی عزت، عصمت، اخلاق کوئی شے نہیں ہے۔ سرمایہ پرستوں کے نظامِ زندگی میں حصولِ زر کو سب سے بلند مرتبہ حاصل ہے۔ اور اُسکے لئے ہر بُرے سے بُرا کام بھی کیا جاسکتا ہے۔ چاہے اُس سے سماج کو کتنا نقصان ہی کیوں نہ پہنچے، سراجے پر حقیقت ایک لمحے میں اک خونیں ڈرامے کی صورت میں آشکارا ہوتی ہے۔ پہلے تو اُسنے ایک خون کیا تھا۔ افسانے کے آخر میں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر سراجا زندہ رہا تو اُسے سارے سماج کا خون کرنا پڑیگا۔ یہاں پر انور نے بڑی چابکدستی سے سراجے کے نفسیاتی زیر و بم کی تصویر کشی کی ہے۔ جو اپنے ہیولے میں ڈالی کی سُورئیلی مصوری سی مماثلت رکھتی ہے۔ سراجے کا ٹرنک پر پتھر بن گیا۔ اُسکی پتھرائی ہوئی آنکھوں کے سامنے انڈمان کے قیدی انسانی دماغوں کے پتھروں کو ہتھوڑوں سے ٹکڑے کر رہے تھے۔ رنگ برنگے دُھندلکوں اور روشنی کے چھوٹے چھوٹے دھبوں کے درمیان ہگلی بہہ رہی تھی ہگلی کی طوفانی لہروں پر ایک رکشا والا اپنی رکشا دوڑائے جا رہا تھا نئے ہاوڑا برج کے پاس ایک سمندری جہاز اُس رکشا سے ٹکرا کر ڈوب گیا۔ خزاں دیدہ جنگل کے تمام پتے جھڑ کر ہگلی میں بہ گئے۔ بڑی خوبصورت تصویر ہے یہ۔ دردناک جذبات اس مرحلے پر الفاظ کا ساتھ نہیں دیتے جس مرحلے پر سراجا پہنچ چکا ہے۔ یہاں سُورئیلی مُوقلم کے نقوش ہی سہارا دے سکتے ہیں۔ انور نے اس فن کو اک بیدار سماجی شعور کی تبلیغ کیلئے استعمال کیا ہے۔ اُس نے ہر طبقے کو ہتھیار چھین کر انھیں کے خلاف استعمال کئے ہیں۔ یہ ادب کا انقلابی تصور ہے یہی وہ تصور ہے۔ جو کبھی انور کے الفاظ میں سراجا کی زندگی میں ہگلی کا نیا پُل بنائیگا جب سمندری جہاز رکشا سے ٹکرا کر نہیں ڈوب جائیگا۔ اور جب ہگلی کے کنارے خزاں دیدہ جنگل میں بہار آجائیگی۔

پریم ناتھ در کا افسانہ چڑھاوا اک بلند پہاڑ پر برفباری سے گھرے ہوئے انسانوں کی ٹولی کا جائزہ لیتا ہے۔ اس ٹولی میں تین فرنگی ہیں۔ چھ کشمیری ہاتو ہیں۔ فرنگی جب بھی ہمالیہ کی چوٹیاں سر کرنے آتے ہیں۔ تو اپنی مہمات میں بڑی شیخی سے اپنی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن ایسے وقتوں میں وہ ہمیشہ اپنے اُن دیسی ساتھیوں کو بھول جاتے ہیں۔ جو قدم قدم پر اور موت کی ہر آہٹ کے وقت اُنکے قریب رہتے ہیں۔ جو پہاڑی چٹانوں کی دشوار گذار ڈھلانوں کے چپے چپے سے واقف ہوتے ہیں۔ اور اتنی بلندیوں پر بھی اوزون یا آکسیجن گیس کی مدد کے بغیر سفر کرتے ہیں اپنی کتابوں میں یہ مغربی جانباز کبھی ان رفیقوں کا ذکر نہیں کرینگے۔ کیونکہ اسطرح اُنکا اپنا ہیرو بننے کا خبط پورا نہیں ہوتا۔ "چڑھاوا اک ایسے موضوع اور اک ایسے مقام کی منظر کشی کرتا ہے۔ جو اُردو میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ موت کے سامنے یہ کردار کسطرح بے ہنگم اور مضحکہ خیز حرکات سے زندگی کی رسی سے لٹکے رہنا چاہتے ہیں وہ کسطرح اپنے ذہنی فلم پر اپنے پیاروں کی تصاویر دیکھتے ہیں۔ اور اک لمحہ میں کسطرح جہان بھر کی باتیں سوچ لیتے ہیں۔ وہ کسطرح خود غرض، کمینے اور ظالم ہو جاتے ہیں۔ مصنف چند جملوں ہی میں یہ سب کچھ آپ تک پہنچا دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے برفباری کا مشاہدہ صحیح ہے۔ ہاتوؤں کا نفسیاتی تجزیہ بیحد دلچسپ ہے۔ تینوں فرنگی جانباز سفید فام دیوتاؤں کیطرح خنک اور بے حس نظر آتے ہیں۔ ڈر نے انکے نفسیاتی مدوجزر اور انکے احساسات کے سُرتال پر زیادہ زور نہیں دیا۔ ممکن ہے وہ انھیں محض علامیاتی اشاروں کیطرح استعمال کرنا چاہتے ہوں۔ افسانوں میں علامیت بھی حسن کی ایک صورت ہے لیکن میرے خیال میں موجودہ افسانے کا حسن تو اور بہتر ہو جاتا۔ اگر چھ کشمیری مزدوروں کی نفسیاتی مصوری کے بالمقابل اُن تین فرنگیوں کے ذہنی کردار کا جائزہ بھی لیا جاتا۔ اور پھر ان دونوں گروہوں کے تصادم سے جو

ڈرامائی نتائج مرتب ہوتے وہ چاہے وہی ہوتے جواب اس افسانے کے اختتام میں موجود ہیں لیکن اُس صورت میں تصادم کی کرنبا کی کرداروں کو اُنکے مختلف ماحول اور سماج کے پس منظر میں زیادہ واضح کرتی اور اُن سماجی گرہوں کو کھولنے میں مدد کرتی کہ جنکے متعلق مصنف نے افسانے میں کہیں کہیں لطیف اشارے کئے ہیں۔

مدھوسودن کا "آشیانہ" وہی ہے۔ جو مہندر ناتھ کا "جہاں میں رہتا ہوں" وہی محل وقوع، وہی کردار، وہی نچلے متوسط طبقے کی بے کاری اور جنسی گھٹن، اور دنیا کی حسین چیزوں کو اپنے اور صرف اپنے تصرف میں لانے کی کمینی آرزو لیکن مہندر ناتھ کے افسانے میں جہاں کردار نگاری زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہاں مدھوسودن کے افسانے میں اک مختلف مرکزی خیال کو اہمیت دی گئی ہے۔ مہندر ناتھ کے افسانے "جہاں میں رہتا ہوں" کو پڑھ کر متوسط طبقے کی بنیادی سماجی اشکال اُجاگر ہونے لگتی ہیں۔ اور یہ خیال ذہن نشین ہونے لگتا ہے کہ اس طبقے کی انسانیت کس خطرناک حد تک مسخ ہو چکی ہے۔ مدھوسودن کے افسانے کے اندر یہ احساس زیادہ قوی ہے۔ کہ انسانیت اس طبقے میں ابھی اُسی طرح زندہ و پائندہ ہے۔ اور اسمیں مدھوسودن نے خلاف توقع اک خوشنما رجائیت کا اظہار کیا ہے۔ زبان و بیان اور شدت تاثر کے اعتبار سے یہ دونوں افسانے ہمارے افسانوی ادب کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مدھوسودن اور مہندر ناتھ اپنے افسانوں میں متوسط طبقے کے ماحول۔ اُنکے کرداروں اُس کی سماجی اُمنگوں۔ مرادوں اور نامرادیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ انکے بیشتر افسانے متوسط طبقے کے سماجی ماحول کے اُس حصے کو زیادہ تر چھوتے ہیں جن میں متوسط طبقے کے مرد اور عورت کے مخصوص جنسی کھچاؤ کی نیرنگیاں پائی جاتی ہیں

امرا کے طبقے میں اور اُدھر مزدوروں کے طبقے میں مرد اور عورت کے درمیان وہ خطرناک جنسی کھچاؤ نہیں ملتا ہے جو متوسط طبقے میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں طبقوں کے اندر مرد اور عورت بڑی آزادی سے ایکدوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ متوسط طبقے کے اندر مرد اور عورت کے جنسی میلانات خطرناک حد تک غیر فطری اور غیر سماجی ہو چکے ہیں۔ چنانچہ مہندر ناتھ اور مدھوسودن کے افسانوں میں ہمیں بار بار اس کھچاؤ کی بھیانک تصویر دکھائی جاتی ہے۔

مہندر ناتھ اور مدھوسودن دونوں نوجوان ہیں۔ دونوں ہم عمر ہیں دونوں گہرے دوست ہیں لیکن میں نے محض اسوجہ سے انکے افسانوں کو اس ترتیب میں اکٹھا نہیں رکھا ہے۔ بلکہ اسلئے کہ مدھوسودن کے آشیانے کا ہیرو اور ہیروئن وہی ہیں جو مہندر ناتھ کے افسانے "زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں" میں پائے جاتے ہیں۔ اور پھر دونوں افسانوں میں ایک دلچسپ تسلسل بھی ہے۔ یعنی اگر آپ آشیانے کے بعد "چاندسی عورت" پڑھینگے تو موخر کیفیت میں اک ارتقائی صورت کو پیدا ہوتے دیکھیں گے۔ کٹی کا نسائی حسن متوسط طبقے کے گرے پانیوں میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔ اس حسن سے جو چنگاری پیدا ہوتی ہے۔ جو مہندر کے سینے کو منور کرتی ہے۔ یہی چنگاری چترجی کے دل میں انسانیت کی رمق کو تڑپا دیتی ہے۔ اور وہ دس دس کے دو نوٹ مہندر کو دیدیتا ہے۔ کہ وہ آتش جگر کے نہاخانے سے اُٹھتے ہوئے دُود کو بجھتے ہوئے سکوں کی پگھلی ہوئی آتشِ سیال سے بجھا سکے لیکن "چاندسی عورت" میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ روپے دیئے جاتے ہیں۔ ایکبار۔ دوسری بار۔ اور دوسری بار ہی سریندر کو پتہ چل جاتا ہے۔ کہ یہ آتشیں حسن بھی بکاؤ سماج کی ہر بکنے والی چیز کیطرح بک رہا ہے۔ یہاں پر طوائفیت کے اسرار و رموز سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اور افسانے کا سماجی شعور آگے بڑھتا ہے۔ اور گندے

سڑے سماج کے نیلام گھر کی چار دیواری ذہنوں میں اُبھرنے لگتی ہے۔ جہاں پیٹ کی بھوک تھی۔ بیکاری تھی، بے سروسامانی تھی۔ ننگے جسم تھے اور جہالت میں ڈوبے ہوئے ذہن تھے۔ وہاں پر اب ایک چاندسی عورت کا جسم بھی اک مردار ممی کیطرح رکھ دیا جاتا ہے اور اُسکے گلے میں ایک فیتہ ڈال کے اُسپر لکھ دیا جاتا ہے۔ "بکاؤ ہے!"

جب افسانہ نگار کا ذہن یہاں تک پہنچ جائے۔ تو اُسکے آگے انقلابی حقیقت اور سماجی شعور کے نئے دروازے کھُلنے لگتے ہیں۔ مہندر ناتھ رینگتے ہوئے ان نئے دروازوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جیسے کہ اُسکے نئے افسانوں سے ظاہر ہے لیکن اُسکا دوست مدھوسودن ابھی تک دروازے کے باہر جنگلے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ اُسکے نئے افسانوں میں جنسی رمزیت کا رنگ گہرا ہوتا جارہا ہے۔ اور وہ مہندر ناتھ کیطرح سے اندر سے باہر نہیں بلکہ باہر سے اندر جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا ان دونوں کے راستے الگ ہوتے جائینگے۔ کیا جہاں کبیر انقلابی شعور کا طوفان جو چار و نطرف سے بڑھتا چلا آرہا ہے۔ مدھوسودن کو اُسکے جنگلے پر بیٹھا رہنے دیگا۔ جہاں اب بھی وہ بڑی مشکل سے اک بڑے خطرناک زاویئے میں ٹیک لگا کے بیٹھا ہے۔ اور کیا وہ رفتار صحیح ہے۔ جسکی مدد سے مہندر ناتھ انقلابی حقیقتوں کے تصور کو اپنے ذہن میں سمو رہا ہے۔ ان سوالوں کے جواب ابھی واضح نہیں ہوسکے۔ یہ بہت کچھ تو ان ادیبوں کے سماجی ماحول کے علاوہ انکے اپنے فہم و ادراک اور قوت نمو پر منحصر ہے۔ اتنا کہ سکتا ہوں۔ کہ انکی قوتِ ادراک اور سماجی تجزیئے کی صلاحیتوں کا زمانہ بلوغت کو نہیں پہنچا ہے۔ ہر ادیب کو اس منزل سے گذرنا پڑتا ہے۔ کچھ لوگ اس منزل کو پھلانگ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ گھسٹ گھسٹ کر اس منزل پر پہنچتے ہیں بیشتر اس منزل تک پہنچنے سے

پہلے مرجاتے ہیں۔ ہماری اُمیدیں اور مستقبل کی آرزوئیں ان ادیبوں کیساتھ ہیں۔ کیونکہ قوت بیان اور شدت تاثر کیساتھ ساتھ انکے افسانوی ادب میں ہمیں تجربے کی سچائی اور گہرائی بھی ملتی ہے۔ اور جبتک ادیب دیانتداری سے سچائی کی کھوج میں مصروف رہے وہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔!

عادل رشید کا افسانہ "عذرا آپا" اُن بیشمار محبت کی موتوں میں سے ہے۔ جو آئے دن متوسط طبقے کے گھٹے ہوئے ماحول میں ہوتی رہتی ہیں۔ اور پھر اگر یہ ماحول اُس متوسط مسلم گھرانے کا ہو جو پردے کا سختی سے قائل ہو۔ تو اس موت کی جانکنی اور کربناکی اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ عذرا کی جانگداز سدا چُپ رہنے والی بے زبان محبت اُسکی خاموش وفاؤں کا مسکت ایثار اور اُسکے گونگے جذبات کا المناک سناٹا اک پُرہول اندھیرے کیطرح سارے افسانے پر چھایا ہوا ہے۔ جسے ثروت بھائی کی چہلیں! اور شہناز باجی کی شوخیاں اور معصوم بچوں کی انجان دلداریاں بھی کسی طرح سے دور نہیں کر سکتیں۔ یہ افسانہ متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی تلخ کامیوں کا بڑا کامیاب مرقع ہے۔ مصور کا قلم بڑے سیدھے سادھے رومانی انداز میں جذبات کو اُبھارتا اور اپنے نقوش کو پائیدار کرتا چلا جاتا ہے۔ ابھی اسمیں وہ تلخی نہیں آئی۔ جو "درندے" کے افسانوں میں جگہ جگہ تیرتی ہے۔ عادل رشید کے اکثر افسانے انھی ہلکے پھلکے آبی رنگوں کے حامل ہیں۔ درندے میں وہ جست لگا کے آگے بڑھے۔ اور اب وہ اپنے رومانوی انداز کو چھوکے، اسکی نتھری نتھری خوبصورتی۔ ملائمیت اور مٹھاس اور رقیق جذباتیت کو ترک کر کے کھردری حقیقت پرستی کو اپنا رہے ہیں۔ درندے کے افسانے میں اُنکی ذہنی صلاحیتوں میں اک نئے موڑ کا سراغ ملتا ہے۔ جو انھیں ترقی کی نئی منزلوں کیطرف لیجا رہا ہے۔ لیکن

اس ضمن میں انھیں اپنے ادبی تجربوں کو بڑی سختی سے پرکھنا ہوگا۔ اور اپنے ذہن کی صفائی میں اور اُسکی صحت آور نمو میں بڑی سختی سے احتساب کرنا پڑیگا۔ انکی نئی تحریروں کی ہیئت بدل چکی ہے۔ کیونکہ اُنکی سماجی قدریں بھی بدلتی جارہی ہیں لیکن اس ہیئت میں ابھی وہ کھُردرا پن ہے۔ جو شروع شروع میں تو ناگزیر ہوتا ہے لیکن آگے چل کے خامکاری کا ثبوت بنجاتا ہے۔ اسکے لئے عادل کو اپنی نئی تحریروں میں وہی جلا دہی چمک دمک پیدا کرنی ہوگی۔ اور اُسے متنوع خوبصورتی اور زبان و بیان کو جگہ دینی ہوگی۔ جو اُنکی رومانی تحریروں اور طنزیہ مضامین کی شگفتگی کا جوہر رہا ہے جس نسبت سے یہ جوہر اُنکی پرانی تحریروں سے نئی تحریروں میں منتقل ہوگا۔ اُسی نسبت سے اُنکے افسانے کامیاب ہوتے چلے جائینگے۔ ہمارے بہت سے افسانہ نگار ابھی عذرا آپا کی موت اور اسلئے اپنے طبقے کی موت کا فاتحہ منا رہے ہیں لیکن عادل رشید کی خوش قسمتی ہے کہ اُنھوں نے زندگی کو نیا چولا بدلتے دیکھ لیا ہے۔ اور دُور افق پر سحر تازہ کو عود کی خوشبو کی طرح بلند ہوتے دیکھا ہے اگر یہ انقلابی حقیقت ادیب کے فہم و ادراک کے ذرے ذرے میں رچ جائے۔ تو وہ اپنے ذہن کی کوکھ سے نئے انسان کو جنم دے سکتا ہے۔

ابراہیم جلیس کا افسانہ "دودھ میں مکھی" اس نکتے کی تشریح کرتا ہے کہ ہمارے سرمایہ پرست نظامِ زندگی میں بیچیائی کسطرح لمبا گھونگھٹ کاڑھے رہتی ہے۔ یہ لمبا گھونگھٹ صرف کھوکھلی اخلاقی اقدار ہی پر پڑا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اس لمبے گھونگھٹ نے اس بوسیدہ گلے سڑے نظام کے ہر شعبے کو اپنے دلفریب دامن میں چھپا رکھا ہے۔ یہ وہ لمبا گھونگھٹ ہے جسے کاڑھ کر سرمایہ پرست غدار وطن پرست کہلاتے ہیں۔ اور اپنی قوم کو تباہ کرنیوالے مجاہد بنتے ہیں! اور مزدوروں کا

لہو چوسنے والے ملک کے معمار کہلاتے ہیں۔ اور کسانوں کی کھیتیاں ہڑپ کر جانے والے دیس کے محسن، اور محنت کشوں پر گولیاں چلانیوالے عوام کے سچے ہمدرد اور رہنما بنجاتے ہیں۔ ابراہیم جلیس نے اپنے افسانے میں اس موضوع کی صرف ایک شق کو لیا ہے۔ اور اُسے واقعاتی طنز کی روشنی میں اُجاگر کیا ہے۔ اک مرتے ہوئے طبقے اور سماج کے اندر کسطرح اخلاقی اقدار بھی جانکنی کی حالت میں ہوتی ہیں کس طرح اس ماحول میں سچی جنسی رفاقت ناپید ہوتی جاتی ہے۔ اور خاوند اور بیوی کے تعلقات کشیدہ ہوتے ہوئے بھی کسی طرح وہ جھوٹی شرافت کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں بسنتو کا گھونگھٹ اسکی اک دلچسپ تفسیر ہے۔ یہ گھونگھٹ اک ایسا برف خانہ ہے جسکے اندر متوسط طبقے کے بنیا سماج کے اخلاق کی لاش رکھی ہوئی ہے۔ علی عباس حسینی نے بھی اپنے افسانے میں اسی قسم کا ایک برفخانہ تعمیر کیا ہے۔ "برف کی سل" وہ عورت نہیں ہے۔ جو جوان ہے اور خوبصورت ہے اور جسکے دل میں اپنے خاوند کے پیار کی یاد گدگدی لیتی ہے۔ اور جو اپنی آغوش میں اک ننھے منے بچے کو کھیلتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہے۔ اور جو اپنی سہیلی کے بیاہ سے فارغ ہو کے جب اپنے گھر صبح کاذب کے وقت پہنچتی ہو۔ تو اپنے جوان میاں کے دروازے کے باہر اپنی جوان ماما رمضانی کو سوئے ہوئے پاتی ہے۔ اسکے سرہانے پر میاں کی سیاہ شیروانی رکھی ہے۔ اور وہ اندر غسل خانے میں لہک لہک کے گا رہا ہے، جمیلہ کے خاوند کی سیاہ شیروانی میں اور بسنتو کے گھونگھٹ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں برف کی سلیں ہیں۔ جنکے اندر مردار سماج کے گلے سڑے اخلاق کی لاشیں دفن ہیں۔ یہاں خاوند اور بیوی کی جنسی رفاقت نے دم توڑ دیا ہے۔ گھر کی مسرت غائب ہو چکی ہے۔ خاوند، بیوی۔ بچہ۔ عورت۔ دوست۔ دفتر۔ بازار مجلس۔ تفریح۔ بزنس۔ اخلاق۔ سماج۔

معاشی۔ سیاسی۔ اقتصادی قدروں کے مظہر سارے کے سارے دم توڑتے جارہے ہیں۔ یہاں نیکی سچائی اور محبت کا خون ہو رہا ہے۔ پرانی زندگی دم توڑ رہی ہے۔

دھرم پرکاش آنند اپنے افسانے دل ناتواں میں عورت کی خوبصورتی کا تجزیہ کرتا ہے علم اور تجربے۔ اصلیت اور تصوریت کے رموز و اسرار کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ افسانے میں اس نے ایک بہت اچھی بات کہی ہے۔ "تلاش حسن تو جستجوئے افق ہے۔ اسکی ابتدا مجھ سے ہے۔ اسکی انتہا کوئی نہیں" لیکن اس جملے میں اک آدرشی انفرادیت سموئی ہوئی ہے۔ جو ہمارے موجودہ ادب کی بیشتر تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ یہ جملہ زیادہ صحیح ہوتا۔ اگر آنندیوں لکھتے۔ "تلاش حسن تو جستجوئے افق ہے۔ اسکی ابتدا مجھ سے نہیں۔ مجھ سے بہت پہلے سے ہے۔ اسکی انتہا کوئی نہیں"۔ تو جمالیات کا اک واضح تاریخی تسلسل نظر کے سامنے آتا آدرشی انفرادیت نے ہمارے بہت سے اچھے اچھے ادیبوں کو بہکا دیا ہے۔ میں خود بھی ایک عرصے تک اس چکر میں گرفتار رہا ہوں۔ آدمی اس سے باہر نہ نکل سکے تو اپنی خوش ذوقی کے باوجود بڑے خطرناک رجحانات کا حامل بنجاتا ہے۔ آدرشی انفرادیت آنند کو یہانتک تو لے آئی ہے جہاں وہ یہ کہہ سکتا ہے "کل کائنات خوبصورت ہے سمندر کا ساحل سے ہمیشہ ٹکراتے رہنا، سوتے ہوئے مکانوں پر چھٹکی ہوئی چاندنی، زور سے برستی ہوئی بارش کی ٹپ ٹپ، سوتے میں ہوا سے ہلتے ہوئے پتوں کی سرسراہٹ کتنی خوبصورتی ہے ان میں، عورت کی خوبصورتی کائنات کی اس خوبصورتی کی زنجیر ایک اور کڑی ہی تو ہے"۔ یہانتک تو بات بڑی خوبصورت صحیح اور سائنٹی میں رہتی ہے لیکن تاریخی شعور کا فقدان اور مادے

کے صحیح عمل سے ناواقفیت اور تہذیبی قوتوں کے وجود سے انکار بورژوائی فلسفے کو اس حد تک مہمل بنا دیتا ہے۔ کہ افسانے کے آخر میں آدرشی انفرادیت آمندے سے کہلواتی ہے "اصلی خوبصورتی تیرے تخیل میں ہے۔ (تخیل مادے کے بغیر کچھ نہیں ہے۔ "تم" کون ہو) تصور بُعد میں ہے (تصور حقیقت کے قُرب اُسکے بعد سے پیدا نہیں ہوتا) قُرب میں حقیقت ہے۔ اور حقیقت میں مایوسی ہے!"

افسانہ یہاں پر ختم ہوتا ہے۔ دراصل بورژوائی فلسفے کی مادی دیواریں یہیں پر ختم ہوتی ہیں۔ "حقیقت میں مایوسی ہے" آج اس طبقے کو اپنے چاروں طرف مایوسی نظر آرہی ہے۔ کیونکہ اس طبقے کا انیا اندر مر رہا ہے۔ اور اسمیں اتنی جرات نہیں کہ وہ اپنے طبقے کے باہر نئے طبقوں کی اُٹھتی بڑھتی ہوئی زندگی کا ساتھ دے سکے۔ اس حقیقت کو دھرم پرکاش آمند نے بڑی خوبصورتی سے اپنے افسانے میں پیش کیا ہے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ وہ کہاں تک خود اپنی طرف سے اس حقیقت کو پیش کرنا چاہتے تھے۔

ممتاز مفتی کا "احسان علی" ہمارے سانتی گھرانوں کا کردار ہے۔ شریر، رنگیلا بڈھا، اپنی حرکات میں لڑکپن کی شوخیاں لئے ہوئے۔ یہ بڈھا بڑا دلچسپ کردار ہے اور ابھی تک بہت سے گھرانوں میں پایا جاتا ہے۔ اور جوں جوں سماجی سائنسوں کا شعور اور ادراک ان گھرانوں کو اپنے احاطے میں لیتا جائیگا۔ یہ کردار اُسی نسبت سے ہمارے گھروں میں کم ہوتے جائینگے۔ "احسان علی" کو جنسی تجربوں کی آگاہی تو ہے۔ اور وہ بظاہر اپنے آپکو اس فن کا ماہر، اور اس علم کا اُستاد متصور کرتا ہے لیکن جنسی تجربے کی آگہی۔ اور سمجھ ماہیت میں بڑا فرق ہے۔ اور احسان علی کے کردار کی مرکزی خرنیہ ہے کہ وہ اس تجربے سے آگاہ ہے لیکن اُسکی ماہیت سے بیخبر ہے۔ اور جب وہ اپنے

بیٹے کی شادی میں اُسکی صحیح اور اصلی ماہیت سے آگاہ ہوتا ہے، تو یکایک اُس کے سارے لاابالی پن کی دیواریں ڈھے جاتی ہیں۔ اُسکی شوخی، اور اُسکا چلبلاپن جسکے اندر اُس نے اپنے خطرناک جنسی میلانات کو چھپا رکھا تھا۔ یکایک تار تار ہو جاتا ہے اور اُسکا جنسی جذبہ بے اختیار ننگا ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر احسان علی اپنی عریانی کو چھپانے کیلئے ایک اور لباس تیار کرتا ہے۔ مذہب۔ اس لبادے کو اُس نے آجتک نہیں اوڑھا تھا۔ لیکن اب بیچ کے دانے اُسکے ہات میں آجاتے ہیں اور وہ یکلخت بہت بوڑھا، بہت بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ممتاز مفتی نے اس نکتے کو بڑی خوبصورتی سے سنبھالا ہے۔ اور سنبھال کر اسکے عروجی مقام پر پہنچایا ہے احسان علی ممتاز مفتی کے کامیاب ترین افسانوں میں سے ہے۔

"عزت" سرلا دیوی کا افسانہ ہے۔ اور اُس رنگ میں ہے جس رنگ میں ابراہیم جلیس کا افسانہ "دودھ میں مکھی" اور علی عباس حسین کا افسانہ "برف کی سل" لکھے گئے ہیں۔ یہیں متوسط طبقے۔ نچلے متوسط طبقے کی محرومیاں بیان کی گئی ہیں۔ اور اُس وفا کا ذکر ہے جسے عورت کے دل میں ازلی ہونا تھا لیکن جو معاشی مجبوریوں کیوجہ سے بازار میں نیلام ہو جاتی ہے۔ سرلا نے بھی اک برف خانہ تعمیر کیا ہے جسمیں ایملی اور اوشا کی ٹھنڈی ٹھنڈی آہوں کا دھواں چاروں طرف بکھرا ہوا ہے۔ اوشا کے گھر کے چاروں طرف چقیں ہیں لیکن وہ ان چقوں کو چیر کر باہر نہیں نکل سکتی۔ باہر گھر کے قریب ٹیلے کے اوپر ایک مندر ہے۔ جو در اصل مذہبی اور جنسی عیاشی کا اڈہ ہے۔ لیکن کوئی اُسے بھک سے نہیں اُڑا دیتا۔ محلے کے لوگ جنسی گھٹن کے خطرناک شکار ہیں۔ اور جب ایملی اپنے محبوب احمد رضا کی محبت کو محلے کے جج صاحب کے دو دس دس کے نوٹوں کے عوض قربان کر دیتی ہے۔ تو یہ سماج اُسے برا نہیں کہتا

رُوپے نے اخلاقی قدروں پر قفل لگا دیا ہے۔ کوئی بغاوت نہیں کرتا۔ اور اس المیے پر جھوٹی عزت کا غلاف چڑھا دیا جاتا ہے۔ مجھے تو بسنتو کے گھونگھٹ میں اور جمیلہ کا اپنے منھ بہر بات رکھکے چیخ کو روکنے میں اور ایمیلی کا ہار مان کر بیس روپے کا نوٹ قبول کر لینے میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ یہ تینوں مرمر کی مورتیں ہیں۔ برف کی سلیں ہیں۔ برف خانے کی لاشیں ہیں۔ ان مرقعوں میں دلچسپی کے عناصر موجود ہیں۔ ان کی اک تاریخی اہمیت بھی ہے۔ انھیں اک ادبی مقام بھی حاصل ہے لیکن اب ان لاشوں کا ادب بہت ہو چکا۔ آج ہندوستان کی عورت بہت آگے نکل گئی ہے۔ اب وہ بغاوت کرتی ہے۔ وہ پرانی چھتوں کو ہٹا کر باہر نکل آئی ہے اور کھیتوں کارخانوں دفتروں میں کام کر رہی ہے۔ وہ جیل جاتی ہے۔ ہڑتال کرتی ہے۔ اپنے سینہ پر گولیوں کو زخم کھاتی ہے۔ اب سرلا دیوی کو اور دوسرے ادیبوں کو اس عورت کے دوش بدوش چلنا چاہیئے۔ ورنہ وہ اپنے فرائض سے کوتاہی کرینگے۔ اور خود بھی ماضی کی اک پٹی ہوئی لکیر بنکے رہ جائینگے۔ زندگی ادب کیلئے کبھی نہیں رُکتی ہے۔ ادب کو زندگی کے ساتھ دوڑنا ہوگا۔

"سردار جی" خواجہ احمد عباس کی بڑی مشہور کہانی ہے۔ بہت سے فرقہ پرستوں نے جنہیں ہندو سکھ اور مسلمان بھی شامل تھے اس کہانی پر شدید اعتراضات کئے۔ یوپی گورنمنٹ نے بھی اس کہانی کی بنا پر مقدمہ دائر کر دیا۔ جو بعد میں واپس لے لیا گیا۔ سردار جی اک سچے ترقی پسند نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، اور بڑی بیباکی اور صفائی سے لکھی گئی ہے۔ سردار جی کے شروع میں عباس نے اُن گھناؤنی مذہبی منافرت کا جائزہ لیا ہے۔ جو اک پرانے خیال کے متعصب مسلمان کے دل میں عام سکھوں کے بارے میں جاگزیں رہتے ہیں۔ پھر انھوں نے عمل اور تجربے کی سچائی سے

ان خیالات کی تردید افسانے کے بقیہ حصے میں کی ہے شروع کے دو صفحے پڑھ کر ضرور کہانی کے متعلق اور مصنف کے عندیے کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے لیکن جو آدمی طنز کی نزاکت سے آگاہ ہے وہ یہاں بھی دھوکا نہیں کھاتا لیکن آگے چلکے تو عباس نے ہر کس و ناکس کیلئے انسانیت پروری کی راہ کھولی ہے اور اسطرح کہ دی ڈے سے مولی ٹغفل والا بھی اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہو سکتا۔ یہ کہانی تقسیم ہند سے متعلق فرقہ وارانہ فسادات پر ہے اور اک سچے واقعے پر مبنی ہے۔ جو خود خواجہ صاحب کے خاندان میں پیش آیا تقسیم ہند کے زمانے میں جہاں ہمارے صحافیوں نے فسادات کے متعلق گھناؤنے واقعات کو اچھالا۔ اگر وہ اسکے بجائے ان شرمناک واقعات سے معمور واقعات کو اجاگر کرتے جسکی اک خوبصورت تصویر میں سرداری میں ملتی ہے تو کشیدگی شاید اس حد تک نہ بڑھتی اور قتل و غارتگری میں بھی اتنا اضافہ نہ ہوتا لیکن یہ واقعات بالخصوص ہائے نظر انداز کیے گئے اور انکی تشہیر نہیں کی گئی اور جب عباس اور دوسرے ادیبوں نے اس موضوع پر صحیح ڈھنگ سے اور عام انسانوں کے شریفانہ جذبات سے اپیل کی۔ تو الٹا اُنپر فرقہ پرستی کے الزامات جڑ دینے کی کوشش کی گئی جیسے سرداری کے سلسلے میں ہوا۔ یا اُنپر ترقی پسندیت کا عجیب و غریب الزام لگایا گیا یعنی وہ کیوں دونوں فرقوں کی غلطیوں کو اپنی انسان دوستی کے پیمانے سے ناپتے ہیں اور اُن دونوں کو کیوں قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ یا وہ کیوں ایک ہی فرقے کے ظلم و ستم کے خلاف نہیں لکھتے تاکہ یہ فرقہ پرستی اور بڑھے۔ اور ملک میں فسطائیت کی جڑیں مضبوط ہوتی جائیں لیکن خاص شکر ہے کہ ان مفسد پردازوں کی کوششیں بار آور نہیں ہو رہی ہیں اور ملک میں ترقی پسندوں کی ان کاوشوں کی صحیح اہمیت کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ کہ ترقی پسندوں نے اس موقعے پر جو تاریخی فریضہ سرانجام دیا ہے اُس سے صلح و آشتی کے ہاتھ مضبوط ہوئے ہیں اور باہمی خانہ جنگی کو آگ بجھانے میں غیر معمولی مدد ملی ہے۔ سرداری اس سلسلے کی اک تاریخی کڑی ہے۔ کی افادیت اہمیت اور ادبیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی کہانی "چرپل" بھی اسی نئے انسان کی جنت کو بسانے کی کاوش

عبّاس نے سرداری میں کی ہے دونوں موجودہ نظامِ زندگی سے یکسر متنفر اور اسکی سماجی اور مذہبی عصبیتوں کیخلاف شدید ترین احتجاج کر رہے ہیں۔ سرداری میں ایک ایک سکھ نے ایک مسلمان کو بچانے کیلئے اپنا خون دیا ہے جسطرح راولپنڈی میں ایک مسلمان نے ایک سکھ کو بچانے کیلئے اپنا خون دیا تھا لیکن سرداری میں یہ دونوں خون کی لہریں الگ الگ ہیں۔ سکھ کا خون مسلمان کا خون۔ لیکن ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ندیم نے ان دونوں خونوں کو سمو دیا ہے اور مامتا کے رحم میں اک نئے بچے اک نئے انسان کی تخلیق کی ہے جو پرانی جنتوں کے کہنہ قلعوں کو ڈھا کر اک نئی جنت کی بنیاد رکھ رہا ہے اور اسمیں اک لطیف نکتہ یہ بھی ہے۔ کہ یہ نیا انسان کسی حسین پاک صفات متبرک کنواری کے بطن سے نمودار نہیں ہو رہا۔ یہ انسان اک لٹی پٹی مظلوم ہیئت ٹوبہ ٹیک سنگھ کی کوکھ سے جنم لے رہا ہے یہ انسان جسے ندیم اپنے دونوں ہاتوں میں اٹھا کے دنیا سے کہتا ہے۔

"یہ ایک نیا انسان ہے۔ پچھلے جیت کی حیوانیت نے اسے جنم دیا ہے۔ یہ تو منوں بہے ہوئے لہو کا جوہر ہے۔ تم ایکدوسرے کو مبارکباد کیوں نہیں کہتے۔ دیوانی انسانیت کی کوکھ سے نکلے ہوئے اس نئے انسان کو تم ہاتھوں ہاتھ کیوں نہیں لیتے اور تم یہاں میرے پاس آکر اور اس چوٹی پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کو یہ کیوں نہیں بتاتے کہ دھرتی کی اُجڑی ہوئی مانگ کا سیندور پھر سے چمک اٹھا ہے۔۔۔!"

ندیم اور عباس اور اسکے ساتھیوں نے یہ آواز بہیت اور شیطنت کے سیلاب ظلمت اور حیوانیت کی آگ اور عصبیت فسطائیت اور عوام دشمنی کے جلتے بھڑکتے ہوئے لاوے میں کھڑے ہو کر بلند کی ہے۔ یہ آواز رائیگاں نہیں جائیگی۔

منٹو کا گوپی ناتھ اسکے عام کرداروں سے مختلف ہے۔ بالعموم منٹو کے کردار اوپر سخت بیچ میں سے بڑے نرم ہوتے ہیں اور وہ اپنے اوپر سختی اور درشتی کا نقاب اڑھے رہتے ہیں بھونڈی اور مکروہ اور دوسروں کا دل جلانے والی باتیں کرتے رہتے ہیں اور پھر عروجی نقطے پر پہنچکر اپنی نرم روی اور مہر و وفا اور انسان دوستی کا ثبوت بڑے عجیب طریقے سے دیتے ہیں۔ اسکے لئے منٹو بڑی نپی تلی جذبات سے عاری زبان استعمال

کرتا ہے اور اسی قسم کی تشبیہیں اور استعارے کام میں لاتا ہے لیکن گوپی ناتھ اسکے دوسرے کرداروں سے مختلف ہے۔ وہ شروع ہی سے نرم نرم لجلجا جذباتی بے ریڑھ کی ہڈی کا انسان ہے جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی دولت لٹانے پر آمادہ ہے اس کہانی میں جتنے کردار ہیں سب مسخ شدہ ہیں سب دھوکا دیتے ہیں۔ اپنے آپکو یا دوسروں کو تکیئے والا سائیں بیٹھن تختے والا غلام علی کہنہ مشق سردار بیگم، محمد شفیق طوسی گوپی ناتھ زینت انمیں کسی کے پاس ریڑھ کی ہڈی نہیں ہے ان لوگوں نے اپنے کھوکھلے ہونیکا اقرار کرلیا ہے اپنی ساری قدروں کے جھوٹے ہونے کی چغلی کھائی ہے وہ معصوم کبوتری ہے جو ہر کس و ناکس کے پاس بک جاتی ہے۔ وہ پیشہ ور سردار بیگم ہے جو اس المیئے میں بڑی مسرت سے کریون اے پیے جاتی ہے۔ وہ تکیئے والا سائیں جسکا مذہب تبلیغ پھیرنے شراب پینے اور شراب پیکر مست ہوکر ہو جانے میں ہے وہ طوسی ہے جو رنڈیوں کی کمائی پر جیتا ہے اور انسے جھوٹی طمعت کا کھیل کھیلتا ہے۔ وہ غلام علی جو اپنے دوست ایکسو روپے کی خاطر جھوٹ بولتا ہے۔ وہ گوپی ناتھ ہے جسے اس بات کا یقین ہے کہ اسکا روپیہ ہر حالت میں جائیگا اور وہ اپنے آپ سے اسقدر مجبور اور بے بس ہے کہ کچھ نہیں کرسکتا اور اپنے آپکو مسلسل دھوکا دیئے جارہا ہے یہ فریب اور دھوکے کا فسوں سارے افسانے پر چھایا ہوا ہے ہم کچھ نہیں کرسکتے ہمیں اسی موت مرنا ہے گوپی ناتھ کو اپنی موت کا احساس ہے لیکن گو وہ خود اپنے آپکو بچانا نہیں چاہتا۔ وہ زینت کو ضرر رساں کیڑوں سے الگ رکھنا چاہتا ہے اسکے لئے وہ خود اس سے شادی نہیں کرتا گو اسکے پاس پچاس ہزار روپے ہیں کیونکہ یہ پچاس ہزار روپے تو ضرور خرچ ہو جائینگے اسکے لئے وہ زینت سے پیشہ کرانا شروع کرتا ہے اور جب اسمیں کامیابی نہیں ہوتی تو اسے بہت دکھ ہوتا ہے آخر میں وہ زینت کا مستقبل ایک متمول زمیندار کی ہاتھوں میں سونپ کر بیحد خوش ہو جاتا ہے اور مصنف پر خوطوائیت کا زمیندار کی کیسا چوڑ دیکھکر طنزیہ انداز میں مسکراتا ہے بہت ہی دھیمے میٹھے انداز میں احتجاج کرتا ہے۔ گوپی ناتھ کرہتا ہوا رینگتا ہوا۔ قنوطی جذبات میں لتھڑا ہوا کیڑا ہے جو سرمایہ پرستی کی متفن لاش پر سرک رہا ہے انقلابی زمانے کے مورخ اسکے خدوخال کو بڑی حیرت اور دلچسپی سے دیکھینگے اور اسکی حرکات و سکنات کا جایزہ ہمارے موجودہ سماجی ماحول کی روشنی میں لیکر نظام زندگی کے متعلق اپنے نتائج مرتب کرینگے۔

سہیل عظیم آبادی نے جنس کی بھوک اور پیٹ کی بھوک دونوں کا تجزیہ کیا ہے۔ "بھوک" میں یہ بتایا ہے کہ پیٹ کی بھوک جنس کی بھوک پر غالب ہے۔ گو ابھی تک ہمارے بہت سے نوجوان عمر فہم ادیب اس حقیقت سے منکر نظر آتے ہیں۔ اور جنس کی بھوک کو پیٹ کی بھوک پر غالب سمجھتے ہیں۔ دراصل وہ بھرے پیٹ سے سوچتے ہیں۔ اور اس حالت میں تو پیٹ کی بھوک ہوتی نہیں اسلئے جنسی بھوک کی تیزی و تندی بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ کہانی کا ہیرو رامو بھوکا ہے۔ وہ چوری کرنے کیلئے نکلتا ہے اتفاق سے اُسے ایک ایسی جگہ پہنچ جانیکا حوصلہ ہوتا ہے، جہاں عورت بھی ہے اور روٹی بھی ہے۔ سیدھا سچا دلچسپ افسانہ ہے اس کا خاتمہ کئی طرح سے ہو سکتا ہے۔ رامو روٹی حاصل کرتا ہے عورت چھوڑ دیتا ہے۔ رامو عورت چھوڑ دیتا ہے روٹی لیکر بھاگ جاتا ہے۔ رامو عورت اور روٹی دونوں حاصل کر لیتا ہے۔ رامو روٹی اور عورت دونوں کو چھوڑ کے چلا جاتا ہے۔ ان چاروں صورتوں میں مختلف نظریئے بروئے کار آتے ہیں لیکن سہیل کے سامنے چونکہ انفرادیت پیش نظر ہے اسلئے اُس نے افسانے کو زیادہ دلچسپ بنانے کیلئے دہشت پسندی اور مصنوعی ڈرامیت سے کام نہیں لیا بلکہ بھوکے آدمی کے طبعی اور فطری رجحان کا ایک سیدھا سادا موڑ پیش کیا ہے۔

بلونت سنگھ نے سہیل کے تقابل میں جنس کی بھوک کو پیش کیا ہے۔ اور اُسے ایک ترغیبی انداز میں پیش کیا ہے۔ جیسے خود اُسی افسانہ پڑھنے والی کوئی لڑکی ہو۔ بلونت سنگھ کا یہ افسانہ اُسکے مخصوص انداز سے ملتا ہوا ہے۔ جس میں اُسنے پنجاب کے کھیتوں اور گاؤں میں رہنے والے جاٹوں کے کردار اور اُنکی بھرپور زندگی کی تصویریں پیش کی ہیں۔ اس افسانے میں اُسنے ایک الھڑ نوجوان لڑکی کے جنسی اور شہوانی جذبات کو ترغیب کے زیر اثر مختلف مدارج طے کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ یہ ایک کھاتا پیتا گھریلو سا سکھی جیون ہے۔ گیہوں کی روٹی ہے مکھن ہے۔ غلہ ہے۔ تولیہ ہے۔ صابن ہے۔ نوکر چاکر ہیں۔ کہانی کے ہیرو کیلئے جو اس گھر میں مہمان بنکے آیا ہے اور ہیروئن کیلئے جو اس گھر کی لڑکی ہے۔ آرام و آسائش کے سارے سامان بھی یہیں سے ترغیب کی منزل شروع ہوتی ہے۔ بلونت سنگھ کا افسانہ تقسیم شدہ پنجاب پہلے کا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ آج پنجاب میں ایسے بہت کم گھر رہ گئے ہیں جنھیں زندگی کی آسائشیں

حاصل ہیں۔ آج ان گھرانوں کی شریف لڑکیوں کے سامنے دوسرے مسائل ہیں ترغیبوں کی نوعیت اور انکی سماجی ہیئت بھی بدلگئی ہے۔ بدیم اور بلونت سنگھ نے پنجاب کے گانوں کو جتنے قریب سے دیکھا ہے شاید کسی دوسرے ادیب نے نہیں دیکھا اسلئے بار بار یہی توقع ہوتی ہے کہ بلونت سنگھ اپنے افسانوں کے پس منظر میں بدلے ہوئے پنجاب کے عناصر ترکیبی اور اسکے نئے مسائل کو ضرور جگہ دینگے۔

اس مجموعے کا آخری افسانہ "بل کے سائے" میں ہے۔ اسمیں میں نے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں کی ایک دوپہر کا ذکر کیا ہے اس سے پہلے میں اپنے افسانے "ایکدن" میں اسی کسان کے گھر کی صبح کا منظر پیش کر چکا ہوں۔ اور اب اسکے بعد وہ کہانی لکھ رہا ہوں جسمیں شام سے گہری رات میں سو جانے کا ذکر ہے۔ تینوں افسانے ملکر اک مجموعی تاثر بھی پیدا کرتے ہیں۔ اور پھر الگ الگ یہ خود بھی افسانے ہیں اس افسانے میں کہیں ڈرامائیت نہیں اسمیں میں نے کہیں پرانے جادوگروں کی طرح ٹوپی سے خرگوش نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ دہشت پسندی ہم نے بزرگوں سے وراثت میں پائی ہے۔ پرانی ہیئت میں نئے سماجی مواد کو پیش کرنا ہمارا شیوہ رہا ہے لیکن ہمیں اب افسانوی ہیئت میں بھی تبدیلی کرنا چاہیئے۔ کیونکہ افسانے میں ہیئت کے اعتبار سے بھی بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے مختصر افسانے کو بیحد مختصر کر دیجئے تو نظم سے جا ملتا ہے اور بڑھا دیجئے۔ تو ناول کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اسکے مکالمے کو پھیلا دیجئے۔ تو ڈرامائی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے اور بیانیہ عنصر بڑھا دیجئے تو یہ انشائیے لطیف کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس سے اسکے وسیع پھیلاؤ اور اسکے امکانات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے اندر بہت سے ہیئتی اجزاء کو سمونے کی قوت رکھتا ہے۔ ناول ڈرامہ انشائے لطیف شاعری اس کے ڈانڈے ان تمام حدوں کو چھو لیتے ہیں اور اپنے وسیع احاطے میں اک متنوع ادب کی تخلیق کر سکتے ہیں میں نے اسکی وسعت اور امکانات کو بڑھانے کیلئے ہر رنگ میں کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے۔ اور اس سے بہتر سے بہتر حسن اور افادیت حاصل کرنے کیلئے مختلف ہیئتی تجربے بھی کئے ہیں اسمیں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ اسکے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا میں اپنی کاوش کا ذکر کر سکتا ہوں اپنی کامیابی کے

متعلق کوئی صحیح رائے نہیں دے سکتا۔

ہل کے سائے میں میں نے زندگی کے اک سیدھے سادے منظر کو پیش کیا ہے جسمیں میں نے کھیتوں میں دوپہر کے ماحول کو پیش کرنیکی کوشش کی ہے۔ اسطرح کے میں نے اور بھی بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ اور لکھ رہا ہوں جسمیں زندگی کی افسانوی تصویر کچھ اور عام واقعاتی حقیقت زیادہ نظر آئے۔ گھاٹی میں بھی ایک اسیطرح کا منظر ہے جسمیں ایک لڑکا جنگ سے واپس لوٹتا ہے اور گاؤں سے باہر اپنی بہن سے ملتا ہے شہتوت کے درخت میں ایک لڑکا اپنی دُلھن کو برف کے راستے پر اُٹھائے اپنے گھر لاتا ہے۔ اور پھر آنگن میں بستر بچھا کے سو جاتا ہے۔ ان تمام افسانوں میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہے۔ کوئی ڈرامائی حادثہ نہیں ہے۔ گو زندگی کی ڈرامائیت اور انقلاب انگیزی پر لکھنا بھی بہت ضروری ہے لیکن میرا خیال ہے کہ زندگی میں تغیر اور عالم میں جسے ہم انقلاب کہتے ہیں۔ وہ تغیر اور ترقی کی ایک بہت ہی عروجی صورت ہے۔ اور یہ تغیر اور یہ انقلاب زندگی میں بہت ہی آہستہ آہستہ اور دھیمے دھیمے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اسلئے اگر ہم عام انسانوں کی زندگی کی سیدھی سادی مصوری بھی کرلیں۔ چاہے وہ آبی رنگوں میں ہو۔ یا آئل پینٹنگ میں تو اُسمیں تغیر اور ارتقا کے کئی پہلو نظر آئینگے۔ چاہے اُسمیں کوئی ایسی دھماکے والی بات پیدا نہ ہو جس کا چسکا ہمیں مدت سے بورژوائی ادب نے لگا دیا ہے۔ افسانے کی ہیئت اور مواد میں تبدیلی ضروری لابدی اور ناگزیر ہے۔ اور افسانہ اب اُس مقام پر نہیں رُک سکتا۔ جہاں مثال کے طور پر او ہنری اور موپساں پہنچے تھے۔ وہ لوگ اب منزل نہیں ہے نشانِ راہ ہو گئے ہیں کبھی ہم لوگ بھی ایسے ہی ہو جائینگے۔ کہ ترقی اسی کو کہتے ہیں۔ اور یہی انسان کا عظیم ترین افسانہ ہے۔ کہ وہ کبھی ایک منزل پر نہیں ٹکتا۔ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔۔۔

کرشن چندر

اندھیرا۔ بہت گہرا اندھیرا۔ خوابوں کا شہر، پرانے نغموں، پرانی یادوں کا چھوٹا سا ویرانہ، اس پر اندھیرا چھا گیا۔ سائے ایک دوسرے سے مل کر روتے ہوئے آگے روانہ ہو گئے۔ تاریک راستوں پر سے گذرتے ہوئے سب اُمیدیں، سارے سپنے ان تاریک راستوں کے کنارے تھک کر گر پڑے۔ اور روحیں آئیں۔ تاریکی، وحشت اور ویرانی کی روحیں چیختی چلاتی۔ اور سائیں سائیں کرتی ہوائیں چلیں۔ اور آہستہ آہستہ بہنے والے سُرخ دریا کے ساحل پر دُھواں اُٹھا اور احمق خداؤں کے سیاہ معبدوں میں جلنے والے چراغ روتے رہے۔ روتے رہے۔ اور خوابوں کے اس ویران شہر میں رہنے والے شکست خوردہ انسان آگے بڑھے۔ ان کے دکھ بہت تھے۔ ان کے راز بیحد چھوٹے چھوٹے، بے بس مجبور اور حماقت خیز۔ اور تاریکی چھا گئی — خاموش، ستاروں اور خوشبوؤں والی رات کی تاریکی۔ گہری اور گہری۔

سناٹا۔ اکیلا اور ابدی اور لازوال۔ اور تھکے ہوئے وقت کے اس ریگستان کے پرے سے، اس کی عمیق وسعتوں کو کاٹتی ہوئی، ایک تیز، گمبھیر آواز تیر کی طرح نکلی اور بلند ہوئی۔ میرا اسلام کہیو اگر نامہ بر ملے۔ اور دھواں اوپر اُٹھتا رہا۔ شعلوں کی سُرخ اور زرد رقصاں پرچھائیوں نے پانی کی سطح کو اور سُرخ کر دیا۔ اور سُرخ۔ اور چاند ڈوب گیا۔ پرانے درختوں کی شاخیں جُھک آئیں آبشار ٹوٹ کر چٹانوں پر بکھر گئے۔ چاند ٹوٹ پھوٹ کر، تھک کر نیچے گر پڑا اور ہوائیں روتی رہیں۔

پھر یہ اندھیرا کم ہوا۔ اور صبح ہوئی۔ ایک اور صبح۔ اور چھاؤنی کا بگل بج اُٹھا۔ صبح، دوپہر، شام، رات، وہ بگل ہمیشہ اسی طرح بجا کرتا ٹھنڈی اور سُہانی صبح۔ اور دریچے کے باہر سوئیٹ پی کی خوشبوئیں اُڑنے لگیں۔ اور گوبھی کے پتوں پر شبنم کے قطرے جھلملا اُٹھے۔ دور پریڈ گراؤنڈ میں بگل بجتا رہا۔ پھر سورج نکلا۔ پھر بادل چھٹے۔ پھر روشنی پھیل گئی۔ پر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ بہت دور تھا۔ بہت دور۔ لاپرواہ، مذاق اُڑاتا ہوا، خود پسند، مغرور۔ اور کرائیسٹ چرچ کے گھنٹے بجنے لگے۔ اور بہت سے شور بہت سی آوازیں۔ سب نے مل کر چاروں طرف سے جیسے اسکو دبا دیا۔ وہ بہت اُکتا کر، بہت تھک کر اپنی بڑی بڑی آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ بٹیا صاحب جاگ گئیں۔ مہریوں نے ایک دوسرے سے سرگوشی میں کہا اور دوڑ بھاگ مچا کر اس کے کام میں مصروف ہو گئیں۔ اس کا کتا اُچھلتا کودتا آکر مسہری کے قریب صوفے پر پیر ٹکا کر

کھڑا ہو گیا۔ کھانے کے کمرے میں صبح کی چاء کی گھنٹی تھرّانے لگی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ مُرغ اندھیرا اور زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ اس نے کسی چیز کو دیکھنا نہ چاہا۔ ہر چیز سے۔ ہر ذرے سے اس کا خیال وابستہ تھا۔ وہ دریچے کے نیچے اس روش پر سے گذر کر اپنی کار میں بیٹھا کرتا تھا۔ وہ گیلری میں رکھے ہوئے ریک پر اپنی ہیٹ پھینکتا ہوا پردہ اُٹھا کر اندر بھیّا کے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ وہ ٹیلیفون کی میز پر جُھک کر ڈائریکٹری کے ورق پلٹتا تھا۔ وہ اسی نیلے آسمان کے نیچے، انہی فضاؤں میں اب بھی سانس لے رہا ہے۔ کاش۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ کچھ نہ ہوتا۔ پر ایسا نہیں تھا۔ اور اس کا کُتّا مسہری کے نیچے کھڑا چوکلیٹ کے انتظار میں دُم ہلا رہا تھا۔ وہ اس کمبخت کتے کو بھی چھُو چکا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ سے چوکلیٹ کھلا چکا تھا۔ اُس نے مسہری پر سے جُھک کے کُتے کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اور ایسا کرتے ہوئے اُسے انتہائی تکلیف محسوس ہوئی۔ باہر برآمدے میں آیا بڑے بھیّا کے بچے کو ڈانٹ رہی تھی۔ اگر تم نے پھر شرارت کی تو آنکل جمیل نہیں آیا کریں گے۔ وہ کبھی تمھیں اپنی موٹر سائیکل پر نہیں بٹھائیں گے۔ وہ کہہ رہے تھے ٹونی بڑا بُرا ہے۔ ہم اس سے خفا ہو کر جا رہے ہیں۔ آیا برابر ٹونی سے باتیں کرتی رہی۔ کُتا برابر دُم ہلاتا رہا۔ اب وہ پاگل ہو جائے گی قطعی پاگل۔ بالکل باؤلی ایسی۔ پھر وہ مسہری پر سے اُتری۔ ایک مہری روز کی طرح اسکو صبح کا

اخبار دے گئی۔ وہ صوبے کا گزٹ کبھی نہیں دیکھتی تھی۔ پر اس وقت اس کی نظریں پانیئر کے گزٹ کے کالم پر پڑ گئیں۔ اس کا تبادلہ کہیں بہت دور کا ہو گیا تھا۔ بہت دور کا۔ اُس نے اخبار قالین پر پھینک دیا۔ کمبخت گدھا کہیں کا۔ گدھا۔ اُلو۔ چھاؤنی کے بگل بجتے رہے۔ صبح، شام، رات۔ صبح۔ شام، رات۔ رنگ برنگی روشنیاں اور لرزاں سائے اس کے چاروں طرف ناچتے رہے۔ ناچتے رہے۔

اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اس نے بھولنا چاہا۔ ہمیشہ کے لئے بھول جانا چاہا۔ وہ لمحے۔ وہ ساعتیں۔ وہ انتہائی تکلیف دہ ساعتیں۔ انکی انتہائی کرب انگیز یاد۔ جب اس کی بہن کی شادی کے ڈنر کی رات وہاں پر خوب تیز روشنیاں جھلملا رہی تھیں اور دور دور تک پھیلے ہوئے یوکلپٹس اور پام کے درختوں کے پتے رات کی ہواؤں میں سرسرا رہے تھے، اور "شرارت" اور "صندل" اور "پیرس کی شام" کی خوشبوئیں "رات کی رانی" کی مہک میں ہل جل کر ہوا میں اڑ رہی تھیں۔ اور لاتعداد چمکدار طویل کاروں کی قطاریں برآمدوں، درختوں اور شہ نشینوں میں جھانکتی ہوئی برقی روشنیوں میں جگمگا رہی تھیں اور سبزے پر ملٹری بینڈ پوری طاقت سے بجایا جا رہا تھا۔ اور مہمانوں کے گروپ گھاس کے قطعوں پر جگمگاتے درختوں کے نیچے، برآمدوں اور شہ نشینوں میں بکھرے ہوئے تھے اور اندر آرکیسٹرا بج رہا تھا۔ اور اسوقت وہ تھوڑی دیر کیلئے گل مہر پیڑ کے قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس کی انگلیوں میں

سگریٹ جل رہا تھا۔ اور اس نے ٹوٹو سے کہا تھا۔ میرا عزیز دوست لفٹننٹ کمانڈر رحمٰن کراچی سے آیا ہوا ہے۔ وہ راجکماری صاحبہ سے شادی کرنا چاہتا ہے میں بھی اس کی پُر زور سفارش کرتا ہوں۔ راجکماری سے پوچھنا کیا وہ اسے پسند کرلیں گی۔ مجھے تو وہ بیحد پسند ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ پھر وہ ٹوٹو سے باتیں کرتا ہوا دوسرے مہمانوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اور سبز درختوں اور سُرخ شہ نشینوں میں نارنجی اور نیلے برقی قمقمے جل رہے تھے اور وہ قمقمے سب کے سب ایکدم سے بجھ گئے۔ آرکیسٹرا کی موسیقی چیختی رہی۔ اور دریا کے سُرخ پانیوں کے کنارے دھواں بل کھاتا ہوا اوپر اُٹھا۔ اُٹھتا گیا۔ اور اس کے ہیولوں کی جلن زیادہ ہوگئی اور رات کے گہرے اندھیرے میں ریڈیو گرام چلاتا رہا۔ تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم۔ میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے۔ اگر نامہ بر ملے۔

پھر وہ وہاں سے چلا گیا۔

اس وقت وہ سب بالکونی کے نیچے باتوں میں مصروف تھے۔ گل مہر کی شاخوں کے پرے اس کی ٹرک کھڑی تھی۔ اور درختوں میں بڑے بڑے سُرخ پھولوں سے جیسے آگ لگ رہی تھی۔ سچ مچ کی آگ — وہ اپنی بہن کی شادی میں آئے ہوئے مہمانوں کو اپنے ساتھ پکنک اور مچھلی کے شکار پر لیجانے کے پروگرام بنا رہا تھا۔ اور اُس نے بڑی بے تکلفی سے اس کی طرف مُڑکر اسعاد سے کہا:

"آپ کی ممی بھی ہمارے ساتھ جاویں گی نا؟ آپ کیلئے کل صُبح

پانچ بجے تک اسٹیشن ویگن اور ٹرک بھجوا دیئے جاویں گے۔"
پھر اس نے سب کو اپنی مترنم آواز میں خدا حافظ کہا اور اسکی ٹرک گرد کے بادل اُڑاتی باغ کی سُرخ بجری والی سڑک پر سے گذرتی صنوبر کے درختوں کے پرے جاکر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

پھر وہ اسماد کیلئے جسکے شوہر کا تبادلہ انہی دنوں پونا سے وہاں کا ہوا تھا، کوٹھی کے متعلق طے کرنے کیلئے اس راستے پر سے گذری جس کے دونوں طرف جامن کے سایہ دار درخت تھے۔ اس نے اس گھر کے آگے کار روک لی جسکی روشوں کے ساتھ ساتھ چنار اور صنوبر کے درخت کھڑے تھے۔ جہاں چاروں طرف سبز گھاس کے وسیع قطعوں میں جن کے کنارے کنارے تیز سُرخ، کاسنی اور سفید پھول لہلہا رہے تھے پانی دیا جا رہا تھا۔ گھاس پر پانی کے ٹیوب دور دور تک بکھرے پڑے تھے ان میں سے بہہ بہہ کر پانی آہستہ آہستہ گھاس میں جذب ہو رہا تھا۔ سرد، پُرسکون، خاموش۔ وہ اُس کا گھر تھا۔ اُس کا ہو سکتا تھا۔ پر اس کا نہیں تھا۔ اس کا نہیں تھا۔ مالی اپنا بڑا ختم کرکے لمبے لمبے قدم رکھتا پھاٹک تک آیا۔

کوٹھی ابھی خالی نہیں ہوگی مس صاب۔ صاحب بہادر سرکاری کام سے تھوڑے دن کیلئے ولایت جانیوالا ہے، اس لئے پوری کوٹھی بند کر دی جائیگی خالی دفتر کے کمرے کھلے رہیں گے۔ اپنا کارڈ چھوڑ جایئے مس صاب۔
اس کی کار ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھی اور دوسرے پھاٹک سے نکلوٹ کر خاموش، سایہ دار سڑک پر آگئی۔

اور وہ اندر سو رہا تھا۔ وہ باہر ہی سے واپس چلی گئی۔ اور وہ اندر سو رہا تھا۔

پھر وہ جاگ کر اپنی ساگوان کی مسہری پر سے اُٹھا۔ اُس نے گھڑی دیکھی۔ اُس نے سگرٹ جلایا۔ اُس نے ڈریسنگ گاؤن پہنا۔ اور وہ اپنے پرانے وُوڈاسٹاک اسکول کا ایک پرانا گیت گنگناتا ہوا غسل خانے میں گیا، وہاں نہاتے میں اس کی ناک میں صابن گھسا اور اُسے خوب چھینکیں آئیں۔ اور اس نے چپکے سے کہا لاحول ولا قوۃ۔ پھر وہ ٹینس کیلئے تیار ہونے لگا۔ اور چائے پیتے پیتے اُس نے ریڈیو گرام پر اپنا پسندیدہ ریکارڈ لگا دیا۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم۔ میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے۔

جبکہ وہ اس سایہ دار سڑک پر سے واپس جا رہی تھی۔

پھر اندھیرے میں دو کاریں آمنے سامنے مخالف سمتوں سے ایک دوسرے کی طرف بڑھیں۔ پہلی کار نے قریب پہنچکر اپنے سامنے کی روشنیاں مدھم کر دیں۔ اور دوسری کار زناٹے کے ساتھ برابر سے نکل گئی۔ وہ کلب سے واپس آ رہا تھا۔ اور وہ اسی وقت کلب جا رہی تھی۔

وہ چلتی رہی۔ یہانتک کہ وہ دریا کے آخری پُل تک پہنچ گئی اُس نے کار روک لی۔ وہ اسے بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ بہت پیچھے۔

اور خوابوں، اُمیدوں کا ایک روتا ہوا ہجوم اندھیرے میں آگے بڑھتا گیا۔ اُس کے ہونٹ یونہی جلتے رہے۔ چھاؤنی کا بگل بجا اور آدھی رات کے پرند باغ کی تاریک جھاڑیوں میں شور مچانے لگے۔ اللہ۔ اللہ میرے

میں کس قدر کی احمق ہوں۔ اُلّو۔ وہ جتنی مرتبہ اُس سے ملی تھی، کلب کے بال روم میں، ٹینس کورٹ پر، سال نو کی پریڈ کے موقعہ پر، ٹی پارٹیوں میں، اسکو ایک ایک منظر، ایک ایک لفظ، ایک ایک بات یاد تھی۔ وہ کس کس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اس نے کیا کیا کہا تھا۔ وہ کس کس موقع پر ہنسا تھا۔ اُس نے کب اپنے مخصوص انداز میں اپنی سیاہ آنکھیں جھپکائی تھیں اور اسکو یہ بھی یاد تھا کہ اتنے سارے موقعوں پر اُس نے کبھی اُس سے ایک بات بھی نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ دوسری لڑکیوں کا پارٹنر بنتا۔ کھیلوں میں، رقص میں، بحثوں میں، وہ کبھی اس گروپ میں شامل نہیں ہوا جس میں وہ شامل رہی ہو۔ سال نو پر اُس نے سب کو اپنے ضلع کے جنگلوں میں شکار کیلئے مدعو کیا۔ اسکی طرف مُڑکر دیکھا بھی نہیں۔ وہ جب بھی کسی جگہ جاتی ہمیشہ ایسا اتفاق ہوتا کہ وہ چند لمحے قبل وہاں سے جا چکا ہوتا یا پھر اسکے جانے کے بعد وہاں پہنچتا۔ اس ساری بے تعلقی اور بے نیازی کے باوجود وہ بڑے بھیّا کا بہت گہرا دوست تھا، اور ٹوٹو کا۔ اور اُس کی ممی بڑی کنور رانی صاحبہ کا۔ بڑی کنور رانی صاحبہ کو وہ ہمیشہ ان کی ریاستوں کے مقدموں کے متعلق طرح طرح کے دلچسپ مشورے دیا کرتا۔ ان کے اختلاجِ قلب کے وہمی عارضے کیلئے نئے نئے معالج تجویز کرتا۔ بڑے بھیّا کو گھوڑوں، کتوں اور موٹروں کی خریداری میں اُنکی مدد کرتا۔ بڑے بھیّا کی ولایتی بیوی یعنی چھوٹی کنور رانی صاحبہ کے ساتھ اُنکے پسندیدہ رقص کرتا۔ ٹوٹی سے کھیلتا۔ ٹوٹو سے اسکی فرنکس اور ہوائی جہازوں کی باتیں کرتا۔

پھر اس کا تبادلہ ہو گیا اور وہ وہاں سے بہت دور چلا گیا۔
اور اُس نے یوپی گزٹ کا پرچہ آتشدان میں پھینکدیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے پپوٹے اسی شدّت سے جلا کئے۔

وہ اپنی اس بیکار، بے مصرف، احمق زندگی سے عاجز آگئی۔ پھر وہ جاڑوں کے سرد، اُکتائے ہوئے بے رنگ دن گذارنے کیلئے اپنے تعلقے پر چلی گئی۔ اُس نے اپنے پُرانے قصباتی محل کی ایک ایک چیز کو چھوا۔ شہ نشین، دالان، گیلریاں، کمرے، وہ پھاٹک جن کی محرابوں پر اودھ کی سلطنت کا پُرانا نشان آمنے سامنے دو بڑی بڑی مچھلیاں سُرخ پتھر سے بنی ہوئی تھیں وہ درخت جن کی شاخوں پر بیٹھ کر وہ ٹوٹو کیساتھ بچپن میں اسکول کا ہوم ورک ختم کیا کرتی تھی۔ اور باغ کے نشیب میں بانس کے ہرے جھنڈ کے نیچے بڑے حوض کے جنگلے کی جالی کے کچھ حصے شکستہ ہو کر پانی میں گر چکے تھے۔ آموں کے سائے میں سُرخ پتھر کے چبوترے کے چاروں طرف اُونچی اُونچی گھاس اور خودرُو پودے اُگ آئے تھے۔ اور چبوترے کی سیڑھیوں کے کونے ٹوٹ گئے تھے۔ موٹر خانے اور اصطبل کی چھت کے بھاری شہتیر بہت نیچے جھک آئے تھے۔ اور اُسکا دل جیسے بیٹھا جا رہا تھا۔ اور سارے قصبے میں شور مچ رہا تھا۔ بٹیا صاحب واپس آگئیں۔ بٹیا صاحب اب بہت بڑی ہو گئی ہیں۔ اُنھوں نے کالج، ولایت سب پاس کر لیا ہے۔ بڑے بھیّا صاحب اتنا پڑھ گئے ہیں۔ پر اب اُنکو گھوڑوں کا شوق نہیں رہا انکے دونوں گھوڑے اصطبل میں اُکتائے ہوئے کھڑے اپنی دُموں سے

مکھیاں اُڑا رہے ہیں پر بٹیا صاحب نے بھول کر رام آسرے سے اُن کیلئے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ اب موٹر بھی اتنی تیزی سے نہیں چلاتیں۔ بس دن بھر اکیلی اکیلی باغ میں گھوما کرتی ہیں یا بڑے چودھری صاحب کے مزار کی سیڑھیوں پر بیٹھی جانے کیا کیا لکھا کرتی ہیں۔

پھر سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ بٹیا صاحب کی بڑے بھیّا صاحب سے لڑائی ہوگئی ہے۔ چھوٹے کنور صاحب ٹوٹو میاں تو گذارے دار ہیں ان سے بڑے بھیّا سے کوئی مطلب نہیں لیکن بڑے چودھری صاحب بٹیا صاحب کو بہت چاہتے تھے۔ وہ بٹیا صاحب کے نام بہت سے گاؤں لکھ گئے ہیں ویسے تعلقداری کے قانون کے لحاظ سے لڑکی کو وراثت میں کچھ نہیں ملتا۔ اسی لئے بڑے بھیّا اب ان سے جلتے ہیں۔ بڑے بھیّا اپنی ریاست میں بہت ہردلعزیز تھے۔ انھیں ٹینس، کتوں، گھوڑوں اور موٹروں کا بیحد شوق تھا۔ وہ ہر سال نئی موٹریں خریدتے اور عمدہ گھوڑے اور کتے۔ لیکن وہ کبھی ریس میں نہیں جاتے تھے۔ کبھی ڈرنک نہیں کرتے تھے۔ چھتر منزل اور دلکشا کلب میں رات رات بھر ڈانس میں نہیں گذارتے تھے۔ اُن کے تعلقے کو کورٹ آف وارڈ سے چھٹکارا حاصل ہوئے بہت کم عرصہ ہوا تھا لیکن اتنے دنوں میں اُنھوں نے اپنی رعایا کے دلوں میں بہت جلد جگہ بنالی تھی۔ اُنکی ولایتی میم صاحب کبھی سلیکس یا اُونچی اُونچی اسکرٹ پہنکر باہر نہیں گھومتی تھیں جیسا کہ سُنا گیا تھا کہ وہ لکھنؤ، نینی تال اور مسوری میں کرتی ہیں۔ بلکہ ہمیشہ بڑی کنور رانی صاحب اور بٹیا صاحب کیطرح

غرارہ پہنکر اور دوپٹے سے سر ڈھک کر باہر نکلتی تھیں ۔ پر اتنے اچھے بھیا صاحب کو جانے کیا ہوا کہ اپنی اکلوتی بہن سے لڑ بیٹھے ۔

اور پرانی محلسرا کی ساری مہریاں ، مغلانیاں ، سائیس ، رکابدار اور دوسرے ملازمین سائے کی طرح چپکے چپکے ادھر اُدھر سرگوشیاں کرتے پھرتے ۔ بٹیا صاحب کو دیکھکر انھیں بڑے چودھری صاحب کا زمانہ یاد آرہا تھا ۔ ان کو مرے کتنے کم دن ہوئے تھے پر لگتا تھا جیسے مدتیں گذر گئیں ۔ وہ دن جب بٹیا صاحب اسکول بند ہونے پر چھٹیوں میں نینی تال سے آتی تھیں اور چھوٹے بھیا کے ساتھ دور دور تک گھوڑا دوڑاتی چلی جاتی تھیں ۔ اور جب گرمیوں میں آم کھانے کیلئے لکھنؤ سے بھیا صاحب کے دوستوں اور اُنکی سہیلیوں کی پارٹیوں کے ٹرک اور اسٹیشن ویگنیں خوب دھول اُڑاتے قصبے کی سڑک پر داخل ہوتے تھے ۔ وہ سب زمانے گذر گئے اور بڑے چودھری صاحب کے سفید جالی والے سنگِ مرمر کے مزار پر مونیا اور بیلے کے جھاڑ جھک آئے اور اُنکے گھوڑے اصطبل میں کھڑے کھڑے بوڑھے ہو چلے ۔ اور بٹیا صاحب اکیلی اکیلی دن بھر آم کے باغوں میں گھوما کرتیں ۔

پھر وہ اپنے باغوں سے بھی اُکتا گئیں ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کرے ۔

اور ایک روز لکھنؤ سے آنیوالی سیمنٹ کی چوڑی سڑک پر سے گرد اُڑتی ہوئی ایک سفید اسٹیشن ویگن آم کے ان ہرے کنجوں میں

داخل ہوئی اور سرجو کے کنارے آکر رُک گئی۔

اور سارے میں کھلبلی مچ گئی۔ کیونکہ بڑے بھیّا صاحب اور چھوٹے کنور صاحب کی غیر موجودگی میں بڑے صاحب ضلع کا دورہ کرتے ہوئے وہاں آ پہنچے تھے۔ اور بٹیا صاحب کو یہ خبر سُنانے کیلئے مہریاں سارے کام چھوڑ چھاڑ کر اپنے گھیردار سُرخ اور اُودے لہنگے سمیٹتی اور پیروں کے چاندی کے کڑے بجاتی محلسرا کے اندر بھاگیں۔ اور ڈیوڑھیوں میں بیٹھ کر شطرنج کھیلنے اور حقہ پینے والے سارے منشی اور لالہ اور بھیّا صاحب کا سارا عملہ ہڑبڑا کر اپنے اپنے کاغذات اور رجسٹروں کی طرف لپکا۔

اور قیامت کی طرح وہ اپنی سفید اسٹیشن ویگن میں سے اُترا۔ اور اپنے گوگلز اُتار کر اُس نے چاروں طرف کی ہریالی، اور سرجو کو پگھلی ہوئی چاندی جیسے بہتے ہوئے پانی پر نظر ڈالی۔ اور پھر وہ اپنے عملے کے ساتھ جانچ پڑتال کیلئے آگے روانہ ہوگیا۔

اور بٹیا صاحب پُرانی محلسرا کے اندر اپنے وکٹورین طرز کے سجے ہوئے کمرے میں بیٹھی پیانو بجاتی رہیں۔ اور سرجو کے کنارے آموں کے باغ میں بڑے صاحب کا پڑاؤ کئی دن تک رہا۔

اور ایکا ایکی بٹیا صاحب اپنی بیوک میں بیٹھکر لکھنؤ واپس جانے لگیں ان کا سارا عملہ اور سارے رشتے دار اُنھیں خدا حافظ کہنے باغ کے بڑے پھاٹک تک آئے جس کی محرابوں پر سُرخ پتھروں کی دو مچھلیاں بنی ہوئی تھیں۔ اور پھر دو موٹریں اسی سڑک پر جامنوں کی چھاؤں میں

آگے پیچھے دوڑنے لگیں۔ ایک سفید اسٹیشن ویگن۔ اور ایک گہری سُرمئی بیوک ایک جھٹکے کیساتھ نیلے دُھویں کے بادل چھوڑتی ہوئی آگے نکل گئی اور اسٹیشن ویگن سیمنٹ کی سفید ویران سڑک پر رینگتی رہی۔

اُسکی آنکھوں کے پپوٹے یُونہی چلتے رہے۔ اور چھاؤنی کے بگل اسی طرح بجتے رہے۔ اور کرائیسٹ چرچ کے گھنٹے۔ پھر گرمیاں آئیں — اور مسوری کا سیزن — وہ ایک انگریز پولیس آفیسر تھا۔ جو صرف تین سال قبل انگلستان سے آیا تھا۔ اور کہتے ہیں اس سیزن میں وہ اس پر بالکل مر مٹا۔ اور قصبے میں پھر سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ بٹیا صاحب کو کیا ہو گیا جو انگریز سے شادی کئے لے رہی ہیں۔ اور مسوری کی روایت ہے کہ ایلمر بریڈلے تو چٹان پر سے کود کر خودکشی کرنے کو تیار تھا۔ ٹوٹو کا بمبئی سے تار آیا: کیا یہ افواہ صحیح ہے۔

کاش وہ صرف یہ محسوس کر لیتا۔ کاش اس کو محض اس کا اندازہ ہو جاتا کہ وہ یہ سب کچھ محض انتقاماً کرنا چاہ رہی ہے۔ بے بسی کا انتقام لیکن وہ بہت دور تھا اور ہمیشہ کی طرح سب سے بے نیاز اور بے تعلق۔ چاہے وہ اس سے بھی زیادہ کوئی انتہائی حماقت انگیز حرکت کر بیٹھتی تب بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ اسکے متعلق کچھ سوچتا بھی نہیں۔

اور بریڈلے کی چھٹی ختم ہو رہی تھی اور وہ الہ آباد واپس جا رہا تھا جہاں کا وہ ایس۔ پی تھا۔

اور جب وہ رنک سے نکل ایلمر بریڈلے کے ساتھ رکشا میں بیٹھ رہی تھی

اسی وقت وہ لیڈی اعجاز کے خاندان کے ساتھ اس طرف آتا نظر آیا۔ اسکی سیاہ آنکھوں کی گہرائیاں بہت خاموش تھیں۔ ہمیشہ کی طرح بہت خاموش لیکن متبسم۔ رکشا کے قریب سے گذرتے ہوئے انھیں دیکھ کر وہ بریڈلے سے باتیں کرنے لگا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں۔ اپنے اپنے محکموں کے واقعات، اور پھر قہقہے، مترنم قہقہے۔ اور مسوری کی ساری روشنیاں چکر کھاتی، گھومتی ہوئی نیچے ڈوبی جا رہی تھیں۔ اور جس چٹان پر اسکی رکشا کھڑی تھی وہ ٹوٹ کر تیزی سے نیچے کھڈ میں گر رہی تھی۔

پھر وہ اسکو سلام کئے بغیر، اسکو دیکھے بغیر اعجاز کی چھوٹی لڑکی اور دونوں بڑے بیٹوں کیساتھ وادی کی طرف اُتر گیا۔ شاید وہ سب چاندنی رات کی پکنک کے لئے جا رہے تھے۔ یہ راجکماری جہاں آرا بیگم اس انگریز شخص سے کیوں شادی کر رہی ہیں۔ اس سے تو ہمارا لفٹنٹ کمانڈر حفیظ الرحمٰن ہی کہیں بہتر تھا جو میں نے تجویز کیا تھا۔ اُس نے دُور سے اُسے کہتے سُنا پھر وہ سب وادی میں اُترتے ہوئے چاندنی کے دُھندلکے میں کھو گئے۔

اور اس شام، واپس سوائے پہنچکر اس نے رات بھر میں اپنا سارا سامان پیک کر لیا۔ ٹوٹو بمبئی سے آچکا تھا۔ بڑی کنور رانی صاحبہ کی دیکھ بھال اسکے سپرد کر کے وہ صبح پہلے گیٹ سے دہرہ دون آگئی۔ راجپور سے اس نے ایلمر بریڈلے کو فون کیا کہ وہ جا رہی ہے — اور افسوس ہے کہ اب اُس سے کبھی نہیں مل سکے گی کیونکہ اُس نے اپنا

شادی کا ارادہ تبدیل کر دیا ہے۔

وہ گھر واپس پہنچی اور کار سے اُتر کر سیدھے اپنے کمرے میں جا کر مسہری پر گر گئی۔ اور خوب خوب رونے سے زیادہ مناسب کام اس کی سمجھ میں اسوقت اور کوئی نہ آیا۔ وہ خوب روئی۔ یہانتک کہ شام کا اندھیرا چھا گیا اور مال پر قُمقُمے جگمگا اُٹھے اور ولکشا کی طرف ٹینگو کی موسیقی ہواؤں میں گونجنے لگی۔ پھر چھاؤنی کا رات کا بگل بجا۔ اور باغ میں رات کے پرند چیخنے لگے۔

پھر صبح ہوئی۔ ایک اور صبح۔ اور وہ آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھی — اور مسہری کے سرہانے کی میز پر اُس کی غیر موجودگی میں جمع شدہ ڈاک کے ایک نقرئی لفافے پر اس کی نظر پڑی۔ وہ سر ولیڈی اعجاز کی چھوٹی لڑکی کی شادی کا دعوت نامہ تھا۔ اور کھانے کے کمرے میں چھوٹی کنور رانی صاحبہ اپنے بچے کو اوولٹین پلانے کے مرحلے میں مصروف اسے طرح طرح سے بہلا پھسلا رہی تھیں ٹونی ابکے سے تمھارے انکل جمیل تمھارے لئے اسکوٹر لائیں گے۔ اور اچھا تم اپنی نئی آنٹی کو دیکھو گے؟ انکل جمیل تمھارے لئے ایک پیاری سی آنٹی لینے گئے ہیں۔ تم نے اوولٹین نہیں پیا تو ریحانہ آنٹی تم سے کبھی نہیں بولیں گی۔ اور ٹونی نے فوراً اوولٹین پینا شروع کر دیا۔

اور رات آئی۔ ایک اور رات۔ جبکہ ہوائیں چل رہی تھیں اور اٹھ رہی تھی۔ بڑے بھیّا اور چھوٹی کنور رانی صاحب گورنمنٹ ہاؤس کے

ڈنر میں گئے ہوئے تھے۔ اور وہ اکیلی تھی۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلی۔ بالکل تنہا۔ اور اسوقت اس نے سوچا۔ وہ کیوں پیدا ہوئی۔ کیوں بڑی ہوئی۔ اُس نے کیوں اتنا پڑھا لکھا۔ وہ مسوری کے حسن کے مقابلوں میں کیوں ہمیشہ فرسٹ آئی۔ اُس نے شہسواری اور پیانو میں مہارت کس لئے حاصل کی۔ کس لئے انسان اتنا مجبور اور بے بس ہے۔ اتنا بے بس۔

پھر ٹوٹو نے بمبئی سے لکھا۔ بٹیا۔ لفٹنٹ کمانڈر رحمٰن سے اب بھی شادی کرلو۔ وہ تمھیں بہت پسند کرتا ہے۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ جن باتوں کا وہ مذاق اُڑایا کرتی تھی وہی سب باتیں ایک ایک کرکے اُس کے ساتھ ہو رہی تھیں۔ قسمت کتنی ستم ظریف ہے۔

اور روایت ہے کہ ایلمر بریڈلے اس قدر دل شکستہ ہوا کہ اُس نے آئی سی ایس اور آئی پی والوں کے لئے (COMPENSATION) کی تجویز منظور کرلی اور اگلے جہاز سے ولایت واپس جانے کے لئے تیار ہوگیا۔

اور پھر بڑے بھیّا نے کہلوایا۔ میں ہرگز یہ پسند نہیں کرسکتا کہ تم اس طرح بیکار ادھر اُدھر گھوما کرو۔ تمھیں اب کسی نہ کسی سے شادی ضرور کرنا پڑے گی۔ بڑی کنور رانی صاحبہ پر اختلاج قلب کا بہت سخت دورہ پڑنے والا تھا لیکن اس کی شادی کی خوشی میں وہ اچھی ہونے لگیں۔

اور پھر اسی طرح شہ نشینوں اور درختوں میں برقی قمقمے جگمگائے اسی طرح ملٹری بینڈ اور آرکیسٹرا چیخا۔ اور اُس کی شادی ہوگئی۔ اُس نے اپنے شوہر کو ایک آدھ مرتبہ پہلے کبھی مسوری میں دیکھا تھا۔ وہ شہر اپنا

چھوٹا سا تعلقہ دار تھا۔ جس کی آمدنی حد سے حد چالیس پچاس ہزار سالانہ رہی ہوگی۔ اس کی تعلیم لکھنؤ کے لامارٹینیر اور کالون تعلقہ دارز کالج سے آگے نہ تھی۔ لیکن وہ اچھا ڈانسر تھا۔ اور ٹینس کا اچھا کھلاڑی تھا۔ اور اچھا فلرٹ تھا۔ مسوری آئی ہوئی ہندوستان کی ساری راجکماریوں اور بیگمات سے فلرٹ کرنا اسکا دلچسپ ترین مشغلہ تھا۔ اور اس کی شادی ہوگئی۔ اور وہ اس زندگی میں زبردستی دلچسپی لینے لگی جو اُسے کبھی بھی زیادہ پسند نہ تھی۔ وہ گرمیوں کے چار مہینے پہاڑ پر اور سال کا باقی حصہ اپنے شوہر کے تعلقے پر بارہ بنکی یا سیتاپور میں گذارتی جہاں روز کسی نہ کسی انگریز یا ہندوستانی افسر کی آمد پر دعوتیں ہوتیں اور اُسے رات رات بھر فلور پر رقص میں جاگنا پڑتا۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ وہ اپنی آنکھوں کے پپوٹوں کی جلن کو بھلانے میں خاصی کامیاب ہوچکی تھی۔ اور چھاؤنی کے بگل کی آواز کو۔

پھر وہ اپنے بچے کی دیکھ بھال میں مصروف رہنے لگی۔ اور پھر ایسا ہوا کہ اُس کا تبادلہ اسی ضلع کا ہوگیا۔ جہاں اُسکے شوہر کی ریاست تھی۔ اُسکی بیوی ان دنوں اپنی ممی لیڈی اعجاز کے وہاں شملے گئی ہوئی تھی کاش کوئی آکر اُس سے کہتا کہ وہ بالکل اپنی بیوی سے خوش نہیں ہے وہ بہت رنجیدہ رہتا ہے۔ وہ اکثر افسوس کیا کرتا ہے کہ اُس نے ریحانہ اعجاز سے کیوں شادی کرلی۔ لیکن وہ تو ہمیشہ کی طرح بہت خوش اور بشاش تھا۔ اُسکی سیاہ آنکھیں ویسے ہی متبسم تھیں اور اُسکے قہقہے ویسے ہی مترنم

کاش ایسا نہ ہوتا۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔

اور اس سال مسوری میں اس کا شوہر جسکی اپنی مخصوص مشغلہ میں دلچسپی ویسی ہی برقرار تھی، سوسائٹی کے ایک بہت زبردست اسکنڈل میں انوولو ہوگیا اور نئی دہلی کے ایک "نائٹ" کی لڑکی نے اسے کورٹ تک پہنچانے کی دھمکی دی۔ وہ یہ سب باتیں برداشت نہیں کرسکی۔ اس نے خاموشی سے طلاق لے لی اور ایک بار پھر لکھنؤ واپس آگئی۔ اس کا بچہ اسے نہیں مل سکا۔ بڑی کنور رانی صاحبہ نے اس سے بولنا چھوڑ دیا۔ بڑے بھیّا نے اس سے ہمیشہ کیلئے قطع تعلق کرلیا ٹوٹو کسی ٹریننگ کیلئے امریکہ جا چکا تھا۔

اور اسوقت اسے ایلمر بریڈلے کا خیال آیا۔ وہ ابھی ہندوستان ہی میں تھا۔ اور اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لے چکی ہے۔ وہ اپنے بچے کو کسی طرح نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔ وہ اسکو نہیں مل سکتا تھا کیونکہ وہ اپنے باپ کی ریاست کا ولیعہد تھا۔ اُس کے لئے اُس نے خود تلاش کرکے ایک عمدہ سی کورنس بھجوائی اور اُسکے پہلے شوہر نے وعدہ کرلیا کہ وہ جب چاہے بچے کو آکر دیکھ سکتی ہے۔ وہ کوئی مداخلت نہیں کریگا۔

اور اُسکے چاروں طرف اتنا گہرا، اتنا سُرخ، اتنا بھاری اندھیرا چھاگیا کہ وہ اپنی آنکھیں نہ کھول سکی۔ فضاؤں میں وحشت اور ویرانی کی تاریک روحیں زور زور سے چیخیں مارنے لگیں۔ ہوائیں روتی رہیں۔ سُرخ دریا کے کنارے دھواں بلند ہوتا گیا یہانتک کہ وہ ساری کائنات پر

چھا گیا۔ پُرشور طوفان کی زد میں آکر تیزی سے گھومتے ہوئے نڈھال چاند کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر اتھاہ تاریکی میں گم ہوگئے اور ایلمر بریڈلے سے اُسکی سول میرج ہوگئی۔

سارے صوبے کی سوسائٹی میں اچھا خاصا تہلکہ مچ گیا۔ انڈین پولیس کے ایک یورپین آفیسر نے ایک ہندوستانی تعلقہ دار کی لڑکی سے شادی کرلی۔ گورنر سمیت سارا یورپین طبقہ تلملا اُٹھا۔ لیکن ایلمر بریڈلے خاموشی سے اسے اپنے ساتھ لیکر چند ہفتوں کے لئے کشمیر چلا گیا۔

اور اسکے کچھ عرصے بعد اسکے پہلے شوہر نے اپنے خاندان کی ایک پردہ نشین لڑکی سے دوسری شادی کرلی جو اسکی تفریحات میں قطعی مداخلت نہیں کرسکتی تھی۔ وہ کشمیر سے الہ آباد آئی۔ دن تیزی سے پرواز کرنے لگے۔ اس کا دل بے انتہا چاہ رہا تھا کہ اپنے بچے کو دیکھے لیکن ایلمر کو یہ قطعی گوارہ نہیں تھا کہ وہ اپنی گذشتہ زندگی سے کسی قسم کا تعلق بھی قائم رکھے۔

پھر اس سال مسوری میں ایسا اتفاق ہوا کہ سوائے میں اپنے برابر والے سُوٹ میں اسکا پہلا شوہر مع اپنی بیوی اور اسکے بچے کے آکر ٹھیرا۔ اکثر لان پر اسکو اپنا بچہ کھیلتا ہوا نظر پڑجاتا۔ وہ دوڑ کر اُسکے پاس جاتی اُسے چاکلیٹ اور کھلونے دیتی۔ بچہ ممی ممی کہکر اُسکی ساری کے آنچل یا دوپٹے کے پلو کو اپنی طرف کھینچتا لیکن وہ جی پر جبر کرکے اُسے گورنس کے پاس چھوڑ کر اپنے کمروں کی طرف چلی آتی۔ اُسکے پہلے شوہر کا حکم تھا کہ بچے کو تو یہ بالکل معلوم نہ ہونے پائے کہ اُسکی ماں کا دوسرا شوہر ایک انگریز ہے

اور اس کے سوتیلے بہن بھائی اینگلو انڈین ہونگے۔

اور مسوری کا سارا سیزن اسی طرح گذرا۔ اور وہ چپکے چپکے خدا سے دُعا مانگتی رہی کہ وہ مرجائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور اسوقت وہ ایک چٹان پر کھڑی تھی۔ اسکے سیاہ لہروں والے بال اسکارف میں سے نکل نکلکر ہوا میں اُڑ رہے تھے، اُسکی ساڑی ہوا کے تھپیڑوں سے مخالف سمت میں اُڑی جا رہی تھی۔ اور وہ اُکتا کر دوربین کے ذریعے وادی کا نظارہ کر رہی تھی۔ چٹان کے نیچے بل کھاتی ہوئی سڑک پر موٹریں اور بسیں کھنکھجوروں کی طرح ایکدوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی اوپر چڑھ رہی تھیں یا نیچے اُتر رہی تھیں ایمر کیمرہ لیکر پہاڑی کی چوٹی کی طرف چڑھ گیا تھا اور وہاں سے اُسکو آواز دے رہا تھا اور اُسے ایک طویل سفید اسٹیشن ویگن نظر آئی جو لہراتی ہوئی سڑک پر اوپر چڑھ رہی تھی۔ اور اس نے دوربین اپنی آنکھوں پر سے ہٹا دی۔

پھر وہ ایمر کا سہارا لیکر چٹان سے نیچے اُتر آئی۔ اور ایمر نے اس سے کہا تھا کہ وہ اب (COMPENSATION) لیکر ولایت واپس جانا چاہتا ہے اور اُس نے یقین دلایا تھا کہ وہ اسکے انگلستان کے خوبصورت پُرسکون قصباتی مکان میں اور سیب اور چیری کے شگوفوں کے درمیان پہلے سے کہیں زیادہ خوش رہ سکے گی۔ اور اسکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ قسمت۔ قسمت کی ستم ظریفیاں۔ کم از کم اسکو ابتک یہ اطمینان تھا کہ وہ اپنے پیارے بچے کو جس سے اُسے بیحد محبت تھی

کبھی کبھی دیکھ سکتی تھی۔ پر اب وہ بھی اس سے ہمیشہ کیلئے چھُٹ رہا تھا۔ وہ انتقاماً اپنی پہلی شادی کیلئے راضی ہوگئی تھی، پھر انتقاماً اُس نے اپنے پہلے شوہر کو طلاق دیدی تھی۔ اب اس تیسرے شخص سے انتقام لیکر وہ کہاں جاسکتی تھی۔

اور رات ہورہی تھی۔ وہ سب تاج کے ٹیرس پر بیٹھے تھے ایلیمر وطن جانیکی خوشی میں سیٹیاں بجا رہا تھا اور اپنے دوستوں سے کہتا پھر رہا تھا کہ وہ مشرق کی الف لیلوی سرزمین میں آکر یہاں سے ایک سچ مچ کی چھوٹی سی سوتی جاگتی گڑیا ایسی "پرنسس" کو اپنے ساتھ لئے جارہا ہے۔ وہ ریلنگ پر جھکا گیا۔ اس نے دیکھا۔ نچلی منزل سے وہ لفٹ کے ذریعے نیچے اُتر رہا تھا۔ وہ جو کسی سرکاری کام سے انگلستان بھیجا جارہا تھا۔ اور وہ اُن ہی کے جہاز میں سفر کرنیوالا تھا۔ وہ سب ایکساتھ ٹہلتے ہوئے گیٹ وے آف انڈیا تک گئے۔ گرین فر کے قریب تیری سے بینڈ بج رہا تھا اور سمندر کی سیاہی مائل گہری سبز موجیں گیٹ وے کی سیڑھیوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس جارہی تھیں۔ تھکا ہوا، اُکتایا ہوا چاند ناریل کے درختوں کے پیچھے سے طلوع ہورہا تھا۔ اور کولابہ کی طرف سے ہوا کے خنک اور نم جھونکے آرہے تھے

پھر اس لمبے، سفید جہاز نے سیٹی دی۔ وہ عرشے پر کھڑی رہی۔ ساحل آہستہ آہستہ اُس سے دور ہوتا گیا۔ شام ہوئی۔ عرشے پر ڈانس شروع ہوگیا۔ وہ تھک کر اپنے کیبن میں آکر سوگئی۔ اور سمندر اور آسمان کی تاریکی گھُل مِل کر سب گہری ہوگئی۔ موجوں کی سطح پر بہت سی آوازیں تیر رہی تھیں

مانوس ، پرانی آوازیں ۔ اور وہ آوازیں دُور ہوتی چلی گئیں ۔ لائیٹ ہاؤس کی سُرخ روشنیاں رفتہ رفتہ افق میں کھو کر اندھیرے میں ڈوب گئیں ۔ دُور سب دُور ۔ لیکن وہ اُس سے دُور نہیں تھا ۔ وہ جو اسوقت اسکے برابر والے کیبن میں سو رہا تھا ۔ اور وہ خود ایک غیر ملکی شخص کے ساتھ ایک اجنبی سرزمین کی طرف جا رہی تھی ۔ ہمیشہ کیلئے ، ایک نا معلوم منزل کی طرف اور بڑے بڑے چینی کے گلدانوں کے سائے دیوار پر پھیل گئے ۔

اور ایلبرٹ اپنی برف جیسی سفید برتھ پر لیٹا خالص انگریزی اور امپریلیٹک انداز سے خراٹے لے رہا تھا ۔ اور برابر والے کیبن میں دوسرا شخص بھی سو رہا تھا ۔ وہ کمبخت دوسرا شخص ۔ سفید پردوں کی دوسری جانب ۔ سفید ریشمی پردے جو آدھی رات کی سمندری ہوا میں آہستہ آہستہ ہل رہے تھے ۔ جہاز موجوں کے سفید جھاگ کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا گیا ۔

اور اندھیرا گہرا ہو گیا ۔ بہت گہرا ۔ بہت گہرا ۔

قصّہ پروفیسر علی بابا کا

شفیق الرحمٰن

خوش نما محل
صفحات :- ۲۰۰ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن

جسکو یکہ تازِ میدانِ فصاحت، شہسوارِ عرصہ بلاغت،
سخنگوئے شیریں کلام محمد خالد بی۔ ایس سی۔ انجینیرنگ۔
حال مقیم انگلستان نے باوجود ہزارہا وعدوں کے ترتیب دینے
سے انکار کر دیا،

چنانچہ ہیچمدان ناچیز کمترین مصنف عفی عنہٗ کو اکیلے ہی بقلم خود
بزبانِ اُردو زیورِ نظم و نثر سے مثلِ عروس مُرصّع کرنا پڑا اور کوزے کو
دریا میں بند کرنا پڑا۔

از راہِ عالی ہمتی رئیسِ والاشان، جوہر شناس اہلِ کمال
طاقت نظام، زرّیں رقم مُنشی کرشن چندر صاحب ایم۔ اے۔ ایل
ایل بی نے اپنے مجموعۂ فیض مرجع میں اس کے طبع کا حکم

صادر فرمایا تاکہ ہر خاص و عام اس قصۂ نصیحت و فضیحت آموز سے مستفید ہو سکے۔

جاگے سب سنسار، سوئے پروردگار، اے صاحبو راویانِ روایاتِ حاکیانِ حکایات شاہد دلربائے سخن اور لعبتِ شیریں ادائے افسانہائے کہن کو یوں ہفت آرائش سے مزین کرتے ہیں کہ شہر بغداد جہاں ہر فرد و بشر کو شعر و شاعری کا ذوق تھا، عشق و محبت کا شوق تھا۔ جہاں ہر رات عید تھی اور ہر دن شبِ برات۔ کہیں نوآئے جاری کہیں ساون بھادوں کی تیاری۔ سبزہ زمردگوں گلہائے معنبر کے ایوان بوقلموں، صحن وسیع چھتیں رفیع، ہاتھی دانت کے تخت پر مذہب و مطلا گرد پوش۔ زرد اطلس کا گاؤ تکیہ بڑے دام کا، اسپر بھاری کار روپہلے کام کا، سامنے سنگِ مرمر کا حوض لطافت بار، پانی جواہر خیز و گوہر بار، شہر بغداد جہاں ——— لیکن ٹھیریئے یہ قصہ بغداد کا نہیں ہے، کہیں اور کا ہے۔

اے صاحبو قصہ یوں چلتا ہے کہ کسی جگہ ایک علی بابا رہتا تھا، یوں تو آس پاس کئی اور علی بابے بھی رہتے تھے لیکن بطور علی بابا وہ اُن سب میں نمایاں و ممتاز تھا۔

علی بابا خوش وقت، خوش نصیب اور خوش طبیعت تھا۔ خدا نے اُسکے والد کو بہت سارے چھپّر پھاڑ کر دولت عطا فرمائی تھی، کیونکہ وہ شہر کا سب سے بڑا اور کامیاب ٹھیکیدار تھا۔ اس لیئے بے فکری کا دور دورہ تھا ایسے صحت افزا حالات میں علی بابا کا محبوب ترین مشغلہ وہی تھا جو اس

قسم کے انسانوں کا ہوتا ہے ـــــ یعنی صبح سے شام تک سیاسیات ۔ وہ سیاسیات پر عاشق تھا اور اُس کا خیال تھا کہ سیاسیات اُس پر عاشق ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی خاص فرقے یا گروہ کا مدّاح تھا ـــ نہیں ۔ وہ ہر پارٹی کا طرفدار بھی تھا اور مخالف بھی ۔ صبح جس فرقے کی طرفداری میں لڑتا شام کو اُسی کے خلاف جھگڑتا ۔ جب وہ سیاسیات پر بحث کرتے کرتے تھک جاتا تو پھر بحث شروع کر دیتا ، جب بحث کرکرتا تو پھر بحث کرتا ۔ اُس نے خبریں سُنتے سُنتے وجد میں آکر مُکّوں سے کئی ریڈیو توڑ ڈالے تھے ۔ اُسکی زندگی کے بہترین لمحے اس قسم کے بحث مباحثوں اور گالی گلوچ میں گذرے تھے ، جس روز وہ اس سلسلے میں کسی کو کچھ سُنا نہ لیتا اور کسی سے کچھ سُن نہ لیتا اُس روز اُسے سکونِ قلب میسّر نہ ہوتا اور یہی خیال رہتا کہ دن یونہی ضائع ہوا ہے ۔

ایک رات علی بابا ایک جلسے سے دیر ہوئے لوٹا ، سونے کا قصد کیا ہی تھا کہ پڑوس سے باتوں کی آواز آئی ، کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا کیا ہے کہ چند جانور سُتھان پر باتیں کر رہے ہیں ۔ علی بابا نہ حیران ہوا نہ پریشان ، کیونکہ اُس نے بزرگوں سے سُن رکھا تھا کہ چند صدیوں پہلے جانور بڑی مسجّع اور مقطع زبان میں گُھلّم گُھلّا باتیں کیا کرتے تھے ۔ دنیا کی سیاسی حالت پر گفتگو ہو رہی تھی ۔ سب جانور اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے ۔

گدھے نے کہا :۔ "حضرات انسانوں کی طرح اپنا وقت ضائع مت کیجئے ، خدا کیلئے کوئی مفید بات کیجئے ، یہ کیا بیہودہ موضوع لے

بیٹھے ہیں آپ۔"

اونٹ بولا۔"بھائی صاحب میں آپ سے متفق ہوں، آپ ہمیشہ عقلمندی کی بات کیا کرتے ہیں۔"

گدھے نے مسکرا کر کہا ــــ "شُتراں چہ عجب گر بنوازند گدھا را ــــ میرے خیال میں دُنیا کا سب سے فرسودہ موضوع سیاسیات ہے ــــ کچھ ہو رہا ہے، کہیں ہو رہا ہے، کوئی کر رہا ہے۔ نہ آپ اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں نہ میں، پھر مُفت میں تلملانے کی کیا ضرورت ہے ــــ"

بکرا بولا ــــ "موسم کو نہ آپ تبدیل کر سکتے ہیں نہ میں، پھر ہم موسم کے متعلق اتنی باتیں کیوں کیا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ سیاست سے بے بہرہ ہوں ــــ"

گدھے نے کہا۔"حضرت آپ کے اس فقرے نے میری پوزیشن کس قدر اَک ورڈ کر دی ہے ــــ دیکھئے ــــ"

علی بابا اپنے تئیں سیاست کی یہ بے حُرمتی نہ دیکھ سکا، تھر تھر کانپنے لگا، پہلے قصد کیا کہ چشم زدن میں اس مردُود گدھے کا سر تن سے جُدا کر دے، پھر سوچا کہ آخر کو گدھا ہے، موقعہ پا کر اس نابکار کو زدوکوب کر دینا ہی کافی ہوگا۔

لنگور گویا ہوا ــــ "آج میں نے اُس دوشیزۂ جاؤ جمال، پری تمثال، سرو بلند اقبال، مشتری خصال ــــ"

"کیا کہا آپ نے ؟ مشتری خصال ۔؟" بکرے نے بات کاٹی ۔۔۔
"آپ اُسی لڑکی کا تو ذکر نہیں کر رہے ہیں جو پڑوس میں رہتی ہے ۔۔۔؟"
"ہاں ۔ چاند اُسکے آگے ماند تھا ، آفتاب عالمتاب بلا خیرگی نگاہ تاب نظارۂ حسن گلو سوز نہ لا سکتا تھا ، وہ سیمیں بدن غنچہ دہن زنِ یوسف لقا ، گلگوں قبا ، جادو نگاہ متین اور یکتائے روزگار ، پری پیکر ، رشکِ قمر گلعذار وطرحدار لڑکیوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہی تھی ۔۔۔"
"سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ لیڈیز ڈبلز ہو رہے تھے ۔۔۔" گدھا بولا ۔
"آہ ۔۔۔ حسینوں سے فقط صاحب سلامت دُور کی اچھی ۔۔۔ نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دُشمنی اچھی ۔۔۔" لنگور نے کہا ۔
"کیا بے ہودگی ہے ۔۔۔" گدھا جھلّا کر بولا ۔
"گدھے صاحب ، بعض اوقات تو میرا آپ کو فی النار والسقر کرنے کا پختہ ارادہ ہو جاتا ہے ۔۔۔" لنگور بولا ۔
"یعنی ۔۔۔؟"
"یعنی جی چاہتا ہے کہ آپکو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کر دوں ۔۔۔"
"بھائی صاحب اس قسم کی گفتگو سے پرہیز کیجئے ۔۔۔" اونٹ بولا
"یہ جو اپنے پڑوس میں ایک جوانِ شمشاد قد رہتا ہے کیا اُس نے اس نازنین کو نہیں دیکھا ۔"
"غالباً تمھارا مطلب علی بابا سے ہے وہ لڑکی اُس کے ہاتھ

آنے سے رہی ـــــ"

"تو کیا اُس کے لئے کوئی آسمان سے اُترے گا ـــــ؟"

"اور کھجور میں اٹکے گا ـــــ" لنگور نے لقمہ دیا۔

"لڑکیوں کے معاملے میں ہر ایک کو ذرا سوشلسٹ ہونا چاہیئے۔" بیل بولا۔ "میرے خیال میں علی بابا اتنا بُرا بھی نہیں ہے، اُسے چاہیئے کہ اس لڑکی کو کزن بنالے۔ آجکل یہ حربہ عام ہے۔ کسی لڑکی کو کہیں لئے پھرو، کوئی پوچھے تو کہدو کہ میری کزن ہے، کوئی کچھ نہیں کہے گا ـــــ"

"کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔" لنگور بولا۔

لنگور اکثر بے تُکی باتیں کرتا تھا۔ ایکدم علی بابا کے دل میں خیال گذرا کہ دُنیائے ناپائیدار گذاشتی و گذشتنی ہے، زندگی کا بھروسہ نہیں۔ دمِ مستعار پر کسی کا اجارہ نہیں، ابھی سانس چلتی ہے اور ابھی باتیں کرتے کرتے جان نکلتی ہے۔ حیف ہے کہ ایسی پستہ دہن زُلیخا جمال پڑوس میں رہتی ہو اور زندگی عشق و عاشقی کے بغیر کٹے، یہ سُنہری موقعہ ہے۔ اُس نے اللہ کا نام لیا اور عاشق ہونے کا مُصمّم ارادہ کرلیا۔

اگلی صبح جانا علی بابا کا اور دیکھنا نازنین موصوف کو کھیلتے ٹینس اور ہونا عاشق ہزار جان سے۔ دیکھنا نازنین کا کہ ایک نوجوانِ خوبصورت لباسِ عمدہ پہنے مصروفِ تاک جھانک ہے، ہونا چار آنکھوں کا، معلوم ہونا کہ نام اُس بُتِ طنّاز کا مس مرجانا ہے۔

ابھی علی بابا کو عاشق ہوئے چند لمحے ہی گذرے ہونگے کہ اُسکا بھائی

قاسم آدھمکا قاسم اُن ہُشیار آدمیوں میں سے تھا جو چلتے وقت شارٹ کٹ کو بھی شارٹ کٹ کرنے سے نہیں چُوکتے۔ اُسکے چہرے سے یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بیحد حسّاس اور جذباتی انسان ہے لیکن قصور اُس کے جذبات کا نہیں اُسکے جگر کا تھا جو ہمیشہ سُست رہتا تھا۔

علی بابا نے پوچھا ــــــ "اے جانِ برادر، یہ چہرے پر اُداسی و پشیمانی کے آثار کیوں ہیں؟"

"پچھتا رہا ہوں ــــــ"

"کِس بات پر ــــــ؟"

"ابھی بات ہوئی نہیں، ارادہ ہے۔ مجھے ان دنوں فرصت تھی سوچا کہ پیشگی پچھتاؤں ــــــ"

"یا اخی، تھوڑی دیر ہوئی میں ایک مصیبت کے چنگل میں گرفتار ہوگیا تھا ــــــ"

"ہاں میں نے بھی دیکھا تھا، وہ تمھیں دیکھ رہی تھی اور تم اُسے ــــــ اے برادرِ عزیز یہ عشق اکیلے ہی اکیلے، ہمیں اطلاع تک نہ دی ــــــ"

"اس غلام کو معاف فرمائیے، اس بات کو ازراہِ نوازشِ بزرگانہ بہت نہ بڑھائیے۔ اس میں خموشی اور پردہ پوشی ہی مقتضائے وقت اور قرنِ مصلحت ہے، یہی خردِ دُوربین کی ہدایت ہے ــــــ"

"کیا مطلب ــــــ؟"

"یعنی صبر کیجئے ــــــ"

"کاش کہ میں مُنشی فاضل ہوتا، تو اس قسم کی عبارت میں جواب دیتا۔ اے برادر میرا جی چاہتا ہے کہ تجھ سے اُسی طرح پیش آؤں جیسے مولینا شیخ چلی پہاڑی بچھو کے ساتھ پیش آئے تھے ——"

"میرا بھی ارادہ ہے کہ تجھ سے بعینہ وہ سلوک کروں جو نانا فرنویس نے ایک جنگلی کبوتر سے کیا تھا، میں مولینا شیخ چلی والا قصہ ضرور سُنتا لیکن اسوقت مجھے بالکل فرصت نہیں ——"

"مجھے بھی نانا فرنویس کا قصہ سُننے سے معذور سمجھو لیکن یہ تُمنے اکیلے اکیلے عشق کیوں کیا ہے، کیا چیز ہے جو تمھیں مجھ سے افضل کرتی ہے کیا ہم دونوں ایک جیسے نہیں، تمھاری شکل بھی تو مجھ سے ملتی ہے"

"برادرِ مشفق، میری شکل آپ سے اتنی نہیں ملتی جتنی آپ کی مجھ سے ملتی ہے، یہاں تک کہ میں صبح صبح آئینے کی جگہ آپ کی تصویر رکھ کر شیو کیا کرتا ہوں ——"

"برادرِ من، صد حیف کہ آپ نے ہمیشہ احسان فراموشی سے کام لیا"

"چہ خوب، احسان فراموش کون ہے —— میں یا آپ؟ چار مہینے کا ذکر ہے آپ نے ریس اور برج میں روپیہ ہار کر ابا جان کے حساب سے رقم نکلوائی، میں جانتا تھا پھر بھی خاموش رہا۔ تین مہینے ہوئے آپ شراب پی کر اسقدر بدمست ہوئے کہ ایک عبادت گاہ میں جا کر عبادت کرنے لگے، وہاں سے آپ کو کون اُٹھا کر لایا —— میں۔ دو مہینے ہوئے جب آپ نے خودکشی کا قصد کر کے ٹاؤن ہال کا رُخ کیا تھا

میں ہی تھا جو آپ کو سمجھا بجھا کر واپس لایا۔ پچھلے مہینے آپ کو بٹیروں اور کبوتروں کی خرید کے لئے روپے کی اشد ضرورت تھی وہ آپکو کس نے دیئے۔"

"وہ سب درست ہے، لیکن اس ماہ آپ نے میرے لئے کیا کیا ہے، ——— مہینے کی آخری تاریخیں آگئی ہیں ———"

"اگر میں یہ کہوں کہ یہ عاشق ہونے کی اطلاع آپ کو غلط پہنچی ہے پھر ———؟"

"تو میں ہرگز یقین نہ کروں گا ——— مجھے معتبر نامہ نگار کی معرفت خبر ملی ہے ———"

"آپ کا معتبر نامہ نگار بکتا ہے ———"

"سچ مچ ———؟"

"ہاں سچ مچ ———!"

لیکن تیر نشانے پر بیٹھ چکا تھا اور علی بابا گھائل ہو چکا تھا۔ وہ زندگی سے بیزار ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ کبوتر بازی، بٹیر بازی، سیاسیات، کراس ورڈ معمے، شعر و شاعری، پتنگ بازی، غرضیکہ سارے مفید مشاغل ترک ہوئے، دن کو آہ و زاری ہوتی اور راتوں کو اختر شماری۔ پہلے پہل تو تارے گننا مشکل معلوم ہوا پھر وہ اپنے ایک دوست سے جو کالج میں ستاروں کا علم پڑھتا تھا ایک آلہ لے آیا جس سے ستارے گننا بالکل آسان ہو گیا۔ ایک دو گھنٹے میں سارے ستارے گن لیتا اور سو جاتا۔ ایک روز اُسے یونہی خیال آیا کہ تارے اُتنے کے اُتنے ہیں، ہر رات

میزان کرنے پر جواب ایک ہی آتا ہے۔ اُسی دن سے اُس نے اختر شماری چھوڑ دی اور آلہ واپس لوٹا دیا۔

رات کو اُس نے جانوروں کو باتیں کرتے ہوئے سُنا۔ گدھا کہہ رہا تھا ـــــ "یہ پڑوس میں جو علی بابا رہتا ہے اس قدر آہ و بُکا کرتا ہے کہ ہمیں رات کو آرام کرنا مشکل ہو جاتا ہے"

علی بابا کو گدھے پر پھر غصّہ آیا۔ وہ حسبِ معمول تھر تھر کانپنے لگا۔

اونٹ بولا :ـــــ "یار را یاری بود از یار یار اندیشہ کن، بھائی صاحب میرا تو بہت جی چاہتا ہے کہ کسی طرح اس جوانِ دلیر و سرو قد کے کام آؤں ـــــ"

بیل کہنے لگا ـــــ "حضرات میں تو یہی کہوں گا کہ ایسے معاملوں میں سوشلسٹ بن جانا چاہیئے، میں نے سُنا ہے کہ اُس مہ لقا کے والد بڑے وسیع خیالات کے انسان ہیں اگر یہ حاجی بابا ـــــ"

"علی بابا ـــــ" اونٹ نے لقمہ دیا۔

"معاف فرمائیے ـــــ اگر یہ علی بابا براہِ راست اُن سے ملے تو یقیناً اُس کی مراد بر آئے گی ـــــ"

علی بابا نے جو یہ مژدۂ طرب انگیز سُنا تو بہت شاداں و فرحاں ہوا۔ اگلے روز جب سپیدۂ طلعت نشان سحر نمودار ہُوا اور قلندر فلک کاسۂ خورشید لیکر گدائی کو نکلا، یعنی جب صبح ہُوئی تو وہ سیدھا مرجانا کے ابّا سے ملا، اور عقد کی خواہش ظاہر کی (مرجانا ہے)۔

وہ بولے ـــــ "اے نوجوان تجھے چار ابرو کا صفایا کرانا، ساتھ یا مُنھ پر سیاہی لگوا کر گدھے پر سواری مرغوب ہے جو ایسی بے ادبی، مُرتکب ہوتا ہے ـــــ"

علی بابا نے کمر ہمّت کس کر باندھ رکھی تھی، بولا ـــــ "گستاخی معاف، مرجانا لڑکی ہے، اُسے آپ برف میں لگا کر محفوظ رکھنے سے رہے، کہیں نہ کہیں تو اُسکی شادی ہوگی ہی، گذرتے ہوئے دنوں کے ساتھ اُس کی عمر کوئی گھٹتی بھی نہیں جا رہی ـــــ"

بزرگ مارے غصّے کے تھر تھر کانپنے لگے اور پندرہ بیس منٹ تک کانپتے رہے۔ پھر بولے ـــــ "اے مردِ گستاخ پہلے یہ بتا کہ تُو میرے پاس براہِ راست کیوں آیا ہے، یہ کارروائی تجھے باقاعدہ اور باضابطہ کرنی چاہیئے تھی جیسے ہندوستان میں دستور ہے، یعنی پہلے اپنے ابّا کو کہا ہوتا، وہ مجھ سے درخواست کرتے، میں پہلے انکار کرتا پھر درخواست پر غور کرتا، اگر نہ کرنی ہوتی تو کہتا کہ لڑکی کی عمر ابھی چھوٹی ہے ابھی چند سال انتظار کیا جائے گا۔ اور اگر اقرار مقصود ہوتا تو کافی عرصے تک تم لوگوں کو جھوٹے سچّے وعدوں پر لگائے رکھتا، اچھی طرح خراب کر کے پھر ہاں کرتا ـــــ"

"جناب شادی کے معاملے میں صرف خواہش ظاہر کی جاتی ہے اگر چھپے ہُوئے فارم ہوتے ہوں تو دے دیجئے بھر کے دستخط کر دُوں گا۔ انگوٹھا بھی لگا دُوں گا ـــــ"

میزان کہ اس مرتبہ جو بزرگ نے تھرتھر کانپنا شروع کیا ہے تو آدھ گھنٹے چھٹ کانپتے رہے پھر بولے ـــــ "اچھا یہ بتا کہ تُو شادی کیوں کرنا چاہتا ہے ـــــ عشق وشق کا ذکر ہرگز زبان پر مت لائیو ـــــ"

"جی اس لئے کہ بچے بڑھاپے کا سہارا بنتے ہیں ـــــ"

"اور بچے بڑھاپا جلد از جلد لانے میں پوری مدد کرتے ہیں ـــــ" بزرگ نے لُقمہ دیا۔

"آپ مرجانا سے بھی تو پوچھیے ـــــ"

لڑکی سے پوچھنے کا میں قائل نہیں، یہ محبت وغیرہ کی تھیوری بہت پُرانی ہوچکی ہے، ان دنوں ہندوستان میں لڑکیوں کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ صرف اُسی سے محبت کرتی ہیں جس سے شادی ہونے کا امکان ہو ـــــ اور مرجانا تو بڑے ناز ونعم میں پلی ہے ـــــ"

"جہاں تک میں جانتا ہوں سب والدین حسبِ توفیق لڑکیوں کو ناز ونعم میں پالتے ہیں، نہ صرف پالتے ہیں بلکہ پوستے بھی ہیں۔"

"تمھاری آمدنی کیا ہے ـــــ؟"

"جی، میرے ابا شہر کے سب سے مشہور اور مالدار کنٹریکٹر ہیں۔"

"یعنی ٹھیکیدار ہیں ـــــ"

"جی ہاں ـــــ"

"مگر تم کیا کماتے ہو ـــــ؟"

"بھلا میں ابھی کیا کما سکتا ہوں، ابھی تو میں جوان ہوں اور پھر

سب نوجوان شروع میں ایسے ہی ہوتے ہیں، عُمر کے ساتھ ساتھ دولت اور عزت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے ـــــ"

"لیکن صاحبزادے بہت سے نوجوان ایسے بھی ہوتے ہیں جو جیسے شروع میں ہوتے ہیں ساری عُمر ویسے ہی رہتے ہیں ـــــ"

"قبلہ آپ بھولتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس قدر دولت ہے کہ ہم کام کرنا عار سمجھتے ہیں، یہ دیکھیئے میرے والد صاحب کے پاس اتنی جائداد ہے ـــــ" اُس نے جیب سے فہرست نکال کر ایک ایک چیز گنوادی۔

"تم نے اپنے والد کا کیا نام بتایا تھا ـــــ؟"

علی بابا نے دوبارہ نام بتایا۔ بزرگ اندر تشریف لے گئے ایک اور بزرگ خوش صفات خجستہ ذات کو لیکر آئے۔

"تم سچ بول رہے ہو نا؟"

"جناب میں خدا کو حاظر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں بالکل سچ بول رہا ہوں ـــــ"

"ذرا پھر سے پڑھنا وہ فہرست ـــــ"

علی بابا پڑھتا جاتا تھا۔ وہ نوٹ کرتے جاتے تھے۔ دونوں نے آپس میں کھُسر پھُسر کی اور بولے:

"برخوردار تمھارے ابا بہت تھوڑا انکم ٹیکس دیتے ہیں اُنھوں نے اپنی آمدنی نصف بھی نہیں لکھوائی، اب پورا ٹیکس وصول کیا جائیگا

باقی رہے تم سو پہلے اپنے آپکو کسی قابل بنالو پھر درخواست کرنا۔"
بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بزرگ انکم ٹیکس کے محکمے میں تھے۔
اگلے روز جب ظلمتِ شب رخصت ہوئی اور آفتاب شعاعوں کا تاج پہنے تختِ فلک پر جلوہ افروز ہوا تو قاسم نے علی بابا کو آپکڑا بولا ــــ "تم اُس زُہرہ جبیں کے ابّا سے ملنے گئے تھے؟"
علی بابا نے انکار کیا۔ قاسم نے اصرار کیا۔ بحث نے طول پکڑا آخر علی بابا کو جھوٹی قسمیں کھانی پڑیں تب کہیں قاسم رخصت ہوا۔ علی بابا کو یقین ہوگیا کہ کوئی بدبخت مُخبر بے ایمان ہے جو ایک ایک کی دس دس لگاتا ہے۔ بڑی دیر تک سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ گھر میں قلندر حبشی ہی ایسا مردِ نامعقول ہے جس سے یہ توقع ہوسکتی ہے۔ سوچا کہ اگر والدِ بزرگوار کو خوش کرلوں تو نہ صرف شفقتِ پدرانہ سے مستفید ہوں بلکہ مُنہ مانگا انعام پاؤں اور اس بے ایمان قلندر حبشی کو مانگ کر اس کی ساری مستی و قلندری کافور کردوں۔
والد کو خوش کرنے کا خیال پہلی مرتبہ اُسکے دل میں آیا تھا ــــ اُس نے اللہ کا نام لیا اور والد کے لئے حُقّے بھرنے شروع کردیئے ہر آدھ گھنٹے بعد وہ حُقّہ تازہ کرتا، چلم بھرتا، اور سامنے جا رکھتا۔ بعض اوقات تو وہ زبردستی حُقّہ پلاتا۔ چند ہی دنوں میں اُس نے حُقّے پلا پلا کر اپنے والد کو اسقدر تنگ کیا کہ وہ اُس سے خوش ہوگئے۔ اور قلندر حبشی اُسے مل گیا۔ قلندر حبشی بالکل ویسا تھا جیسا کہ ایک حبشی کو ہونا چاہیئے

تھا ــــ یعنی بالکل سیاہ فام۔ اگر اُسکے کپڑوں پر سیاہی لگ جاتی تو لوگ یہی سمجھتے کہ پسینہ آگیا ہے۔ بھیڑ میں گذرتے وقت وہ زور زور سے کہتا ــــ ہٹ جاؤ ورنہ کپڑے سیاہ ہوجائیں گے اور لوگ دُور دُور ہٹ جاتے ــــ مطبخ کام کرتے وقت سارا دن باتیں کرتا رہتا۔ دسترخوان پہ کھانا معمولی ہوتا تو اُس سے باز پُرس کی جاتی کہ شام کو بھی وہی سالن ہوتا ہے جو دوپہر کو ہوتا ہے۔ وہ کہتا ــــ "حضور ایک جیسا تو نہیں ہوتا، ایک وقت شلجم گوشت ہوتا ہے تو دوسرے وقت گوشت شلجم"۔ ایک مرتبہ نہایت بوسیدہ و فرسودہ مچھلیاں لایا جنکی خوشبو سے مجبور ہوکر کسی نے پوچھا: ــــ "کیا یہ مچھلیاں تازہ ہیں؟"

بس پہ وہ مردِ سیاہ بولا ــــ "تازہ ہیں؟ (مچھلیوں سے) کمبختو ہلو مت، چُپ چاپ پڑی رہو"۔

اُس نے علی بابا کو بتایا کہ اُسکے دو بھائی ہیں، ایک تو ادیب ہے اور دوسرا بھی یونہی بیکار ہے۔ اُسے لمبی سیریں کرنے کا بہت شوق تھا شام کو وہ سیر کرنے نکلتا، جیب میں روٹیاں ڈالتا اور ہاتھ میں سالن کی کٹوری لیکر چل پڑتا۔ کھانا بھی کھایا جارہا ہے اور سیر بھی ہورہی ہے۔ ایک مرتبہ قوالی ہورہی تھی، رات کے دو بج چکے تھے سب جمائیاں لے رہے تھے لیکن ایک قوال تھا کہ خاموش ہونے میں نہ آتا تھا۔ قلندر جسٹی نے یکایک نعرہ لگایا اور مٹکنے لگا، سب سمجھتے، حال کر رہا ہے دفعتاً یا حق کا نعرہ لگا اُس قوال کے سینے پر ایسا دوہتڑ دیا کہ وہ

قلابازی کھا گیا ـــــ ایک روز تخلیہ پاکر وہ علی بابا سے یوں گویا ہوا
"اے میرے آقا۔ میں ایک شخص پر دعوے کرنا چاہتا ہوں،
اُس نے میری ہتک کی ہے اور مجھے گینڈا کہا ہے ـــــ"
"یہ کب کا ذکر ہے ـــــ؟" علی بابا نے پوچھا۔
"پانچ سال کا ذکر ہے ـــــ"
"تو اب تمھیں کیونکر خیال آیا ـــــ؟"
"آج میں نے چڑیا گھر میں گینڈا دیکھا ہے ـــــ"
علی بابا اپنے بختِ نارسا کو کوسنے لگا کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا
مصیبت مول لے لی۔
رات کو جانور باتیں کرنے لگے۔ علی بابا فوراً کھڑکی سے سر نکال
کر سُننے لگا۔
گدھا کہہ رہا تھا ـــــ "اُونٹ صاحب ہم تو اسی انتظار میں ہیں
دیکھئے آپ کس کروٹ بیٹھتے ہیں"۔
لنگور بولا ـــــ "ایک مرتبہ ایک خُدا رسیدہ بزرگ مجھ سے
خوش ہوکر دُعا کے زور سے انسان بنانے لگے تھے۔ میں نے ہاتھ
جوڑے اور معذرت چاہی کہ ان دنوں انسان ہونے سے تو میں لنگور
ہی بہتر ہوں ـــــ آپ پہلے آدمیوں کو تو انسان بنائیے ـــــ"
بیل لمبا سانس کھینچ کر بولا ـــــ "آج میں بہت تھک گیا ہوں، یہ
کمبخت سٹیشن شہر سے اتنی دُور کیوں ہے ـــــ"

"اس لئے کہ ریل والے چاہتے تھے کہ سٹیشن ریلوے لائن کے قریب رہے ——"

"بھائی صاحب کوئی آپ بیتی سُنائیے ——" اونٹ نے کہا۔

پچھلے ہفتے میرا مالک مجھ پر سوار ہو کر شکار کھیلنے لگا ——"

گھوڑا بولا ——" اسکے ساتھ اُسکا دوست تھا جو ایک اور گھوڑے پر سوار تھا۔ ایک جگہ دیکھا کہ پولیس کانسٹیبل ہماری طرف آ رہا ہے —— شکار کا لائسنس پوچھنے۔ میرے مالک نے ایڑ لگائی اور میں سرپٹ بھاگا۔ کانسٹیبل بھی گھوڑے پر تھا اُس نے تعاقب کیا۔ مشکلوں سے بڑی دیر کے بعد اُس نے میرے مالک کو آلیا۔ بولا —— اپنا لائسنس دکھائیے۔ اُس نے دکھایا۔ وہ بندۂ خُدا بیحد متعجب ہوا اور بولا —— اے مردِ دلیر اگر لائسنس جیب میں تھا تو پھر بھاگنے کی کیا ضرورت تھی ——؟"

تس پہ میرے آقا نے جواب دیا ——" میرے پاس تو تھا لیکن میرے دوست کے پاس نہیں تھا ——"

ابھی گھوڑے نے بات پوری نہ کی تھی کہ گدھا بولا ——" یہ قصہ میں نے پہلے کئی مرتبہ سُنا ہے —— لیجئے میں آپ کو اپنا خواب سُناتا ہوں۔ رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں کہ ایک نہایت مُلائم بستر بچھا ہوا ہے۔ میں نے شب خوابی کا لباس پہنا، دانت بُرش کئے، ریڈیو سند کیا اور سو گیا۔ آنکھ

لگتے ہی مجھے خواب دکھائی دیا کہ پڑوس میں وہی علی بابا اپنے محبوب کی فرقت میں آہ و بُکا کر رہا ہے ——"

"میں ایک بھینس کو جانتا ہوں جس کا نام فرقت ہے ——" لنگور نے پھر بے تکی بات کی۔

"آئے ہائے ——" اُونٹ نے آہِ سرد بھر کر کہا —" باسیآ ترانے پسندم —— عشق است و ہزار بدگمانی، کاش کہ میں اُس عاشقِ زار و نزار و دلفگار کی کچھ مدد کر سکتا —— اگر وہ کہیں سُن رہا ہو تو فوراً ایک اعلےٰ درجہ کی سیاسی تقریر تیار کرے، ایسی تقریر جو کسی پارٹی کی طرف سے دی جا سکتی ہو۔ ویسے اکثر سیاسی تقریریں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ محض چند الفاظ کے ہیر پھیر سے وہ کہیں بھی دی جا سکتی ہیں ——"

یہ سُنکر علی بابا کا دل باغیچہ باغیچہ ہو گیا۔ اسی خوشی میں اُس نے حمام کیا، دعوتِ پُرتکلف اُڑائی، فواکہاتِ لذیذ نوش کئے۔ ایک چھوٹا پیگ چڑھایا اور قلندر حبشی کو لیکر تمبا کو نوشی کرتا ہُوا سیکنڈ شو میں چلا گیا۔

سینما ہال میں بچّے خوب رو رہے تھے، حبشی بولا۔ حضور یہ اچھی پکچر کی پہلی نشانی ہے، جتنی اچھی پکچر ہوگی اُتنا ہی زیادہ بچے رونیٹے سامنے کی قطار میں ایک صاحب بڑا سا ہیٹ پہنے بیٹھے تھے حبشی نے کئی مرتبہ التجا کی لیکن اُنھوں نے ہیٹ نہ اُتارا، آخر اُس نے

پوچھا کہ یہ ہیٹ کہاں سے لیا تھا اور کتنے کا تھا۔
ذرا سی دیر میں قیمت طے کر کے حبشی نے ہیٹ خرید لیا اور بکچر کا حظ اُٹھایا۔ علی بابا بہت مسرور تھا، واپسی پر وہ اپنے ایک دوست کو ساتھ لایا جو ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر تھا، سوچا کہ کچھ پینے پلانے کا شغل بھی ہوگا اور تقریر بھی مرتب ہو جائے گی۔
جب حبشی شراب کی بوتلیں ٹھنڈی کرنے جا رہا تھا تو ایڈیٹر بولا ——— "تمھارا ملازم پہلے سے سمجھ دار ہو گیا ہے ———"
"ایں ———؟" حبشی نے پیچھے مُڑ کر کہا اور بوتلیں ہاتھ سے چھوڑ دیں۔ علی بابا نے اپنا اور ایڈیٹر کا سر پیٹ لیا۔ مجبوراً انھیں ٹھیکہ شراب دیسی جانا پڑا۔
رات گئے آنا نقاب پوشوں کا اور باندھنا پٹی آنکھوں پر علی بابا کی۔ لینا وعدہ کہ کسی سے ذکر نہیں کریگا، اور لے جا رہے ہیں وہ اُسے بیچ ایک پبلک جلسہ کے جہاں ہوں گی تقریریں۔
علی بابا ساتھ ہو لیا، باہر سڑک پر پہنچکر ایک نقاب پوش بولا ——— "کھُل ٹم ٹم ———" دھڑام سے دروازہ کھُلنے کی آواز آئی۔ وہ سب ایک موٹر میں بیٹھ گئے۔
"چل ٹم ٹم ———" موٹر چل پڑی۔ مگر اس طرح جیسے زلزلہ آگیا۔ کبھی علی بابا کے پاؤں چھت سے ٹکراتے تو کبھی سر فرش سے لگتا۔ کار کا نام ٹم ٹم تھا۔ نقاب پوش راستے بھر کار کے متعلق

باتیں کرتے رہے کہ یہ پچیس میل فی گیلن کرتی ہے، اس میں صرف ایک تبدیلی کی ضرورت ہے، نئے ٹڈگارڈ کی۔ پُرزوں کے ڈبے میں صرف ایک سکریو ڈرائیور چاہیئے ——— تس پہ ایک نقاب پوش جو کار کا مالک معلوم ہوتا تھا بولا ——— "میں نے ایک ڈرائیور رکھا ہُوا ہے اور ایک کلینر ——— یہ تیسرا سکریو ڈرائیور میں ہرگز نہیں رکھ سکتا"

علی بابا دل ہی دل میں موٹر کو کوس رہا تھا۔ اُس کے خیال میں موٹر پچیس میل فی گیلن کی بجائے پچیس گیلن فی میل کرتی تھی اور اُس میں صرف دو چیزوں کو تبدیل کرنے کی سخت ضرورت تھی ——— ایک انجن اور ایک باڈی۔

آواز آئی ——— "رُک ٹم ٹم ———" موٹر رُک گئی۔ علی بابا کی پٹی کھول دی گئی۔ علی بابا نے جو موٹر کا حال دیکھا تو اُسے بڑا ترس آیا، رنگ وروغن اُتر چکا تھا، سوچا کہ اگر اس پر ہر ہفتے سفیدی کروادیا کریں تو بہتر ہو ——— سامنے عظیم الشان جلسہ ہو رہا تھا علی بابا نے جیب سے وہی کاغذ نکالا اور ایسی عظیم الشان اور دھواں دھار تقریر کی کہ مجمع عش عش کر اُٹھا، حالانکہ نہ اُسے موضوع کا علم تھا نہ یہ پتہ تھا کہ وہ کس پارٹی کی طرف سے بول رہا ہے۔ اُسکی تقریر میں زندہ باد، مُردہ باد اور مُراد آباد بار بار آتے تھے۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ فلاں چیز خطرے میں ہے۔

تقریر کے اختتام پر لوگوں نے تالیاں بجائیں اور کہا "ہُوں موٹر

صدر صاحب جو ایک اچھے خاصے قبر رسیدہ بزرگ تھے بولے ــــ "ہم تجھ سے بہت خوش ہوئے، جب تیرا جی چاہے اپنے پڑوس میں فلاں نمبر مکان کے گیراج میں چلا جائیو وہاں تجھے وہی موٹر کھڑی ملے گی، وہی الفاظ دوہرائیو جو تُو نے آتے وقت سُنے ہیں اکار تجھے سیدھی یہاں لے آئے گی، اگر جلسہ ہوا تو تقریر کیجو، ورنہ خالی پنڈال میں تقریر کی ری ہرسل کریجو۔ بول تو کیا مانگتا ہے ــــ؟"

علی بابا شرما کر بولا "میرے والد ٹھیکیدار ہیں اسلئے خُدا کا دیا سب کچھ ہے"

"اچھا ہم تیری تین خواہشیں پوری کرینگے ــــ اپنی پہلی خواہش بتا۔"

"جی پہلی خواہش یہ ہے کہ مجھے محبت میں کامیابی نصیب ہو۔ اور کامرانی میرے قدم چُومے ــــ"

"منظور ہے ــــ اور بقیہ دو خواہشیں ــــ؟"

"وہ سوچ کر بتاؤں گا ــــ"

سب آپس میں بغلگیر ہو کر رخصت ہوئے۔ واپسی میں نقاب پوش پھر علی بابا کی آنکھوں پر پٹّی باندھنے لگے۔ وہ چمک کر بولا ــــ "اب تو میں یہاں اکثر آیا کروں گا اب پٹّی کی کیا ضرورت ہے بلکہ آپ بھی اپنے نقاب اُتار دیں۔"

آنا اگلے روز نقاب پوشوں کا بغیر نقاب کے اور لکھوانا عرضی علی بابا سے واسطے پروفیسری کے۔ اور کروانا دست خط۔ چند دنوں کے بعد آنا احکامات کا اور مقرر کیا جانا علی بابا کا پروفیسر میتھ کالج لڑکیوں

کے شکر بجالانا علی بابا کا۔

خُدا کا کرنا کیا ہُوا کہ جو کلاس علی بابا کو ملی اُس میں چالیس لڑکیاں تھیں۔ اور سب شرارتی اور شوخ۔ جُونہی وہ پہلی مرتبہ جھجکتا شرماتا کلاس میں داخل ہُوا اُسکی نظر مرجانا پر پڑی۔ وہ گلبن ریاض رعنائی معشوقہ سیمیں برنو نہالان چمن کو نہال اور جلوؤں سے دلوں کو پامال کر رہی تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر وہ اسدرجہ نحیف وضعیف ہوگیا کہ آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ چکّر پر چکّر آنے لگا۔ افتاں وخیزاں، حیران و پریشان رہ کر ہوش میں آیا تو از بس خراب وخستہ بیمار و افسُردہ اپنے تئیں پایا۔ لڑکیاں تیار بیٹھی تھیں۔ علی بابا نے آیتہ الکرسی پڑھی۔ خدا کو یاد کیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

ایک لڑکی نے سوال کیا ــــــ "پروفیسر صاحب بُلاؤ اور اُود بُلاؤ میں کیا فرق ہے ــــ؟"

"وہی جو بلّے اور باگڑ بلّے میں ہے ــــ"

"پروفیسر صاحب عورتیں سال بھر کیا کرتی رہتی ہیں ــــ؟"

ایک طرف سے آواز آئی۔

"ہیٹنگ کرتی رہتی ہیں ــــ"

"اور کالر کا ناپ لیتے وقت درزی کیا کرتا ہے ــــ؟"

"گردن ناپتا ہے ــــ"

"جناب [illegible] کا بہترین طریقہ کونسا ہے ــــ؟"

"یہی کہ اس سے پہلے کی ٹرین نکل جائے ——"

علی بابا نے لیکچر کے بعد مرجانا سے جو آخر میں بیٹھی تھی سوال پوچھا۔ وہ بولی —— "میں اتنی دُور بیٹھی ہوں کہ جو کچھ ہوتا رہا ہے میرے لئے کسی افواہ سے کم نہ تھا"

"تو یہاں آجاؤ —— آئندہ سامنے بیٹھا کرو، جو کچھ ہُوا کریگا تمھیں مُعتبر ذرائع سے معلوم ہوگا —— جلدی کرو میری پاس صرف بیس منٹ ہیں ——"

مرجانا سامنے آبیٹھی —— علی بابا بولا —— میرے پاس صرف تیس منٹ ہیں ——" مرجانا اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ گھڑی دیکھ کر بولا:

"میرے پاس صرف پون گھنٹہ ہے ——"

اگلے روز قاسم طیش میں بھرا ہوا آیا اور آگ بگولا ہونے لگا کہ یہ پروفیسری بھی اکیلے ہی اکیلے۔ خاص طور پر جب مرجانا کے روز درشن ہونگے۔ علی بابا نے لاکھ کوشش کی کہ اُس کو کسی طرح ٹالے، کسی بہانے نکالے، مگر وہ خرانٹ گرگِ باراں دیدہ تاڑ گیا اور بولا —— "آپ مجھے چکمے سے نکالا چاہتے ہیں، خواہ مخواہ ٹالا چاہتے ہیں۔ یہ خیال رکھنا کہ مبادا کسی آفت میں مبتلا ہو جاؤ اور اس ضد کی سزا پاؤ ——"

اسی قسم کی جلی بھُنی گفتگو کر کے وہ بغیر بغلگیر ہوئے رخصت ہوا

اور علی بابا نے تہیہ کرلیا کہ اُس نابکار حبشی کو ضرور نکال دوں گا۔ نکالنے سے پہلے بدلہ ضرور لوں گا۔

علی الصبح اُٹھ کر دیکھا تو گلیوں میں شور مچا ہوا تھا، لوگ اُنگلیاں اُٹھا رہے تھے، عورتیں اشارے کر رہی تھیں، بچے پتھر پھینک رہے تھے، اور ایک کار دیوانہ وار اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی، اس کار میں قاسم بیٹھا تھا، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ علی بابا فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ نزدیک جا کر بولا:

"یا برادر کہو ——— کہ رُک ٹم ٹم ———"

قاسم کا یہ کہنا تھا کہ کار رُک گئی۔ معلوم ہُوا کہ رات کو چوری چھپے قاسم گیراج میں داخل ہوا، کھُل ٹم ٹم کہکر کار میں جا بیٹھا اور چل ٹم ٹم کہکر آگے بھُول گیا۔ مُفت میں اپنی ہنسی اُڑوائی، رات بھر خراب ہُوا اور کار کا راز بھی افشا کر دیا۔

اسکے بعد اُس نے علی بابا کی جان عذاب میں ڈال دی، اور آکر بیٹھ جاتا اور علی بابا کے بڑھیا سگریٹ پھونکتا۔ بار بار زبان پر یہ فقرہ لاتا ——— مجھے بھی پروفیسر لگوا دو

جب علی بابا کو سگرٹوں کے بے تحاشہ خرچ کا احساس ہُوا، تو وہ بزرگِ قبر رسیدہ سے جا کر ملا اور اس امر کا ذکر کیا، اُس نے چند پتے بتائے اور کہا:

"یہ سب حضرات بارسوخ وضع و شریف اور اہلِ حلم ہیں، اُنہیں

ہر ایک ذی علم و صاحبِ مذاق ہے۔ شرافت و اہلیت میں شہرۂ آفاق ہے۔ بظاہر تو اس اتحاد و ارتباط میں کوئی عیب نہیں، گو انسان عالم الغیب ہیں۔ قاسم خود جائے اور قسمت آزمائی کرے ——"

چنانچہ قاسم روانہ ہوا۔ سب سے پہلے وہ ایک رائے بہادر کے پاس گیا اور مدّعا ظاہر کیا۔ وہ بولے :

"میں بورڈ کا ممبر نہیں ہوں لیکن میرے چچیرے بھائی کی خلیری بہن کے خسر اس کام کو بخوبی کر سکیں گے۔ آپ اُن سے ملیئے اور میرا نام لے دیجئے۔"

قاسم اُن سے ملا۔ کچھ تحفے تحائف بھی لیکر گیا۔

وہ بولے :—— "اے مردِ معقول میں سفارش ضرور کردوں گا لیکن صدر صاحب تک رسائی لازم ہے، میرے ایک عزیز دوست سردار بہادر فلاں سے اُنکے تعلقات ضرورت سے زیادہ خوشگوار ہیں اُن سے ملو ——"

قاسم وہاں گیا۔ وہ بولے :—— "میں ذکر کردوں گا لیکن فلاں خان بہادر صاحب نے صدر صاحب کے ساتھ بیس سال ملازمت کی ہے، دونوں لنگوٹ باندھ کر پھرا کرتے تھے یعنی لنگوٹیے دوست تھے، اگر فلاں صاحب کو لیکر خان بہادر صاحب سے ملو تو وہ فلاں صاحب کو لکھدیں گے اور وہ تمھیں صدر صاحب سے ملادیں گے۔"

قاسم فلاں صاحب سے ملا۔ وہ مُسکرا کر بولے —— "جناب

میں تو بیچارہ ایک حقیر انسان ہوں، میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ کسی سے اسکا ذکر نہ کیجئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن دنوں اُن سے میرے تعلقات کچھ کشیدہ سے ہیں۔ آپ صدر صاحب کے ہم زُلف خان بہادر فلاں سے کیوں نہیں ملتے۔ وہ موقعہ پاکر خانگی باتیں کرتے کرتے اس کا ذکر کر دیں گے۔"

وہ صاحب بہت دُور رہتے تھے۔ قاسم نے یک لیل و یک نہار ٹرین میں صرف کئے۔ وہاں پہنچکر اُن صاحب کا نام بھول گیا۔ کیونکہ ان دنوں ہر روز اُسے کئی کئی نام یاد کرنے پڑے تھے۔ چنانچہ اُس نے علی بابا کو تار دیا کہ خان بہادر صاحب کا پورا نام کیا ہے؟

علی بابا پہلے ہی تنگ آیا ہوا تھا ——— اُس نے تار کا جواب تار سے دیا ——— لکھا ——— "خان بہادر صاحب کا پورا نام خان بہادر بُلبُل نواز صاحب ہے اور تمھارا پورا نام قاسم خان ہے ———"

غرضیکہ قاسم کو دنیا بھر کی خوشامدیں کرنی پڑیں، ایسے ایسے عجیب و غریب انسانوں کی منتیں کرنی کہ اُس کی صحت اور دماغ پر بڑا ناخوشگوار اثر پڑا

اتنے میں کیا ہُوا کہ پہلی جنوری کو قاسم نے اخبار خریدا۔ وہ اخبار خرید کر پڑھنے کا قائل نہیں، اُس روز صرف خطابوں کی فہرست دیکھنے کی غرض سے اپنا اصول توڑا۔ جو دیکھا ہے تو علی بابا کا نام خانصاحبوں میں تھا، اُسے اس درجہ طیش آیا کہ فوراً واپس پہنچا اور علی بابا سے یوں گویا ہُوا ——— "کیوں عزیز تم کو زندگانی پسند ہے یا مرگِ ناگہانی

اور عالمِ جاودانی ـــــ"

علی بابا نے جواب دیا ـــــ" زندگی پر انسان عاشق زار ہوتا ہے، اجل کے نام سے حال زار ہوتا ہے ـــــ"

قاسم نے بھائی کو اس خود غرضی پر بہت ڈرایا دھمکایا کہ اب خطاب بھی اکیلے اکیلے لے لیا۔ پھر آہِ گرم بھر کر بولا:

مُلکِ خدا تنگ است ۔ پائے گدا لنگ است

علی بابا نے ایک نئی فہرست بنا کر دی اور قسمت آزمائی کرنے کو کہا۔ سب سے پہلا نام صدر صاحب کے چچا کی بھتیجی کے ماموں کا تھا اور دوسرا اُنکے ماموں کی بھتیجی کے چچا کا۔

چند مہینے بعد علی بابا کو اطلاع ملی کہ قاسم شفاخانے میں ہے جا کر دیکھا تو اُسے دماغی طور پر علیل پایا۔ یعنی بالفاظِ دیگر اُس کا دماغ چل گیا تھا۔ وہ ہر وقت زیرِ لب کچھ بُڑبُڑاتا رہتا تھا ـــــ بار بار اِس قسم کے فقرے سُنائی دیتے ـــــ سردار صاحب کی پوتی کے خُسر کا بھائی، بھائی کے خُسر کی پوتی کے سردار صاحب، پوتی کی ساس کے بھائی کا سالا، سالے کے بھائی کی ساس کی پوتی ـــــ چچا کے سردار بہادر کے چچا کے چچا ـــــ، کے چچا کے چچا ـــــ، کا بھتیجہ کا بھتیجہ ـــــ،

بڑے طویل علاج کے بعد قاسم رو بہ صحت ہوا لیکن اُس نے غسلِ صحت کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس دن سردی بہت تھی۔

علی بابا کو بہت ترس آیا، اُس نے قاسم کی پروفیسری کو اپنی خواہش میں شریک کیا اور مُنھ مانگی مُراد پائی۔ دراصل علی بابا بڑی اُستادی سے کام لیتا تھا۔ پہلی اور دوسری خواہش مانگ کر تیسری خواہش یہ مانگتا کہ تین خواہشیں اور منظور ہوجائیں۔ جب مزید خواہشیں پوری ہوجاتیں تو تیسری پر تین اور مانگ لیتا۔

قصہ مختصر قاسم سب ایڈیشنل آنریری پروفیسر لگ گیا ــــ لیکن اُس گرلز کالج میں نہیں کسی اور گرلز کالج میں۔ علی بابا احمق نہیں تھا۔

پہلی جنوری کو قاسم نے بادلِ ناخواستہ اخبار خریدا، خطابات کی فہرست پڑھی تو آنکھوں میں خون اُتر آیا ــــ علی بابا خان بہادر ہوگیا تھا ــــ اس مرتبہ قاسم نے اہنسا کے فلسفے سے کام لیا اور جاکر مبارکباد دی۔ پھر باتوں باتوں میں بڑی ملائمیت سے پوچھا

"اے جانِ برادر یہ خطاب آپکو کیونکر مل جاتے ہیں ــــ؟"

"پتہ نہیں کیونکر مل جاتے ہیں۔ میں خود حیران ہوں ــــ"

"پھر بھی آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہونگے ــــ"

"قسم ہے اُس پاک پروردگار کی جس نے چرند و پرند یہانتک کہ درند کو قوتِ شامہ بخشی، مجھے اس کا کوئی علم نہیں"

"پھر بھی، ذرا دماغ پر زور ڈالیئے ــــ آپ نے کچھ نہ کچھ تو ضرور کیا ہوگا ــــ"

"کوئی خاص کارنامہ تو نہیں ــــ البتہ ــــ"

غرضیکہ کئی مرتبہ اسی طرح ہُوا۔ علی بابا اُسے کام بتاتا پھر خود ہی کر لیتا ——— ایڈیٹر تخلیہ پاکر بولا ——— "اے دوستِ صادق، یارِ غار ——— یہ کیا ماجرا ہے ——— کیا اِسی طرح بدلہ لیا جاتا ہے؟"

قِس پہ علی بابا مُسکرا کر بولا ——— "سال بھر سے اسی طرح ہو رہا ہے، میں نے اِس ناہنجار کی عادتیں اس قدر خراب کر دی ہیں، اسے اس قدر کاہل اور گُستاخ بنا دیا ہے کہ اب یہ ہمیشہ کیلئے بیکار ہو گیا ہے۔ یہ عُمر بھر ملازمت نہیں کر سکتا۔ کیا یہ بدلہ نہیں ——؟"

مدتوں تک قاسم سیاسی کام کرتا رہا اور ہر پہلی جنوری کو اخبار خرید کر پڑھتا رہا لیکن غُنچۂ اُمید نہ کھلا اور اُسے کچھ نہ ملا۔ آخر کو صبر کا پیمانہ لبریز ہُوا اور وہ علی بابا سے مخاطب ہو کر یوں نغمہ ریز ہوا ———

"اے برادر میں نے بہت دنوں سے نہ شکوہ کیا ہے نہ شکایت ——— تجھے خان بہادری کے بعد ممبر آف این ڈبلیو آر کا خطاب ملا میں خاموش رہا، تجھے آرڈر آف پی، ڈبلیو، ڈی ملا، میں نے کچھ نہ کہا۔ اب سُنتا ہوں کہ تو سَر بننے والا ہے، ادھر میں ہوں کہ ابھی تک خان بہادر تک نہیں بنتا ———"

"اے برادر تجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ بزرگ قبر رسیدہ نے تیرے لئے خان صاحب کے خطاب کی سفارش کروادی ہے ———"

"خان صاحب بھی کوئی خطاب ہے۔ قاسم خان صاحب تو میں پہلے سے ہوں۔ اچھا یوں کرو کہ تم بھی اپنے خطاب لوٹا دو، میں

بھی خان صاحبی سے انکار کردوں گا۔"

"میں خطاب محض اس لئے کیوں لوٹا دُوں کہ تمھیں کوئی خطاب نہیں مل سکا، خصوصاً جب مجھے سَر بننے کی اُمید ہے۔ رہ گیا خانصاحب کا خطاب سو تم اپنے نام کو خان صاحب قاسم خان صاحب لکھنے کی جگہ یُوں لکھ لیا کرنا ——— قاسم (خان صاحب) ———"

اس پر قاسم بڑا خوش ہوا اور بغلیں بجاتا ہوا لوٹا۔

اگلے جلسے پر بزرگِ قبر رسیدہ نے علی بابا سے محبت کی کامیابی کے بارے میں پوچھا، اُس نے جواب دیا: ——— "یا پیر و مرشد ابھی تک شادی تو نہیں ہوئی۔"

"محبت کی کامیابی اور چیز ہے اور شادی اور چیز ——— اگر شادی منظور ہے تو صاف صاف خواہش کر۔"

رات کو علی بابا کا بڑا جی چاہا کہ کسی طرح پڑوس کے جانور اُسکے متعلق باتیں کریں، لیکن اُن میں چند خود پسند اور بُوژوا قسم کے جانوروں کا اضافہ ہو گیا تھا جو سوائے اپنے کسی اور کی بات ہی نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بیل نے سرسری طور پر ذکر کیا کہ کلب میں ٹینس ٹورنمنٹ ہونے والا ہے جس میں مرجانا کھیلے گی۔

علی بابا کو بلّا تک پکڑنا نہ آتا تھا لیکن اُس نے اپنا نام دے دیا اور خواہش کی کہ کسی طرح فائینلز تک پہنچ جائے اور مرجانا اُسکی پارٹنر ہو ——— یہی ہوا۔ کبھی مخالف بیمار ہو گئے، کبھی وقت پر نہ پہنچ سکے

کبھی کسی کے پاؤں میں موچ آگئی کبھی چوٹ لگ گئی۔ غرضیکہ علی بابا اور مرجانا فائینلز میں پہنچ گئے۔ اگلے روز بہت بڑے ہجوم کے سامنے میچ تھا ہجوم میں چند ایسے معزز حضرات بھی تھے جو علی بابا کو سر بننے میں مدد دے سکتے تھے۔ مرجانا کے والدین بھی تھے۔

علی بابا اور چالیس لڑکیوں نے ایک پروگرام بنایا۔ میچ سے پہلے چاء کا انتظام کیا گیا۔ چالیس لڑکیاں خوب بن سنور کر زرق برق پوشاک پہنکر آئیں، ہر میز پر ایک لڑکی بٹھائی گئی تاکہ آس پاس کے بیٹھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ رکھیں ——— علی بابا نغمہ سرائی کرنے لگا اور ایک لڑکی نے رقص کرنا شروع کر دیا ——— علی بابا نٹ بھاگ گا رہا تھا، شروع کے بول تھے۔ جھن جھن جھن جھن پائل موری باجے۔

سب بُت بنکر رہ گئے۔ لڑکیوں نے بڑی چالاکی سے چاء بناتے وقت ہر ایک پیالی میں بھنگ ڈال دی ——— ایک وقفے کے بعد علی بابا نے گلا توڑ مروڑ کر ایک مدراسی نغمہ شروع کیا ——— ایک لڑکی بھارت ناٹیم ناچنے لگی اور پیالیوں میں مزید بھنگ ڈالی گئی ——— کچھ دیر میں مجمع پر نشے کے اثرات ظاہر ہونے لگے، کوئی کچھ ہانکنے لگا، کوئی کچھ ——— اس قسم کی آوازیں آنے لگیں۔

"دھلے پر آپ نے مہلا ڈالا ہے ———"

"آپکا دل کیوں دہلا جا رہا ہے ———"

"ہماری شادی ہونیوالی ہے ———" ——— "تم سب کی ———؟"

چھٹی سے واپس آتے ٹرین میں ایک عجیب انسان سے واسطہ پڑا، میں نے اُسے صبح دیکھا، وہ آہیں بھر رہا تھا، اُسکی آنکھوں سے آنسو رواں تھے ـــــ دوپہر کو بھی وہ بسُور رہا تھا، رات کو تو زار و قطار رو رہا تھا، مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے وجہ پوچھی ـــــ وہ بولا ـــــ میں روؤں نہ تو اور کیا کروں، مجھ جیسا بدنصیب تو زمانے میں نہ ہوگا ـــــ میں کل شام سے غلط ٹرین میں ہوں ـــــ"

"اب کلب کے سکریٹری اپنا ایڈریس پڑھکر سُنائینگے ـــــ"

"خواتین و حضرات میرا ایڈریس یہ ہے ـــــ نمبر پانچ زیبرا روڈ"

جب لوگ اس سے بھی زیادہ اُلٹی سیدھی ہانکنے لگے تو علی بابا نے اشارہ کیا اور میچ شروع ہوا، مخالف جو بھنگ کافی مقدار میں پی چُکے تھے کچھ دیر کھیلتے پھر گھاس پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے، کبھی سائیکل ٹیکر اِدھر اُدھر سیر کو آتے۔ دیر تک یونہی ہوتا رہا اور علی بابا اور مرجانا جیت گئے۔ دونوں کی اکٹھی بہت سی تصویریں کھینچی گئیں۔

تخلیہ پاکر علی بابا نے اُس پری پیکر کی جانب مخاطب ہوکر دست بستہ عرض کیا ـــــ "اے شاہِ خوبانِ جہاں، میں علی بابا ہوں، اور تیرے حُسن و جمال کا اسقدر دلدادہ ہوں کہ خودکشی پر آمادہ ہوں۔ تیرے لئے اسقدر بیزار ہوا کہ ہر نعمت سے دست بردار ہُوا، خراب و خوار ہُوا ـــــ اب اگر تم میرے حالِ زار پر رحم کھاؤ تو زیادہ نہ ترساؤ اور مجھے درمِ ناخریدہ غلام بناؤ ـــــ"

مرجانا نے اُسکے کان میں کچھ کہا اور اُس نے مُسکرا کر سر ہلا دیا۔
اس کے بعد اخباروں اور رسالوں میں اُن دونوں کی اِکٹھے کھینچی ہوئی تصویریں چھپیں، نیچے لکھا تھا اس جوڑے کی منگنی ہو چکی ہے، شادی عنقریب ہونے والی ہے۔ خوب پبلسٹی ہوئی اور چال کامیاب ہوئی۔
——— مرجانا کے والد نے علی بابا کو بُلایا پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہہ سکتے۔ علی بابا بولا:

"میں یار شاطر ہوں یہ نہیں چاہتا کہ بار خاطر ہوں۔ بہتری اسی میں ہے کہ ضد سے باز آئیے اور مان جائیے"

وہ بولے ——— "اچھا میں سوچوں گا ———"

اسی روز علی بابا نے قلندر حبشی کو نکال دیا۔ یہ خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی، دوست احباب سب آ آ کر علی بابا سے باز پُرس کرنے لگے کہ یہ حرکت کیوں کی۔

"کیا وہ رفیقِ دیرینہ نافرمانبردار تھا، کیا وہ دروغ گو تھا ؟"

"نہیں ———"

"کیا وہ گستاخ تھا، کیا وہ چور تھا ———؟"

"نہیں ———"

"تو پھر اُسے کیوں نکالدیا ———؟"

علی بابا نے بُوٹ اُتار کر دوستوں کو دکھایا ——— "یہ بُوٹ بھدا ہے یا اسکی ساخت خراب ہے ———؟"

"نہیں تو ــــــ"

"کیا یہ کہیں سے پھٹا ہوا ہے ــــــ؟"

"نہیں!"

"کیا اس میں کوئی اور نقص نظر آتا ہے ــــــ؟"

"نہیں"

"لیکن یہ صرف مجھے ہی علم ہے کہ یہ کہاں چُبھتا ہے ــــــ"

قاسم نے بڑی غلطی کی یہ کہ چند ترقی پسند شاعروں سے ملکر مرجانا پر آزاد نظمیں چھپوانی شروع کردیں، مرجانا کو خط بھی لکھے۔ جو اُس نے ہندوستان کی دیرینہ رسم کے مطابق اپنے والد کو پیش کردیئے۔ وہ بڑے خفا ہوئے اور قاسم کو فون کیا، گویا ہوئے:

"اے بُزدِل نوجوان یہ کیا بیہودگی ہے کہ چھُپ چھُپ کر رُسوا کرتا ہے اگر ہمت ہے تو سامنے آکر بات کر، اور مجھے آزاد نظموں سے سخت نفرت ہے ــــــ"

علی بابا نے بھی کہا ــــــ "اے برادر اب تو ہم دونوں کی منگنی ہوچکی ہے، اب یہ کیا کرتا ہے ــــــ"

قاسم بولا ــــــ "اے برادر، زیادہ سے زیادہ وہ تمھاری منگیتر ہی ہے نا، اس سے میرا جوش و خروش کم نہیں ہوسکتا، برابر کا مقابلہ ہے، فیصلہ وقت کے ہاتھ ہے ــــــ"

قاسم نے اپنی تیسری خواہش یوں ظاہر کی کہ مرجانا اُس کے

خطوط کا جواب دے ۔ چنانچہ اُسے مرجانا کا خط ملا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ میری منگنی ہوچکی ہے ، میں نے آپکا خط اپنی چھوٹی بہن کو دیدیا ہے ، محبت کے سلسلے میں اب اُس کی باری ہے ، آپ اُسے لکھیئے ـــــــ قاسم نے اُسے تصویر کے لئے لکھا ، اُس نے ایک تصویر بھیجی جس میں اُس نے سیاہ رنگ کا نہایت خوشنما بُرقعہ پہن رکھا تھا ، چہرہ بُرقعے میں چھُپا ہوا تھا ، ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میں دسویں جماعت کا امتحان دے رہی ہوں ، اس لیئے ابھی پردہ کرتی ہوں ، کوئی دنوں کی بات ہے ، کالج پہنچتے ہی پردہ وردہ ایک طرف ہوگا ۔

قاسم بڑا مایوس ہوا ۔ بزرگ قبر رسیدہ سے فریادی ہُوا اُنھوں نے ترس کھاتے ہوئے رعایتاً ایک اور خواہش کی منظوری دیدی ۔ علی بابا قاسم سے ملا اور بولا ـــــــ "اے برادر تو نے دوسری بہن کو دیکھا تک نہیں اور عاشق یُونہی ہوگیا ـــــــ"

"اے برادر ـــــــ ، اب مجھے عشق نہیں ضد ہے ـــــــ" قاسم نے جواب دیا ۔

"تو پھر کسی طرح امپیریل سروس میں آجا ، کل میں اُسکے ابا سے تیرے لئے ملا تھا ۔ وہ بولے شادی کے لئے صرف یہی ایک شرط ہے" قاسم کی آخری خواہش باقی تھی ، اُس نے امپیریل سروس مانگی ، بزرگ نے وعدہ فرمایا ۔

چند دنوں کے بعد اخباروں میں نکلا کہ ساری امپیریل سروسز ختم کر دی گئی ہیں۔ قاسم کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔

جوں ہی شادی کی تاریخ نزدیک آئی علی بابا اور مرجانا کے والد کے درمیان حسبِ معمول اختلافات شروع ہو گئے۔ وہ مہر زیادہ لکھوانا چاہتے تھے۔ علی بابا کہنے لگا:

"آپ جتنا زیادہ مہر لکھوائیں گے اُتنا ہی آپ کو شادی کے نیک انجام پر شُبہ ہوگا، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یقین ہو گیا ہے کہ یہ شادی کامیاب ہرگز نہیں ہوگی، اگر آپ کو مجھ پر بھروسہ ہے تو کچھ مت لکھوائیے ——" لیکن وہ باز نہ آئے اُدھر علی بابا بھی باز نہ آیا۔

علی بابا نے دعوتی رقعوں کا مطالعہ کیا اور با قرأت لاحول پڑھی —— عبارت ایسی عجیب وغریب تھی کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، کہاں ہو رہا ہے اور کب ہو رہا ہے۔ —— جسے رُقعہ بھیجا جا رہا ہے وہ کیا کرے —— شروع یُوں ہوتا تھا:

"ہوالشافی،

الٰہی غنچۂ اُمید بکشا،

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست ـ آمد آخر زپس پردۂ تقدیر پدید —— اس کے آگے دُور تک مسجع اور مقطع عربی اور فارسی

چلی گئی تھی ۔

ختم یوں ہوتا تھا ——— سردی کے موسم کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے از راہِ کرم اپنا بستر ہمراہ لائیں ۔ اور اگر ہو سکے تو اپنا ملازم اور راشن کارڈ بھی ۔

علی بابا نے وہ سب جلا دیئے ——— آپس میں کافی لڑائی جھگڑا ہوا ۔ ستیہ گرہ ہوئی ، بھوک ہڑتال ہوئی ، مطالبات مانگے گئے ، آخر طے یہ ہوا کہ سول اینڈ ملٹری میرج کی جائے ۔

قاسم ہر روز بلا ناغہ خود اپنے سینے پر مُونگ دلتا ۔ وہ بس خان صاحب بننے کی اُمید پر زندہ تھا ۔ اُس نے مِل مِلا کر پتہ چلا لیا تھا کہ اُس کا خطاب منظور ہو چکا ہے ۔ ایک ایک دن گن کر اکتیس دسمبر آیا ، ——— پھر پہلی جنوری ——— اُس نے علی الصبح اخبار خریدا ۔ جو پڑھتا ہے تو سر پر رنج والم کا پہاڑ بلکہ سلسلۂ کوہ ٹوٹ پڑا ——— حکومت نے اعلان کیا تھا کہ :

"خان صاحب اور خان بہادر وغیرہ کے خطابات ختم کر دیئے گئے ہیں ۔"

اسکے بعد کیا ہوا ؟ جانوروں نے علی بابا پر کیا تبصرے کیئے کیا قاسم مرجانا کی تیسری بہن سے شادی کرنے میں کامیاب ہو سکا ؟ کیا علی بابا اور مسز علی بابا تسرا اور لیڈی علی بابا بن سکے ؟ اس کا

ذکر کبھی آئندہ سرمۂ چشمِ نظارگیان باتمکین ہوگا، ہر سخن سنج ذی فہم اس کا شائق ہوگا اور یہ کلام بلاغت نظام پسندیدہ خلائق ہوگا ۔ عجب دلکش و دلآویز تحریر و تقریر ہوگی جو اپنی خوبیوں میں اپنی آپ ہی نظیر ہوگی کہ اب تک چشمِ فلک نے بہ ایں پیرانہ سالی عینکِ مہر و ماہ لگا کر بھی نہ دیکھی ہوگی ۔ زیادہ مدحت طرازی فضول ہے، خود ستائی پر محمول ہے

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلآرام را

پہلے زینہ پر قدم رکھتے ہی اُس کی مُڈبھیڑ مسز پیٹرک سے ہو
جو گہری نیلی فراک میں کسی تنی ہوئی بھورے بھورے بالوں کو تاج کی
طرح سجائے تیزی سے زینے سے اُتر رہی تھی ——— وہ
اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا ———

"اوہ مسٹر کہاں ———" مسز پیٹرک نے اُسکی بدتمیزی
اور بے نیازی نظرانداز کرتے ہوئے کہا —— اُس کے سفید سفید
دانت مارے خوش اخلاقی کے چمچما اُٹھے ———

"اپنا وائف کو اسٹیشن چھوڑ کر آتا ———؟" وہ ریلنگ پر
جُھک کر بولی۔ لیکن خان یونہی دانت نکالے رہا —— اُسے اس
وقت یہ بھی بُرا نہ لگا کہ مسز پیٹرک اس سے بجائے انگریزی میں بات
کرنے کے گوراشاہی اُردو میں بولتی ہے۔ آخر وہ اُس کی تہذیب
اور تعلیم کو کیوں پس پشت ڈال دیتی ہے۔

"ایو ننگ میں چائے ہمارے یہاں لینا مانگتا اے ——
اچھا ———!" وہ اسے مدعو کرکے اس تیزی سے سڑک پر
نکل گئی جیسے اُسے سنگھاری چیزوں کی دکان پر لوٹ میں شرکت
کرنا ہو۔ کیونکہ اس وقت اُس کے ہر وقت انگاروں کی طرح
دہکنے والے ہونٹ پکی حبامنوں سے اپنا قریبی رشتہ ظاہر
کر رہے تھے ———

خان نے اپنی انگلیوں میں دبا ہوا ٹکڑا جھٹک دیا اور اپسنی

ی رنگ کی فیلٹ گدی پر جھکا کر پیشانی کی نمی رومال سے صاف کرتے ہوئے زینہ چڑھنے لگا۔ مضمحل اور اداس ——— اُسے مسز پیٹرک کی چہچہاتی ہوئی مسکراہٹ نے ذرا بھی خوش نہ کیا تھا۔ حالانکہ شادی سے پہلے دفتر کی ساری تکان وہ اس کی ایک بے جھجک مسکراہٹ کے سہارے اُتار پھینکا کرتا تھا ——— اب بھی بیوی کو میکے بھیجنے کے بعد اُس نے مسز پیٹرک ہی کا سہارا لینے کا ارادہ کیا تھا ——— مگر بیوی کو جس حالت میں اُس نے رخصت کیا اس کے بعد وہ خود کو ایک سخت وفادار اور معصوم قسم کا شوہر محسوس کرنا چاہتا تھا ———

"چھی کتنی بے شرم عورت ہے ———" خان نے تیسری منزل کی چالی میں قدم رکھنے سے پہلے ہانپتے ہوئے مسز پیٹرک کے متعلق خیال قائم کیا اور ساتھ ہی اُسے اپنی بیوی کی بیجا شرم وحیا بالکل بجا معلوم ہونے لگی۔

اپنے کمرے کا قفل کھول کر خان نے اس طرح اندر جھانکا جیسے اپنی قبر میں جھانک رہا ہو ——— پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اندر چلا گیا ——— گھر سُونا سُونا ہو رہا تھا۔ اُس نے بڑی حسرت سے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر گویا مایوس ہو کر اپنے تاڑ جیسے جسم کو تہہ کر کے آرام کرسی پر گرا دیا مگر جلد ہی اسے شاید یہ احساس ہوا کہ غم کرنے کا یہ انداز عورتوں کے لئے زیادہ جچتا ہے۔

دوبارہ اپنے سینک سلائی جسم کو آرام کرسی پر آرام کرنے کو گرادیا کیونکہ اُس نے دیکھا کہ خان ہنسنے کے ساتھ گھونسہ مارنے کو مٹھی بھی کس رہا تھا۔ اور مرزا کا دم نکلتا خان کے گھونسوں سے۔ اُنے کیا عادت تھی خان کو گھونسہ بازی کی۔ اگر اُسے کوئی ایسا بے تکلف دوست نہ ملتا جو اُس کے گھونسوں کی داد نہ دے سکے تو وہ دیواروں تک پر نوازش کرنے سے نہ چوکتا ــــ ٹول ہی تو ــــ

"بس خانِ اعظم" مرزا نے ذرا پیار سے دیدے نکال کر کہا۔ "میں نے کہا جانے کیا عادت ہے تمھاری ــــ لاحول ولا قوۃ ــــ ہُنہہ!"

اُس نے سر کو ایک جھٹکا دیا اور پھر مسمسی بلّی کی طرح آنکھیں بند کر کے کرسی کے ہتھے پر کسی گت کی دُرگت بجانے لگا۔

خان کے کرخت چہرے پر شگفتگی آگئی اور آنکھوں میں چمک بہ ــــ وہ اِترا کر بولا: "ہاں یار جانے کیا بات ہے۔ کہ جہاں کوئی سخت چیز میرے سامنے آئی وہاں میری مُٹھیاں بند ہیں۔ جی چاہتا ہے ذرا کر کے پھینک دُوں ــــ خصوصاً تیری ہڈیاں ــــ"

خان نے مرزا کی طرف گھونسہ بڑھاتے ہوئے، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا ــــ اُس کی آنکھوں کی چمک میں وحشت پیدا ہوگئی۔ گھونسہ دھڑ سے مرزا کی ران پر پڑا تو وہ اُچھل پڑا۔

"میں نے کہا ــــ جی میں نے کہا ــــ" مرزا نے اپنی ران پکڑ کر رٹ لگا دی۔ بالکل اُس گھوڑے کی طرح جس کو چلانے کے لئے چابک برسائے جائیں اور وہ ہڑبڑا کر بجائے آگے بڑھنے کے دائیں بائیں ہی چکّر کھا کر رہ جائے۔

اب خان زور زور سے ہنس رہا تھا بڑی دیر بعد مرزا غریب میں نے کہا کے چکّر سے نکل سکا۔

"سخت چیزیں دیکھ کر گھونسے مارنے کو جی چاہتا ہے اور نرم دیکھ کر؟" مرزا کی آنکھوں میں جستجو کی ایک بے چین سی جھلک تھی ــــ اے بس! خان کی ہنسی پھیکی پڑ گئی ــــ اور اُس پر بیوی کی یاد کا دورہ پڑ گیا، گدگدی چیز کا نام جو آگیا تھا

"دھت" اُس نے شرما کر مرزا کو دیکھا اور پھر اُس کی نظریں بچا کر وہ بڑی للچاہٹ سے مسہری کی طرف دیکھنے لگا۔ جو کمرے کی کافی جگہ گھیرے ہوئے تھی اور جس پر اُس کی بیوی دن کا زیادہ حصّہ بیٹھے بیٹھے یا پڑے پڑے گذار دیا کرتی تھی۔ چلنے پھرنے میں اُس سے اپنا چھوٹا موٹا سا جسم ٹھیک طرح سے نہ سنبھلتا اِس لئے وہ عموماً مسہری پر ڈھیر رہا کرتی ــــ گلابی مخمل کی گٹھری جو ذرا چھُوئے سے سُرخ پڑ جاتی۔ خان چاہے مارے چٹکیوں کے اُس کا گوشت اُڑا لے مگر وہ تھی کہ ایک چُپ پھُولے پھُولے پپوٹے آنکھوں پر گرے ہوئے اور کپکپاتے ہوئے ہونٹ ــــ

جانے وہ ہنسی ضبط کرتی یا آنسو ـــــ کچھ پتہ نہ چلتا ـــــ
خان کو اس کی اتنی خاموشی سے سخت اُکتاہٹ تھی ۔ وہ چاہتا
تھا کہ وہ بے تکلفی سے ہنسے بولے ۔ اُس کی شرارتوں پر
رُوٹھے جواب دے ـــــ کچھ تو اچھا بُرا کہے ـــــ یہ کیا کہ کشن
کی طرح پڑی ہے ۔ وہ اپنے خاندان کے گنتی کے گریجویٹوں
میں سا تھا ـــــ اور دوستوں کے حلقہ میں بیٹھ کر بیوی کو نصف
بہتر کہنے کا عادی ـــــ بیوی کی زبان سے اپنے متعلق کچھ
نہ کچھ سُننے کا مشتاق ـــــ مگر اس کی بیوی تھی کہ ہر حرکت کے
جواب میں سُرخ پڑ جانے کے علاوہ کچھ جانتی ہی نہ تھی ۔ اس
کی اس ادا سے وہ اور بھی جھنجھلا کر ضدی بچوں کی طرح اسے
نوچنے لگتا ـــــ اس صورت میں اسے یہ احساس ہی نہ رہتا ۔ کہ
وہ اس کی نصف بہتر ہے ۔ بلکہ وہ اس پھوہڑ کرایہ دار کا سا
بن جاتا جو مکان کا کرایہ ادا کر دینے کے بعد اس کی دیواریں ڈھا
دینے میں کوشاں ہو جائے ۔ مگر خیر یہ تو کئی گھنٹے پہلے کی
کیفیات تھیں ۔ اب تو اسے یقین تھا کہ اس کی بیوی ہرگز
اس کی حرکتوں کو ناپسند نہیں کرتی ۔ ورنہ کیا وجہ تھی ۔ کہ وہ چلتے
چلاتے اپنی شرم وحیا بالائے طاق رکھ کر یوں کھُلم کھُلا اظہارِ
عشق کر گئی ـــــ خان نے جی میں سوچا کہ یہ عورتیں پٹے لگاتا چلا
شریر ہوتی ہیں ـــــ اگر ٹرین میں بیٹھنے سے قبل اُس کے

پیار سے کچھ کہہ دیا ہوتا۔ تو آخر وہ اسے جانے ہی کیوں دیتا۔
"چلو اُٹھو۔ گھومنے نہیں چلوگے یار میں نے کہا کس سوچ میں ہو؟" مرزا نے اکتا کر تقاضہ شروع کیا۔
"نہیں بھئی۔ اس وقت جی نہیں چاہتا کہیں آنے جانے کو۔" خان اُٹھا، اُس کا مُنہ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے فیلٹ اور کوٹ اُتار کر مسہری پر پھینک دیا۔ اور ایک گلاس پانی پی کر لہراتا ہوا بالکونی کا دروازہ اور کھڑکی کھولنے گیا۔ اور پھر واپس آکر اسی طرح کرسی پر پڑ گیا۔
"نہ جاؤ ــــ بس نخرے کئے جاؤ ــــ ہینھ!" مرزا بدبدایا۔ اور بالکونی کے دروازہ کے پردہ کو اپنے مُنہ پر سے جھٹک دیا جو ٹھنڈی بھیگی ہوا کے متواتر جھونکوں سے اُس کے مُنہ پر سرسرا رہا تھا ــــ اسے واقعی سخت غصہ آرہا تھا کہ یا تو خان نے بیوی کو بھیجنے کے کئی روز قبل سے اُس کے کان کھانا شروع کر دیئے تھے کہ یہ کریں گے وہ کریں گے ــــ اور اس طرح اپنی زندگی کے چھڑے چھیلے دنوں کی یاد تازہ کریں گے ــــ یا اب دم نکلنے لگا۔ احمق کا ــــ

اُس کا "بُرا نہ مان یار سچ مان اس وقت باہر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ دیکھ تیری بھابھی چلی گئی ہے نا تو کچھ بُرا سا لگ رہا ہے آنکھوں میں۔" خان نے ذرا شرماتے ہوئے دردِ دل کہہ دیا۔

——مگر مرزا نخریائی دُلہنوں کی طرح رُوٹھا ہی رہا——

"اچھا اُٹھ میز پر سے تاش اُٹھالا——بس آج یہی کھیل رہیگا"
"خان گھگھیا کر بولا۔ کرتا کیا غریب وہ تو لاکھ چاہتا کہ ذرا خوش ہو مگر دل کمبخت——!

مرزا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس پر بھی خان کی بیزاری غیر شعوری طریقہ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ اسے پھولے دیکھکر خان خود ہی اُٹھا اور تاش اُٹھا لایا۔ پھٹا پھٹ تاش پھینٹتے ہوئے وہ مُسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے اسے احباب کی دلداری کرنے کا احساس گدگدا رہا ہو۔ مرزا تاش دیکھ کر اپنی بیزاری کو روک نہ سکا۔

"فلاش ہوگی پھر" اُس نے گرما کر تجویز پیش کی۔

"ہاں——آں——" خان نے پتے بانٹنے سے پہلے پینٹ کی جیب ٹٹولی تو مرزا نے بھی تقلید کی——

پتے بانٹے گئے——پیسوں پر پیسے پڑنے لگے۔

"کھلواتے ہو"

"نہیں"

پھر روپوں پر روپے پڑنے لگے——آخر مرزا نے پتے کھلوائے——وہ سمجھتا تھا کہ خان ہیکڑی میں روپے لگاتا چلا جا رہا ہے——پتے ہیں نہیں کام کے——مگر جب اُس کے

پتے دیکھے تو مرزا کا مُنہ لٹک گیا اور مُٹھی بھر روپے حنان کے پاس پہنچ گئے ـــــ دوسری بازی شروع ہوئی ـــــ پھر تیسری ـــــ کھیل ہوتا رہا ـــــ وہ دونوں خاموشی سے کھیل رہے تھے ـــــ مرزا جی ہی جی میں کھلا جا رہا تھا کہ چلو خان کے روپوں سے تفریح نہ سہی نقد انقد کیا بُرے ہیں ؟ ـــــ سارے کے سارے روپے جیت لیگا وہ چُٹکی بجانے میں ـــــ پہلی دفعہ حضرت جیت گئے تو کیا ؟ ـــــ نرے احمق تو ہیں اُونٹ صاحب۔ ـــــ مگر توبہ ! وہ ڈھلتی عمر کی مسز پریرا بازو کے کمرے میں بار بار اپنی چھوٹی بچی کو پکارنے کے لئے کوُکنے لگی۔

"بٹی ! ـــــ بٹی ڈارلنگ ! ـــــ" اور بیچ بیچ میں پکارنا ملتوی کر کے ایک انگریزی گانا گانے لگی ـــــ کسی ریکارڈ کی بالکل بے ڈھنگی سی نقل ـــــ جیسے اُس کے گلے میں سخت تکلیف ہو رہی ہو۔ لیکن اُس کے اس کربناک انداز پر مرزا کا دھیان بار بار کھیل کی طرف سے بھٹکنے لگا ـــــ بات یہ تھی کہ وہ جب بھی حنان کے یہاں آتا تو بٹی کو، پیاری سی چینی کی گڑیا جیسی، بٹی کو عموماً چالی میں کھیلتے ہوئے پاتا۔ اور مسز پریرا کو اُس کے پیچھے کوکتے ہوئے ـــــ اسے جانے کس طرح بٹی پیاری لگنے لگی یہاں تک کہ وہ اسے میری مُنّی بیٹی کہنے لگا۔ بسکٹوں کے ڈبّے کے ڈبّے دیئے جانے لگا ـــــ چاکلیٹ سے

رجھایا جانے لگا اور مسز پریرا کی کوک میں کرارا پن آتا گیا ۔ مرزا کو بھی جب بہت پیاری ہوگئی ۔ تو اُس کی ماں سے پیار ہونا ناممکن تھا لیکن مسٹر پریرا کو مسز پریرا سُوتی فراکوں ہی میں بھلی لگتی تھی ۔ اسلئے مرزا جہاں تھا وہیں رہ گیا ۔ مگر کم بخت ذہن کے توپر لگے ہوتے ہیں ۔ ایسے معاملات میں ۔ مرزا کھیل میں پورا دھیان نہ دے سکا خان نے تیسری مرتبہ جیتے ہوئے روپے سمیٹے اور بڑی بدمزگی سے پتے گڈی میں رکھ دیئے ۔

"بس بھئی اب جی اُکتا گیا ——" وہ آرام کرسی پر آرام کرنے لگا ——

"ہینھ! ابھی سے ؟ واہ اور کھیلو میں نے کہا ——" مرزا کھسیا گیا وہ سب روپے ہار چکا تھا نا ——

"نہیں بھئی! —— روپوں کے لئے دم نکل رہا ہو تو لے لو بابا اپنے ——" خان نے اپنی مخصوص بے نیازی سے کہا ۔ اس پر پہلی سی بیزاری چھائی ہوئی تھی ۔ مرزا کا کلیجہ نوچکر بھی اُسکے جسم میں چُستی نہ آئی تھی ۔

"ارے یہ بات نہیں —— ہینھ!" مرزا نے جھینپ کر اپنے سر کو کئی جھٹکے دیئے —— کمبخت مسز پریرا اب خاموش تھی اُسے لُٹوا کر —— مرزا کی رگوں میں اب دبے دبے غصہ کی چنچناہٹ دوڑ رہی تھی —— لاحول ولا ——" اس کا جی چاہا

لہ زور زور سے بکے ـــــ عجب بے ہودگی ہے۔ بیوی کو بھیجکر مراجا رہا ہے اُونٹ کہیں کا ـــــ بمبئی میں عورتوں کا کون سا قحط پڑگیا ہے ؟ فضول ہی تو ستی ساوتری بن رہا ہے ـــــ ہنہہ!۔

"چائے پینا چاہیئے یار ـــــ" تھوڑی دیر بعد مرزا کو سُوجھی ۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے اس طرح خان کی بیزاری میں کچھ کمی ہو جائے ۔ اور وہ دوبارہ کھیلنے پر آمادہ ہو جائے یا کم از کم اپنے وعدے کے مطابق اسے اپنے ساتھ سیر و تفریح کے چٹ پٹے پروگرام میں شریک کرے تاکہ اُس کا گھاٹا ادھر پورا ہو جائے ۔

"منگواؤ ـــــ" خان نے اپنی چٹکیاں مسلتے ہوئے کھوئے سے لہجہ میں کہا ۔ مرزا تیزی سے بالکونی میں چلا گیا ۔

"باہر والا ـــــ او باہر والا ـــــ" مرزا نے بمبئی کے مخصوص انداز میں تالیاں بجاکر اور ششکار کر پکارنا شروع کیا ـــــ "دیکھو باہر والا ـــــ دو کپ چائے لاؤ ادھر کو ـــــ بابا ام بولتا دو چائے ہاں ـــــ" سامنے والی بلڈنگ کے نیچے والے ریسٹورنٹ میں آرڈر دینے کے بعد وہ خاموشی سے اپنی کرسی پر آپڑا ـــــ روپے ہار جانے پر اُس کا دل اینٹھ رہا تھا ۔

کمرے میں ایک بار پھر فکرمندانہ سکوت نے اپنا سایہ کر دیا دروازہ کا پردہ ہلا اور اس میں سے ایک زیتونی رنگت کا پھولا پھالا چہرہ جھانکا ، گھٹا ہوا سر ـــــ گول گول آنکھیں اور کسی قدر

موٹے ہونٹ ـــــ دونوں کی نظریں بیک وقت اس طرف اُٹھ گئیں اور دونوں ہی ہنس پڑے ـــــ چہرہ غڑاپ سے غائب ہوگیا اور پھر ایک چھوٹا سا ہاتھ کمرے میں داخل ہوا۔ جس نے تلے اوپر دو کپ تھام رکھے تھے۔

"اوہ! ـــــ باہر والا ـــــ" مرزا کے مُنہ سے نکلا۔

"آجاؤ اندر ـــــ" خان سنبھل کر بیٹھ گیا اور ہونٹوں پر مُڑی ہوئی ناک پر ہلکی سی سُرخی قدم جمانے کی کوشش کرنے لگی۔

ـــــ باہر والا ڈرتے ڈرتے اندر آگیا ـــــ چھوٹا سا لڑکا، عمر کوئی آٹھ نو برس کی ہوگی ـــــ بھاگتی ہوئی ہرنی کی طرح گھبرا گھبرا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"شاید نیا آیا ہے بمبئی میں۔" مرزا نے چھوکرے کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے غبارے میں کس کے ہوا بھر دی گئی ہے دیکھ ہے نا! ـــــ میرزا ـــــ" خان نے اس طرح کہا جیسے ہری مرچ چبالی ہو۔

"تم کدھر سے آیا ہے بمبئی کو ـــــ" مرزا نے خان کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے باہر والے سے سوال کیا ـــــ لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا ـــــ شاید وہ اُس کی زبان نہیں سمجھ پایا تھا ـــــ یا وہ جواب ہی نہیں دینا چاہتا ہو بس وہ اپنی

قمیص کو کھلے گریبان کو پکڑ کر حیران آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس کی باچھیں رال سے بھیگی ہوئی تھیں

"تمھارا کیا نام ہے؟" خان نے اور زیادہ دلچسپی سے پوچھا

اب بھی وہ کوئی جواب نہ دے سکا — ہاں ہونٹ کھل گئے اور رال ٹھوڑی پر بہہ گئی۔

"گندہ ہے — ایچ ہی —" مرزا نے مُنہ بنا کر جھرجھری لی۔ لیکن خان کی آنکھوں میں چمک کچھ تیز ہوگئی

"ہماری بات نہیں سمجھتا شاید کہیں باہر کا رہنے والا ہے" — خان نے کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا اور باہر والے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ — ننھا سا پھولا پھالا ہاتھ — مخمل کی طرح نرم اور نئی روئی کی طرح گرم — اُسے اپنی بیوی کے ہاتھ یاد آگئے جن کے لمس میں انھیں کیفیات کا احساس ہوتا تھا — اُس نے بے اختیاری میں وہ ننھا سا ہاتھ اپنے بڑے سے کھُردرے ہاتھ میں بھینچ لیا۔

"قیں —" چھوکرے کے مُنہ سے آواز نکلی جیسے مرغابی چیخ کر اُڑ گئی ہو — اور مرزا پر ہنسی کا شدید دورہ پڑ گیا —

باہر والا نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا — خان کی آنکھوں کی چمک وحشت میں تبدیل ہوگئی — اُس نے باہر والے کو بے دردی سے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اور اُس کے مُلائم ہاتھوں اور کلوں کو اپنی

چٹکیوں میں مسلنے لگا۔

"قیں ـــــ قیں ـــــ" باہروالا کمزور سی مدافعت کرتے ہوئے چیخنے لگا۔

"مرغابی ـــــ مرغابی ـــــ" مرزا مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ کر جیسے کراہنے لگا۔

باہروالے کے زیتونی جلد کے نیچے خان کی چٹکیاں بیر بہوٹیاں جنتی جا رہی تھیں ـــــ اور وہ بے بسی سے ٹکر ٹکر خان کا منھ تک رہا تھا ـــــ آخر خان نے اُس کے منھ پر ایک زوردار چپت لگا کر اُسے چھوڑ دیا ـــــ اور پھر مرزا کی ہنسی میں شریک ہو گیا ـــــ اب ننھا باہروالا رال کے ساتھ آنسو بھی بہا رہا تھا۔

"چچ چچ ـــــ رونے لگا بچہ!" خان اُس کے آنسو دیکھ کر شرمسار ہو گیا۔ اب کے اُس نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ـــــ "نہ بیٹا ـــــ رونا کاہے کو ہے ـــــ ہم تیرے سے مسخری کرتا تھا ـــــ چُپ ہو جا ـــــ" پر ننھا باہروالا رال اور آنسو بہاتا رہا۔ خان کو ذرا دُکھ سا ہوا۔ وہ اکثر گود کے بچوں کو ستا کر بھی بعد میں دُکھ محسوس کیا کرتا تھا ـــــ اور یہاں تو مرزا بھی تھا ـــــ اب کے اُس نے میز پر سے دو دونّیاں اُٹھا کر اُس کے سامنے کر دیں تاکہ وہ بہل جائے۔ باہروالے کی سسکیاں اِک دم رُک گئیں اُس نے دُونّیاں اپنی مُٹھی میں بھینچ لیں اور فوراً ہی موٹے

سے مینڈک کی طرح پھدکتا کمرے سے نکل گیا۔
خان کا دل یہ سوچکر فوراً مطمئن ہوگیا کہ اس نے کفارہ ادا کردیا ہے۔

"تو خان عظم یہ بات بھی ہے کیوں؟" مرزا نے ہنسی سے نجات پاکر کپ اُٹھاتے ہوئے پوچھا اور اپنی چیاں جیسی آنکھیں خان کے چہرے پر جما دیں۔

"کیا بات ——اوہ نہیں بے ——بس ویسے ہی شرارت سوجھی تھی —— تو مجھے دس سال سے جانتا ہے۔" خان نے اپنی صفائی میں اور جانے کیا کیا کہا پر مرزا طنز سے ہنستا ہی رہا —— جوئے میں ہار کر اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ خان کو کسی نہ کسی طرح تکلیف پہنچائے ویسے اگر کوئی خان کے دل میں بیٹھ جاتا۔ تو خان کی صفائی کو لفظ بلفظ صحیح پاتا۔ وہ اپنی بیوی کا صد فیصد وفادار تھا۔ ہاں یہ الگ بات تھی کہ موٹے پھوٹے جسم کو دیکھ کر وہ چٹکیاں لینے سے باز نہ رہ سکتا تھا۔ باہر والا تو باہر والا وہ ایسے گودی کے بچوں کو بھی ستانے سے بھی نہ چوکتا۔ جو اُس کے قریب آجاتے۔ حد تو یہ تھی۔ کہ وہ ہر صبح اپنے ریسٹورنٹ کے موٹے بوڑھے ایرانی سے محض اسلئے مصافحہ کرتا تھا کہ اُس کا ہاتھ گدگدا تھا —— ٹرام میں یا بس میں بیٹھنے کیلئے وہ حتی الامکان وہی سیٹ منتخب کرتا جس پر کوئی موٹا مرد یا عورت بیٹھی ہوتی —— اس طرح وہ کسی نہ کسی طرح موٹی سی ران یا

رُوئی جیسی تونداسے مس کرنے میں بڑا لطف آتا۔ اگر اُسے پٹ جانے کا خوف نہ ہوتا۔ تو ہر ایسے شخص کو نوچنے سے نہ چوکتا۔ غرض نوچا کھسوٹی اور مار دھاڑ کرنے کی خواہش کو وہ کسی طرح نہ تج سکتا تھا۔ اور نہ اس لذت سے دست کش ہونے کا خیال کر سکتا تھا۔ جو اسے ان حرکتوں سے حاصل ہوتی تھی ـــــ اور اب کیا تھا جبکہ اُس کی گُپ چُپ بیوی اپنی شرم و حیا کو توڑ کر اُس سے اظہارِ محبت کر گئی تھی۔ وہ بیوی جسے اُس نے چٹکی بازی کا تختۂ مشق بنایا تھا۔

وہ دونوں چائے پیتے رہے۔ ساتھ والے کمرے میں مسز پریرا نے پھر کوکنا شروع کیا اور مرزا نے بے چین ہونا ـــــ

ذرا دیر بعد باہر والا خالی کپ لینے آیا ـــــ اب اُس کی آنکھوں میں خوف نہ تھا۔ جو پہلی مرتبہ کمرے میں داخل ہوتے وقت تھا ـــــ اُس کے ہونٹوں میں پان کی سُرخی رچی ہوئی تھی۔ اور یک کلا پھُولا ہوا تھا ـــــ اُس کی قمیص کی جیب میں پیسے جھُول رہے تھے۔

خان نے چائے کے دام دینے کے بعد اُس کی پیٹھ کو پرانہ شفقت سے تھپکا۔ باہر والا بولایا ہوا سا کپ لیکر چلا گیا۔

معاً خان نے سوچا کہ اب شاید وہ یہاں چائے لے کر پھر کبھی نہ آئے گا۔ اس پر ایکبار پھر پوری شدت سے بیوی کی یاد کا دورہ پڑ گیا۔

لیکن اُس کا یہ خیال جلد ہی غلط ہوگیا جب کہ دوسرے دن اُس نے دفتر سے آکر بالکونی میں کھڑے ہوکر بمبئی کے مخصوص انداز میں "ایک چائے کا آرڈر دیا۔ اُس نے دیکھا کہ غبارے جیسا باہر والا دوسرے نوجوان باہر والے کی طرف لپکا اور اُس کے ہاتھ سے کپ لے لیا جو اُس کے پاس چائے لا رہا تھا ـــــ چند منٹ بعد ننھا باہر والا اُسکے کمرے میں داخل ہوا ـــــ آج اُس کی باچھوں میں رال کے ساتھ خفیف سی مُسکراہٹ بھی کپکپا رہی تھی۔ جیسے وہ خان کے کل والے طرزِ عمل سے ناراض نہ ہو۔ اس ہمت افزائی سے خان کی اُنگلیوں میں چل ہونے لگی ـــــ اُس نے اُس کے گال پر ایک بگوٹا بھر لیا ـــــ باہر والا اپنی مخصوص "قیں" نہ دبا سکا اور خان کو ہنسی آگئی ـــــ لیکن اُس کی ہنسی اُس وقت ٹھٹک گئی جب باہر والے نے آنسوؤں میں بھری گول گول آنکھیں اُٹھا کر فوراً ہی اپنا ہاتھ پھیلا دیا ـــ وہ خان سے قیمت طلب کر رہا تھا ـــــ خان ایک لمحہ کے لئے اس کاروبارانہ صورتِ حال کی وجہ سے بھونچکا سا رہ گیا ـــــ مگر اُس کے لمبے تڑنگے جسم کے اوپر رکھی ہوئی کھوپڑی میں محفوظ بھیجہ گھور اندھیرے میں پڑا تھا ـــــ اُس نے چھوکرے کے ہاتھ پر چونی رکھدی اور اُسے موٹے مینڈک کی طرح کمرے سے باہر جاتا ہوا دیکھنے لگا۔

اب باہر والا روز آنے لگا ـــــ اگر خان چائے نہ بھی منگاتا تو

بھی وہ اپنی مرضی سے ایک کپ لے آتا اور پھر اپنے آپ کو خان کی چپتوں اور چٹکیوں کے سپرد کر کے کچھ پیسے وصول کر لے جاتا ـــــ اُس کی باچھوں میں رال اب بھی کپکپاتی اور آنکھوں سے دبا دبا خوف برابر جھانکتا رہا ـــــ مگر اب اُس کے آنسو نہ آتے جیسے وہ عادی ہو گیا ہو ـ خان بھی اب اپنی بیوی کی جُدائی سے اتنا مُتاثر نہ تھا ـــــ جتنا کہ پہلے روز ہوا تھا ـــــ ایک ماہ کے عرصہ میں اُس نے کئی بار مسز پیٹرک کے یہاں چائے پی تھی اور اُسے اپنے ساتھ سینما لے گیا تھا ـــــ چالی کے آخری سرے پر رہنے والے مراٹھی لڑکی چندر بھاگ کے سانولے ـــــ سانچہ میں ڈھلے ہوئے جسم کو نظر میں گڑو گڑو کر دیکھا تھا ـــــ چند سال پہلے چندر بھاگ چھوٹی سی گھگری اور پولکا پہنے ساری چالی کے کمروں میں بلیوں کی طرح جھانکتی پھرتی تھی ۔ اور اب پتہ نہیں کیوں آپ ہی آپ جھکی جھکی شرمائی شرمائی رہتی تھی ـــــ مرزا کے ساتھ اُس نے مسز پریرا پر ایسی ایسی تنقیدیں کی تھیں کہ اگر مسز پریرا سُن پاتیں تو پھانسی لگا کر دم دے دیتیں ـــــ وہ کتنی ہی بار مرزا کے ساتھ تفریح کو گیا اور اس طرح مرزا کی دوستی کا ٹیکس بخوشی ادا کیا

اس دوران میں اُس کی بیوی نے کئی خط لکھے ـــــ بدخطی کے بہترین نمونے ـــــ لیکن محبت کے سستے سستے جملوں سے سجا ہوا خط ـــــ پر اب خان کو اُسے بُلانے کی اتنی جلدی نہ تھی

وہ چاہتا تھا کہ اُس کی بیوی جُدائی کی تکلیف سے اتنی بیتاب ہوجائے کہ بے انتہا شرم کی کھینچلی اُتار پھینکے ـــــ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا ـــــ کہ وہ اپنی بیوی سے بیوفائی کرنا چاہتا تھا ـــــ یا کر چکا تھا ـــــ وہ صبر سے کام لینا چاہتا تھا ـــــ کیونکہ اُسے میٹھا پھل ملنے کی اُمید تھی۔

لیکن اس دن وہ ایک دم بے صبرا ہی تو ہوگیا ـــــ جبکہ حسبِ معمول باہر والا چائے لے کر نہ آیا ـــــ اُس کے مُنہ میں بار بار پھیکا سیٹھا پانی چھٹنے لگا ـــــ یہاں تک کہ اُس کے کمرے میں شام کا اندھیرا رات سے ساز باز کرنے لگا ـــــ اور سڑک پر بجلی کی بتیاں جاگ گئیں ـــــ

"باہر والا ـــــ او باہر والا ـــــ ایک کپ چائے لاؤ" اُس نے بالآخر بالکونی میں آکر پکار ہی لیا ـــــ

"اچھا صاب ـــــ" ریسٹورنٹ سے جواب ملا ـــــ خان چُپ چاپ کمرے میں آگیا بلب روشن کیا ـــــ اور بے آرامی سے آرام کرسی پر بیٹھ گیا ـــــ

ذرا دیر بعد ایک سیاہ رنگ کا چائے والا چائے لئے کمرے میں داخل ہوا۔ اور خان کو جیسے چکر آگیا۔

"وہ چھوکرا کدھر گیا ـــــ وہ موٹا سا چھوٹا باہر والا ـــــ" خان نے بے پروائی سی دکھاتے ہوئے سوال کیا۔

"صاب ۔۔ وہ ملاباری چھوکرا؟ ـــــ وہ تو راست سے بھاگ گیا صاب ـــــ اُس کا ماں گریب بدھوا سب طرپ کو روتا پھرتا ہے ـــــ صاحب پہلے بہت چانگلا (بہت اچھا) چھوکرا تھا پر صاب بعد کو کھراب ہوگیا ـــــ اور صاب ـــــ" اور صاب کے کانوں میں جیسے میل کی ٹھینٹھیاں اُڑ گئیں ـــــ اُس نے آگے کچھ نہیں سُنا ـــــ اس کا جی اندر ہی اندر مل رہا تھا اُس نے ارادہ کیا کہ چائے پینے کے بعد وہ فوراً ہی اپنی بیوی کو خط لکھنے بیٹھ جائے گا ـــــ تاکہ وہ خط پاتے ہی پہلی ٹرین سے چل پڑے۔

خان "پلے ہاؤس" کے ایک سنیما ہاؤس سے آخری شو دیکھ کر نکلا۔ "پلے ہاؤس" بمبئی کی بدنام جگہوں میں سے ایک ـــــ مگر کبھی کبھی جانے وہاں اچھی تصویریں کیسے لگ جاتیں ـــــ اور اپٹوڈیٹ لوگوں کو بھی وہاں جانا پڑتا ـــــ خان کو سڑک کے دوسری طرف کھڑی ہوئی وکٹوریہ گاڑی تک پہنچنے کی جلدی تھی جسکی طرف ایک عیسائی جوڑا بڑھ رہا تھا ـــــ اُسے اپنی بیوی کی تنہائی اور پریشانی کا خیال تھا جسے اطلاع دیئے بغیر وہ ایک دوست کے اصرار پر سنیما دیکھنے چلا آیا تھا ـــــ لیکن اس سے پہلے کہ وہ وکٹوریہ گاڑی تک پہنچتا کوئی اُسکی ٹانگوں سے

لپٹ گیا ـــــ موٹا سا گدا ـــــ خان کا جی چاہا کہ وہ ٹانگوں سے لپٹنے والے کو گرا کر روندتا ہوا وکٹوریہ گاڑی تک پہنچ جائے ـــــ جسے عیسائی جوڑا چُکا رہا تھا ـــ اب وہ گھر کیسے پہنچے گا؟ ـ جانے اور کوئی سواری ملے یا نہیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا ـــــ وکٹوریہ اُس جوڑے کو لیکر رینگ گئی ـ خان کا جسم ڈھیلا پڑ گیا ـــ اُس نے غصّہ سے سر جُھکا کر نیچے دیکھا۔ لپٹنے والا ننھا باہر والا تھا ـــ مُسکراہٹ کیتھارال اُسکی بانچھوں میں اب بھی کانپ رہی تھی "قیں" یہ خوشی کا اظہار تھا۔

"اوہ! تم؟" خان کے مُنہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ ننھے باہر والے نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر اپنے رُخسار پر رکھ لیا۔ اور درد بھری مہین سی آواز میں بولا ـــــ "صاب اب ہم باہر والے کا کام نہیں کرتا اَم کو رحیم نے رکھیلا ہے۔" اُس نے پان والے کی دوکان کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک شخص کھڑا مُونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا ـــــ سُرخ رنگ کی کامدار واسکٹ اور ہرا رومال گلے میں لپیٹے ـــــ اُسکی بغیر بُھندنے کی ترکی ٹوپی داہنی بھوؤں پر زیادہ جُھک آئی تھی۔ خان نے اُسے دیکھا تو ایک جُھرجُھری لی ـــ خان کو خاموش دیکھکر باہر والا کہتا رہا "پر اب رحیم میرے کو جیادہ پیسہ نہیں دیتا ـــ میرا اکھا (پورا) انگ کاٹتا ہے۔ اکھا دن ـــــ صاب میرے کو رکھ لے۔ نئی تو میرے کو پیسہ دے ـــــ" باہر والے نے خان کا

ہاتھ اپنے رخسار پر دبایا ــــ جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ مجھے نوچو مجھے کاٹو اور پھر مجھے کچھ پیسے دیدو ــــ لیکن ابھی خان کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا ــــ کہ اتنے میں ایک ٹیکسی رُکی اور وہ گھبرا کر تیزی سے اسطرف لپکا ــــ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

"دادر چلو" اُس نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا اور ٹیکسی چل پڑی۔

"صاب ــــ صاب ــــ" ننھا باہر والا ٹیکسی کے پیچھے ہاتھ پھیلا کر رہ گیا۔ خان کے دل میں ایک کھٹک سی ہو رہی تھی۔

سونے سے پہلے خان نے اپنی گدبری بیوی سے پوچھا:

"میری جان تمھیں میری کوئی حرکت بُری تو نہیں لگتی ــــ کوئی حرکت ــــ؟"

بیوی کسمسائی اور شاید شرمائی بھی ہو کیونکہ اندھیرے میں اُسکی سانس قدرے تیز ہوگئی تھی۔

"بولو" ــــ خان پھر کہنے لگا۔

"آپ میرے آقا ہیں ــــ" بیوی نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا اور خان قطعی مطمئن ہوگیا ــــ اُس کے دل کی کھٹک غائب ہو چکی تھی اور اب اُنگلیوں میں چٹکیاں لینے کے لئے چسل ہو رہی تھی۔

اُس کا ہاتھ بیوی کے رخسار پر گیا تو نم ہو گیا ـــــ وہ چونک پڑا
"آنسو" اُس نے پوچھا۔
"نہیں جماہی آئی تھی ـــــ" اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔
"اچھا تو سو جاؤ" وہ بولا۔
کمرے میں ذرا دیر کیلئے خاموشی طاری ہو گئی ـــــ پھر اچانک جیسے اُس کی بیوی کراہی۔
"میرے پاس ساریاں بہت کم ہیں۔ اب کی تنخواہ پر ایک ضرور لا دیجئے گا۔"
خان کے دل میں پھر کوئی چیز کھٹکنے لگی۔

مُنکر

ابوالفضل صدیقی

صفحات :- ۴۴

کوکب شہلا کے عشق کی چنگاریاں کالج ہی سے دبا کر لایا تھا ـــــ جہاں مخلوط تعلیم نہ ہونے پر بھی مخلوط ہونے کیلئے محبت کرنے والے دل سماج، مذہب، قانون اور ہوسٹل کی چار دیواریوں کو پھاند کر ایک دوسرے کو صدائے لبیک دیتے ہیں ـــ شہلا کتنی حسین و رعنا تھی بس جتنا صنائع قدرت کے امکان میں تھا اور کوکب اسکو کس درجہ محبت کرتا تھا اُسی قدر جسقدر ایک بنی نوع انسان دوسرے کو چاہ سکتا ہے ـــــ وہ اس منزل پر تھا جہاں ایک انسان خود اپنے وجود کی اور اہمیت کو دوسرے ہم جنس کے مقابلے میں رکھکر فیصلہ کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اور کوکب درحقیقت خود فیصلہ نہیں کرسکتا تھا کہ اُسے شہلا زیادہ پیاری ہے

یا قانونِ فطرت کے مطابق خود اپنا وجود زیادہ عزیز ہے ـــــ اور شہلا! شہلا اگر ہیڈ منٹن کھیلتے وقت وحشی ہرنی ہو جاتی تھی تو مطالعہ کے وقت ایک بُتِ سنگیں ہوتی تھی اور چلتے وقت پورا پورا چلتا ہوا فتنہ ہوتی تھی تو بیٹھے ہوئے مکمل محشرِ خوابیدہ ـــــ اور کوکب ـــــ کوکب اسکا پورا پورا پجاری تھا

دلی آرزوئیں بر آئیں ـــــ اور تیز و ذہین طالب علم جس مقام کو اپنی معراج سمجھتا ہے کوکب اسی شاخِ سدرہ پر پہنچ گیا ـــــ اور شہلا بی اے ہوگئی اور کوکب آئی۔ سی۔ ایس کے امتحانِ مقابلہ میں آگیا ـــــ

مشہور بات ہے بے زر عشق ٹائیں ٹائیں ـــــ اور درحقیقت حُسن و رعنائی، عشق و رومان کچھ سونے اور چاندی کی قدروں میں ہی اچھے چمکتے ہیں۔ شہلا اور کوکب کی شادی کے بعد کی زندگی مسلسل قہقہہ اور مجسم رومان تھی اگرچہ ماہِ عسل کو بیتے پورا ڈیڑھ سال بیت گیا تھا مگر ہر شب شبِ عروسی اور ہر دن عید تھا اور وہ سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کر ـــــ کا مضمون ـــــ وہ دونوں رومان اور رنگینیوں کے مسلسل دھارے میں بہہ رہے تھے اور یہ ضرب المثل غلط ثابت کر رہے تھے کہ "شادی رومان کا اختتام ہوتی ہے"۔

وہ تو شادی کے ڈیڑھ سال بعد آج بھی نشۂ شباب میں مدہوش، شرابِ حُسن سے ہمہ وقت سیراب ہونے کے باوجود بھی جیون کے

تشنہ، عشق و محبت کی کامیاب و کامراں سرحدوں میں جنسیات کے باریک و ادق مسائل کو قدم قدم پر حل کرتے، خوشبوؤں، مستیوں، اور خود فراموشیوں والی عنبر مرئی دنیا میں اس مادّی دنیا کی پہنچوں سے بالاتر کچھ رنگ و بُو کی سطحوں پر سرگرم پرواز تھے مُسکراتی شامیں، مخمور راتیں اور کھلکھلاتی صباحیں اُن کے عیش کا خیر مقدم کرتیں۔

جیسا کہ بالعموم اول درجے کا سرکاری عہدہ دار اپنی حکومتی پوزیشن کے مطابق اتنے ہی بلند معیار پر اپنی اقتصادی پوزیشن کی بھی نمائش ضروری سمجھتا ہے اسی طرح اپنی برادری کے رواج کے مطابق 'ایک کار، ایک بڑی کوٹھی جو اندر سے بھری نہ سہی مگر باہر سے تو خوب بھری پُری تھی ہی۔ کمپاؤنڈ میں نائی بھشتی، دھوبی، ڈرائیور، بھنگی چپڑاسی غرض ان تمام لوازمات سے پُر جنھیں انگریزی نما اُردو میں "شاگرد پیشہ" کے لقب سے پکارا جاتا ہے اور اندر ——— اندر ایک I.C.S. کے شایانِ شان مغربی وضع کی آراستہ کوٹھی کے اندر ایک صحیح صحیح حورِ ارضی کا وجود جس کے دم قدم سے ہر کمرہ از فرش تا عرش جگمگاتا ہُوا ——— جہاں تنہا شہلا ہی کا وجود گویا ہر وجود تھا اور اُس کے ہوتے کسی چیز کی کمی ہی نہ محسوس ہو سکتی تھی ——— جو کچھ بھی نشہ شہلا اور کوکب پر طاری ہوتا کم تھا ——— وہ دونوں اپنی کامیاب اور بے خار زندگی

کچھ امروز و فردا کے پیمانے سے بالاتر معیار پر کچھ ابدیت کی سی کیفیتیں لئے کاٹ رہے تھے۔ کچھ اس فردوسی طرز کے ساتھ جب انسان باوجود فانی ہونیکے بھی زندگی کے کچھ لمحے اس طرز سے گذارتا ہے جو وقت کی رفتار اور فنا کی پہنچ سے باہر ہوتے ہیں اور جنکا وقت عمر کی مدت میں شمار نہیں ہوا کرتا ــــ اور حسن و رومان کی ایک وسیع اور لامتناہی سلطنت کا بلا شریک و شہیم تنہا کوکب ہی کوکب مالک و مختار تھا اور رومان و رنگینیوں کی ایک بغیر اُفق والی لامحدود دنیا کی تنہا ملکہ شہلا تھی، کہ ایک دم شہلا کا چہرہ تمتما اُٹھا۔

"اوہ! کوکب! پیارے! یہ کیا غضب!! ؟ ہے! ہے!"

"اوہ! ڈارلنگ! میری شہلا ــــ کوئی بات نہیں ــــ" کوکب نے شرارت کے ساتھ مسکرا کر کہا۔ "یہ وہی غضب جو ابتدائے آفرینش سے آجتک دو سچے محبت کرنے والوں پر قدرت اپنی چیرہ دستی سے نازل کرتی رہی ہے ــــ تم ماں بننے والی ہو ــــ ــــ اور ہم؟ ــــ ہم باپ ــــ شہلا!! ــــ کچھ سمجھیں بھی آدم شجرِ ممنوعہ کے چھونے کے جرم میں فردوسِ بریں سے دیس بدر کیا جارہا ہے ــــ بس عیش و رومان کا زمانہ گیا ــــ عشق و محبت کا بادل اپنا اخیر قطرہ ٹپکا کر سر سے سرک گیا" کوکب نے مزاحیہ سنجیدگی سے کہا ــــ "اُٹھو اور دنیا کی گاڑی کا جُوا گردن پہ

رکھ کر میرے دوش بدوش گھسیٹو ہاہا ہا" پُرتمسخر ایک قہقہہ اُس نے لگایا اور شہلا نے نہایت سنجیدگی سے خشمگیں لہجے اور گلابی ہونٹوں اور نرگسی آنکھوں میں کھیلتی ہوئی مُسکراہٹ کے ساتھ کہا:۔۔۔۔

"خوب! مان نہ مان میں تیرا مہمان!۔۔۔۔ آخر ہوا نا وہی!
لے آئی نا تمھاری شرارت رنگ۔۔۔۔ ہو بڑے کوئی وہ
بے احتیاط تمام خدائی کے۔۔۔۔ اور بس اب۔۔۔۔"

اور کلیوں کی رونق، پارٹیوں کی شمع اور سرکاری و نیم سرکاری جلسوں کی روح رواں شہلا پر آنے والے زندگی کے میٹھے انقلاب سے دوچار ہونیکے خیال سے کچھ عجب پُرکیف ذہنی اضمحلال اور گھبراہٹ طاری ہوجایا کرتی اور دوسرے تیسرے مہینے جب تتری کیطرح تھرکنے والی اور کبھی نچلی نہ بیٹھ سکنے والی شہلا معدے کی متلی دماغ میں چکر اور قویٰ کی سستی اور لمبی لامتناہی نیندوں میں کھوگئی اور تمام سوسائٹی کی متمدن خواتین نے اُس کی حماقت کا مذاق اُڑایا اور مردوں نے کھلم کھلا پھبتیاں کسیں تو شہلا لال تال ہوگئی مگر خود کردہ را علاج نیست۔۔۔۔ اپنی کلائیاں سی بھنبھوڑ کر رہ گئی۔۔۔۔

اور تمام خفتیں، اور ذہنی و جسمانی پریشانیاں و تکلیفیں نویں مہینے کی منزل بحران طے کرکے جدید و قدیم دونوں تمدنوں کی رو سے ایک بے طلب و ناخواندہ مہمان کو خوش آمدید کہنے پر مجبور کرگئیں۔

۔۔۔۔ اور چینی کی ننھی منی جاگتی ہنستی کھیلتی گڑیا ہاتھ میں

خیر یہ واقعہ تو عام چیز ہے مگر کوکب و شہلا کے گھر میں حادثہ سے کم نہ تھا اس لئے نہیں کہ اُنھیں اپنی نوجوانی کے شجر سے ثمرِ اناث مل دیتا بلکہ اُن کا تمدن، اُن کا رجحان سرے سے تولید و تناسل کے بھی منافی تھا ـــــ اُن کے لئے لڑکی یا لڑکا سرے سے پیدائش ہی ایک حادثہ تھی ـــــ مگر اسکے بعد دونوں نے اس ننھے مُنّے وجود سے خود کو ایک نئے رومان سے دوچار پایا اُنھوں نے محبت و اُلفت کی ایک نئی دنیا پالی اور وہ زندگی کے حقیقی و سچّے احساسات میں کھو کر رہ گئے ـــــ اگرچہ اُنھوں نے اس کا استقبال نہایت تُرشروئی اور تکدّرِ طبع کے ساتھ کیا تھا۔

اب کوکب نے رفیقۂ حیات کی حُسن و تندرستی کی حفاظت میں آئندہ پوری پوری احتیاط سے کام لینے کا بیڑہ اُٹھایا ـــــ اور فوراً ایک کولن دودھ پلانے کو مُلازم رکھی ـــــ ہرچہ بادا باد کوکب بیوی کے بے پناہ حُسن و خوبصورتی میں صریحاً کمی محسوس کرتا تو کُڑھنے لگتا مگر جب بچی کو دیکھتا تو کچھ اشک شوئی ہوجاتی۔ لیکن جب وہ دونوں چیزوں کا توازن کرتا تو وہ خود کو اس تبادلہ میں خسارہ ہی خسارہ میں محسوس کرتا۔ خیر گذشتہ را صلوٰۃ و آئندہ را احتیاط ـــــ پر بڑے زور سے عامل رہا مگر شدّتی واقعات تو ظہور پذیر ہوکر ہی رہتے ہیں مشہور بات ہے کہ جتنی روحیں دنیا میں آنیوالی ہیں وہ آکر ہی رہیں گی اور ایک نہیں سات پردے پھاڑ کر آئیں گی ـــــ

صاحبزادی خیر سے چھ ہی مہینے کی ہونے پائی تھیں کہ کوکب کو محسوس ہوا کہ ع "روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد" ــــ ساری احتیاطیں دھری کی دھری رہ گئیں ــــ اور اب کی مرتبہ تو لذتیات کے فلسفے کے عامل میاں بیوی ــــ اور بل کھا کر رہ گئے۔ پچھلی مصیبتوں کا مزہ چکھے ہوئے تھی ــــ اور کوکب پچھلے شدید حادثے کے اثرات بیوی کی چمک دمک پر اور اپنے اوقات پر دیکھ چکا تھا۔ مگر اب اُسکے ہاتھ میں بھی کیا تھا، تیر کمان سے نکل چکا تھا اور لڑکی کی پیدائش سے سوا سال بعد ہی دوبارہ شہلا کے متمدن جسم و دماغ کو ان تمام مراحل سے گذرنا پڑا جو نئی روشنی میں قابل نفرت تھی ــــ مگر بھلا کیا کوکب کیا شہلا اور کیا کوئی کرتا بھی تو کیا ــــ قاضی کا دھرا کندھوں پر اور خدا کا دھرا سر پہ ماں، باپ، سماج اور تمدن سب کی مرضیوں اور کوششوں کو چیرتے پھاڑتے میاں صاحبزادے اب کی مرتبہ آدھمکے۔ اگرچہ اولاد وہ پھل ہے جو خلقتِ انسانی کے تحت کبھی بے طلب بھی گود میں آپڑے تو ایسی شدید طلب پیدا ہوجاتی ہے کہ اللہ دے اور بندہ لے ــــ اور باوجود یہ چیز جاننے کے کہ تولید و تناسل ہی حاصلِ زندگی اور بالخصوص عورت کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہے اور تنہا اُسی کے طفیل آج بھی ہندوستانی سوسائٹی میں عورت کا شمار عورت میں ہوسکتا ہے وہ اپنے محبت کے دوسرے پھل کی شیرینی سے گھبرا اُٹھی۔ وہ تو

سرے سے اس پھل کی شیرینی ہی سے ناواقف رہنا چاہتے تھے اور بائیس سال کے نوجوان اور بیس سالہ لڑکی اپنی جوانی کو نشوں میں اگر سوائے اپنے کسی کو بھی نہ دیکھ سکیں تو قابلِ معافی بھی ہیں ۔ اور شہلا کا دل اس سالانہ سلسلے کے خیال سے دھڑک اُٹھتا ـــــ "یہ تو قضا گھر دیکھے لیتی ہے !!" شہلا سوچتی اور اُسے اپنی رنگین و روشن زندگی کے آئندہ سب باب پھیکے اور تاریک نظر آتے اور وہ اسکے خیال سے از سرتاپا کانپ اُٹھتی ـــــ اور کوکب "عورت ازدواجی زندگی میں کچھ بچہ بنانے کی مشین تو نہیں ؟!ـــــ" کے ضابطے والے احساس اور قدرت کی اس چیرہ دستی پر جھنجھلا اُٹھتا ـــــ اور جب وہ اپنی محبوبہ کی ظاہری چمک دمک اور اُٹھتے ہوئے جذبات میں قدرت کا یہ دخل در معقولات یہ مداخلت دیکھتا تو بے اختیار اپنی عاملی فطرت کے تحت اُس کا جی نہایت شدت کے ساتھ اس مداخلت بیجا کی مجرم "قدرت" سے جواب طلب کرنے کو چاہتا ـــــ بھلا کوکب و شہلا اپنی عشق و رومان کی دنیا میں اس طرح دن دہاڑے رہزنی کیا برداشت کر سکتے تھے ۔ لہٰذا آئندہ کو دونوں نے اسکے کلی سدباب کیلئے اسکیم بنائی ۔ اور ماہر ڈاکٹروں کی رائے سے وہ مخصوص عملِ جراحی جس کے بعد عورت ہمیشہ کیلئے تولید و تناسل سے محفوظ ہو جاتی ہے کرا کر شہلا قانونِ فطرت کے اس سلسلے کی زنجیر کی

کڑی توڑ کر ہمیشہ کیلئے اُس سے آزاد ہوگئی۔

نوجوان و خوش خرم و کامراں میاں بیوی اپنے گھر کی ازدواجی زندگی میں نئی روح پھونکنے اور جوانی کے باقی ماندہ دن سب کے سب ایک کامیاب ہنی مون کے طرز پر گذارنے کے ہزاروں ارمان لئے اپنی راہ کا یہ کانٹا نکال کر بے خوف و خطر اطمینان و آزادی کے ساتھ پرانے ارمانوں کو جلا دینے کے خیال میں مگن ہسپتال سے گھر پہنچے اور نت نئی طیاریاں اور پروگرام بنانے لگے۔ جنپر آپریشن کی کمزوری رفع ہوجانیکے بعد عمل کرنے کی اُمنگیں ہمہ وقت کوکب کے سینے میں تڑپ اُٹھتیں۔

ایک مہینے تک تو خیر کوئی بات نہ تھی اور یوں بھی ہر چھوٹی بڑی تبدیلی آپریشن کی کمزوری کے سر منڈھ ہی دی جایا کرتی ہے مگر جب آپریشن کی کمزوری رفع ہوگئی اور شہلا کی آواز کا وہ جھٹکا جو آپریشن کے فوراً بعد کوکب نے پہلے ہی ہفتے میں محسوس کیا تھا رفع نہیں ہوا تو دونوں نے اس پر توجہ دی ـــــ اور دیکھتے دیکھتے آواز میں یکسر انقلاب محسوس ہوا۔ یہانتک کہ وہ قدرتی شیرینی جو شہلا کے لہجے کو تکلم کے وقت نغمے کی حد تک پہنچا دیا کرتی تھی حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی ـــــ اور گانا! گانا تو وہ بالکل بھول ہی گئی ـــــ شروع میں جب تک یہ جدید انقلاب آپریشن کی کمزوری کے سر منڈھا رہا تب تک تو خیر کچھ نہیں مگر جب کوکب نے اپنی طوطی دور اں

عجوبہ ترین تبدیلی کو "دُکھ" یا "بیماری" اس لئے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اس سے ذرا بھی متاسف یا ذہنی طور پر پریشان نہ تھی پھر کسی سہیلی یا لیڈی ڈاکٹر پر ظاہر کرنے کا سوال بھی کونسا تھا۔

کلب کی روحِ رواں اور چراغِ خانہ شہلا کے گھر کے اندر جو تبدیلی اُس کے ملازمین اور صاحب نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ اب اُس نے بجائے بچوں کے ساتھ کھیلنے اور ان کو بنانے سنوارنے کے اُن کی تندرستی اور حفاظت کے متعلق آیاؤں پر زیادہ توجہ دینی شروع کی اور گھر سے باہر کلب اور سوسائٹی میں پہلی بہت نمایاں اور موٹی تبدیلی اُس کے لباس کی تھی ـــــ رنگینیوں اور چمک دار کناروں سے وہ قطعاً متنفر ہوگئی۔ رنگ کی ساڑھیاں بنارسی، جارجٹ اور پیرس ـــــ کی سب بکسوں میں جا چھپیں پہلے کچھ دنوں تو سفید، موتیا یا بادامی رنگ کی ساڑھیاں چلیں پھر پائجامہ سوٹ، رائڈنگ بریچیس بلیزر کوٹ وغیرہ قسم کے ـــــ مردانے لباسوں نے جگہ لی۔ صاحب کو بیگم صاحبہ کی فرمائش پر سواری کے لئے گھوڑی خریدنا پڑی۔ اور مہینے میں پچیس روز شہلا زین سواری پر کلب جانے لگی اور اسکے بعد جو دوسرا قدم شہلا نے اُٹھایا وہ حیران کن بھی تھا اور کلب کے عام اراکین کو قدرے تکلیف دہ بھی ـــــ لباس اور سواری کی تبدیلی کوئی ایسی خاص چیز نہ تھی جس پر بجز ایک آدھ چٹختی ہوئی پھبتی کے اراکین خاص طور پر نگاہیں اُٹھاتے مگر یہ عجیب و غریب انقلاب جو

چند ہی روز میں شہلا کی طبیعت ثانیہ بن کر رہ گیا عام کلب کے ممبران کو قدرے گراں گذرنے لگا ـــــ کلب کے عام ممبران نے محسوس کیا کہ اب وہ بجائے مردوں کے بالعموم کلب کی حسین خواتین کے ساتھ زیادہ گھلتی ملتی ہے۔ اور خود شہلا نے محسوس کیا کہ اس کا دل خود بخود حسن نسوانی میں ایک قسم کی کشش محسوس کرتا ہے اور پہلے جن خواتین کے ساتھ بیٹھنے ان کے ہاتھ میں ہاتھ لینے اور ان سے ملنے جلنے میں اُسے جو ایک مخصوص فطری ہمدردی، وہم جنسی کا اپنائیت جیسا احساس پیدا ہوتا تھا اُس کی جگہ اب کچھ عجب میٹھی میٹھی سی کیفیت پہلے والے احساس سے قطعاً جداگانہ محسوس ہونے لگی اور بعض اوقات کسی سہیلی کے مس کرنے پر اُس کے دل میں یہ خواہش جاگ اُٹھتی کہ "ایک مرتبہ ایسا ہی اور ہوا" ـــــ اور وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ سب "کیوں"! ـــــ اور "کیا"! ـــــ اور یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر شہلا کے اس مخصوص طرز سے متاثر ہو کر کلب میں خواتین کی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ ہی بننے لگی اور خود شہلا نے محسوس کیا کہ اسے کلب کی نوجوان مردوں کی بہ نسبت نوعمر خواتین کے ساتھ ملنے جلنے بات چیت کرنے میں ایک عجیب کیف اور دلچسپی معلوم ہوتی ہے اور جب بعض نوجوان جن سے اُسکی بے تکلفی تھی اُس کی صورت شکل انداز اور لباس پر کوئی جملہ چسپت کرتے تو بظاہر وہ حسب عادت مسکرا کر تو دکھا دیا کرتی مگر اس سے کوئی داخلی

کیفیت محسوس نہ کر سکتی تھی ـــ جیسے داخلی طور پر وہ سپاٹ ہو چکی ہے اور چہرے کے حرکات و سکنات محض شعوری اداکارانہ قسم کے کھوکھلے رہ گئے ہیں اور ایسی باتیں اب اُس کے لئے بالکل بے معنی سی ہیں۔

اور جوں ہی اُس کی اس تبدیلی نے ایک قدم اور بڑھایا تو اُس نے خود کو ایک عجیب انقلاب سے دوچار پایا ـــ اور اُس کا یہ جدید رجحان اسے ایک ایسی منزل کی جانب لے جاتا جو اپنی ندرت کے اعتبار سے خود اُس کے لئے حیران کُن تھی ـــ اور وہ اس مسئلے کو حل کرنے سے اس قدر عاجز تھی کہ وہ خود بھی نہیں سمجھ سکتی تھی کہ یہ کہاں جا کر رکے گا ـــ اور جیسے ہی اُس کی ایک شوخ و چلبلی سہیلی ایک روز کسی بات پر متاثر ہو کر اُس سے لپٹ گئی تو اُس روزمرہ کی معمولی بات سے اُس کے خون میں ایک نیا احساس اور تمام جسم میں ایک نئی کیفیت کا احساس جاگ اُٹھا جس سے اُس کے حسیات قطعاً ناواقف تھے ـــ اور اُس نے محسوس کیا کہ کاش ایسا ہی بار بار ہو۔ اور چند ہی روز بعد جب ایک موقع پر اُس کی دو نوجوان کنواری سہیلیں پنگ پانگ ٹیبل پر کھیلتے وقت کسی اچھے شاٹ پر متاثر ہو کر اُس سے لپٹ گئیں تو یک دم اُس کی وہ کیفیت جس سے دو مرتبہ وہ پہلے دوچار ہو چکی تھی ایک "بھک" سے اُڑ جانے والے مادے میں چنگاری ڈالنے میں تبدیل ہو گئی ـــ تمام رگوں میں خون کی سنسناہٹ، سینے کی

گدازی، دماغ کا بوجھل پن، اور آنکھ کا سرور ایک پھٹ پڑنے والے طوفان کی حد تک پہنچ گیا ـــــ وہ تعجب کے ساتھ اُچھل سی پڑی ـــــ اور اپنی حالت کا اندازہ لگانے کے لئے اُچھل کر قدرتی طور پر اُن سے علیحدہ ہوگئی ـــــ تو اُس نے ایک عجیب و غریب سرور اپنی روح و جسم پر مُسلّط پایا ـــــ جو اُس کے رُونگٹے رُونگٹے میں چکر لگا کر آہستہ آہستہ سوڈے کی بوتل کے جھاگوں کی طرح بجھ رہا تھا ـــــ اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ "اے کاش وہ ایسے ہی کیف و سرور میں گُم رہتی اور ایسا مُسلسل ہُوا ہی چلے جاتا" اور باوجود اپنی اس نئی خواہش کی وجہ اور غیر مانوس کیفیت کا منبع و مخرج معلوم نہ ہونے کے بھی اس جدید انقلاب سے جو روز بروز حدت پذیر تھا وہ بجائے پریشان ہونے کے بالکل مطمئن تھی ـــــ اور نہ صرف مطمئن بلکہ اپنی اس جدید خالص سوسائٹی میں بیحد مسرور۔

کوکب نہ سہی ـــــ اسے ایک کوکب چھوڑ دس شہلائیں دلدادی کے لئے مل گئی تھیں اور وہ اپنی اس نئی جذباتی دنیا میں اپنی جنسی پوزیشن کا پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کے مطابق نہایت آزادی کے ساتھ خوشہ چینی کر سکتی تھی۔ اور اس نئے نشہ کو ہمہ وقت اپنے اوپر طاری رکھ سکتی تھی ـــــ اگرچہ اُس کے پاس اپنے جذبات کے عملی اظہار کے لئے مادّی سامان بظاہر موجود نہ تھے مگر ایک بغیر زبان اور بغیر اُنگلیوں والے مفکّر کی طرح جس کو قدرت نے اظہار جذبات کے لئے مادی آلات سے محروم رکھا ہو اور ایک غور و فکر کرنے والے دماغ سے

آراستہ کر دیا ہو شہلا کے تحت الشعور میں وہ نغمہ گونج تو سکتا تھا مگر باہر نہ نکل سکتا تھا جس کو کسی مادی چنگ و رباب و بربط کا مرہون منت ہونا لازمی ہے۔

مگر شہلا اسم با مسمّیٰ شہلا اس سرور کے خمار سے واقف نہ تھی۔ یوں تو عورت فطری طور پر اپنے جنسی راز و نکات کی حفاظت میں غیر معمولی محتاط واقع ہوئی ہے اس سب کے باوجود اپنے صاحب پر اُس نے اپنی نسائی فطرت کی اداکارانہ چالوں اور بہروپئے پن سے اس نئے بہروپ کو جو اُس کی فطرت بھر رہی تھی ذرا بھی ظاہر ہونے دیا ــــ اور اس خصوص میں وہ ایک کامیاب بیوی کا پارٹ کھیلتی رہی اور نت نئی شرابوں کی تندی سے اپنے نشہ کو تیز تر کرتی رہی ــــ اور تیز نشوں کا خمار جیسا تیز ہوتا ہے یک دم شہلا نے اپنے اوپر طاری پایا ــــ وہ غضب کا درد سر کہ جس نے اُسے سب چوکڑی بھلا دی ــــ اُس کے دماغ پر جیسے ہمالیہ اور بندھا چل یک دم ٹوٹ پڑے ــــ اُس کے داخلی جذبات خارجی صورت اختیار کر کے اُس کا راز فاش کرنے لگے اور پہلی عملی شکل میں جو اظہار ہوا اُس کے مقابلہ میں یہ آن کی آن کے تفریحی مشاغل کیا چیز تھے وہ ایک بڑی سلطنت پر بھی ٹھوکر مار دیتی ــــ اُسکے آپریشن کو نواں مہینہ تھا۔ ایک روز شہلا غسل کرنے کے بعد سنگھار میز کے سامنے کھڑی بال درست کر رہی تھی لمبے لمبے بال کنگھے کے دانتوں میں کبھی دائیں کبھی بائیں اور کبھی آگے کبھی پیچھے لہرا رہے تھے۔ ایک سپید

ساڑی جسم پر تھی اور بیدنگ گون دونوں کندھوں پر لٹک رہی تھی ـــــ
دُھلے دُھلے مکھن سے پاؤں میں چپل تھی اور بلوریں کلائیوں میں کانچ کی
چُوڑیاں کنگھے کی حرکت کے ساتھ کچھ الوداعی سا ساز بجا رہی تھیں ـــــ
آہستہ آہستہ موزوں و گداز جسم از سر تا پا جھُوم جھُوم جاتا تھا اور جیسے
ہونٹ کچھ گنگنا پڑنا چاہتے ہیں کہ یک دم کوکب پیچھے سے چُپ چاپ
بیڈ روم سلیپر پہنے آیا۔ آئینہ میں دونوں کا عکس جمع ہوگیا اور بے اختیار
دونوں کھل کھلا پڑے ـــــ پیچھے سے کوکب نے اپنی ناک پہلے شہلا
کے بالوں اور گردن کے گرد لگا کر دو گہری سانسیں لیں اور اپنا رخسار شہلا
کے رخسار پر رکھ دیا اور اپنا داہنا ہاتھ اُس کی پشت کے گرد حمائل کر کے
سامنے تک لے آیا ـــــ اور دونوں اپنی چاند سورج جیسی مکمل و بے عیب
جوڑی کا نظارہ کرنے لگے ـــــ یک دم جیسے تعجب کے ساتھ ذرا
اُچھل سا پڑ کر کوکب نے اپنا رخسار شہلا کے رخسار سے رگڑتے رگڑتے
ہٹایا اور بڑے غور کے ساتھ اُس کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا
اور ایک منٹ تک دیکھتے رہنے کے بعد اُس نے کہا :ـــــ

"ارے ! یہ کیا ! ؟ تم نے کچھ غور کیا شہلا ڈیر۔"

"ہُوں ! ـــــ کیا ؟ ـــــ"

"میں کہتا ہوں کہ تمھارے چہرے پر کیا آفت آرہی ہے ! ؟
ایں ! یہ دونوں رخسار ٹھُڈی اور اوپر کا ہونٹ ؟ ! ! ـــــ ایں ! ! ؟"
اور شہلا کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اپنے صاحب کے

توجہ دلانے پر نہایت تاریک رونگٹے کی نمو اپنے دونوں رخساروں ٹھوڑی اور ناک کے نیچے دیکھی۔

"وہ وہ کوئی بات نہیں کوکب ڈارلنگ" شہلا نے ڈرتے ڈرتے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "مجھے بھی پرسوں کچھ شبہ پڑا تھا ایسا ہو ہی جاتا ہے" اور یہ کہتے ہوئے کریم کی ڈبی اٹھا کر نہایت زور سے تمام چہرے پر کریم رگڑنا شروع کی اور بہت دیر تک رفتہ رفتہ ملتی رہی مگر شام تک صاحب کے کچہری جانے کے بعد شہلا ہر دس پندرہ منٹ بعد آئینے کے سامنے گئی اور مختلف زاویوں اور رُخوں سے اس نئی کھیتی کو دیکھتی رہی

ایک ہفتہ اس طرح گذرا محض اس انتظار میں کہ آیا یہ اندازہ ہو جائے کہ کس حد تک یہ واہمہ ہے اور کہاں تک اصلیت۔ تو انھیں یہ یقین ہو گیا کہ یہ مرض صرف کریم کی رگڑ کے بس کا نہیں ہے اور دوسرے ہفتے تو یہ حال ہو گیا ؎

سبزۂ خط سے لگی ہونے ہوا سرخیِ لب ؛ چمنِ حُسن سے لعل اُڑ گئے بنکر ہریل

تو وہ دونوں اپنی جگہ پر بدحواس ہو گئے اور شہلا پر تو یک دم ایسی خماری کیفیت طاری ہوئی کہ وہ تقریباً اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی

مجبور ہو کر غریب ڈاکٹروں کا دروازہ کھٹکھٹانے پہنچے ماہر ڈاکٹروں نے اس کو آپریشن کے اثراتِ مابعد بتایا اور مسز شہلا کوکب کے مرض کو secondry sex symptoms کے نام سے

موسوم کیا ـــــ اور اس کی وجہ ان گولیوں کا کٹ جانا تجویز کی جس پر نظامِ قدرت دنیا کی گاڑی کا فری وہیل گھُماتی ہے ـــــ اور جن کی بدولت اپنے محبوب ترین شاہکار کی تخلیق کرتی ہے یعنی دو ہاتھ پاؤں، آنکھ کان اور ناک والے جسم پر روح سوار کر کے اپنی خلاقی کا ثبوت دیتی ہے ـــــ بھلا کوکب اور شہلا کو اس سودے میں گھاٹے کا کیا ٹھکانا تھا "اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی" اگرچہ ایسی قلبِ ماہیت کی مثالیں مشاذ ہی نظر آتی ہیں مگر یہ سب کچھ ممکنات سے ہے۔ ڈاکٹروں نے بتایا اور بالعموم اس قسم کے نماز بخشوانے والے صاف آتے ہیں مگر کبھی کبھی روزے بھی گلے پڑ جایا کرتے ہیں ایلوپیتھک ڈاکٹر بیچارے سوائے بال صفا قسم کی دواؤں کے اور کیا دے سکتے تھے۔ ہومیوپیتھک البتہ تہ کو پہنچ گئے تھے۔ اور وہ بہت گہرے جا رہے تھے یعنی اس سنگِ بنیاد کو لگانے کی تجویز پھر پیش کر رہے تھے جس کے اکھڑنے سے تمام عمارت میں یہ زلزلہ آیا تھا۔ اور اب ـــــ! ؟ اب شہلا اور کوکب ایک چھوڑ ایسے چار پتھر بُنیاد میں رکھنے کے لئے طیار تھے ـــــ وہ سال میں ایک چھوڑ تین جننے کو تیار تھی اور تولید و تناسل کے بعد کوکب بیوی کی ہر مسخ شدہ شکل کو خوش آمدید کہنے پر راضی تھا ـــــ بس انھیں اس وقت تو اِس داڑھی کی مسخ شدہ صورت سے نجات حاصل کرنے کی پڑی ہوئی تھی مگر ع مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی

اور ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک ڈاکٹروں کی تمام تر کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور کوکب اور شہلا دونوں نے اندازہ کیا کہ انھیں اب ایک اور ڈبل ریٹ جیلٹ سیفٹی ریزر خریدنا پڑے گا تو کوکب کی تو حفاظتِ حسن میں نیندیں حرام ہوگئیں اور شہلا کا جی مرنے کو چلنے لگا۔

بھلا عورت تو درکنار ـــــ یہ داڑھی کم بخت مردوں کے لئے کیا کم عذاب ہے ـــــ آج کل نئی روشنی کی عورت پکار پکار کہہ رہی ہے۔ ع

"تم داڑھی مُنڈواؤ میں باز آئی خدا کے نور سے"

اور آج کل نئی روشنی کا نوجوان جس قدر اُس کے ہاتھوں نالاں ہے یہ کچھ اُسی کا جی جانتا ہے ـــــ اچھے خاصے شام کو مُونڈ کر سوؤ اور صبح کو آپ جہاں کی تہاں ملیں گی، صبح کو رگڑ رگڑا کر جائیے ـــــ اور سہ پہر کو آپ کو دار دپائے گا ـــــ اگر شام کو پھر کسی اول درجے کی سوسائٹی میں جانا ہے پھر چھیلئے مگر "بے غیرتی تیرا ہی آسرا ہے"۔ مُنہ اندھیرے آپ سب سے پہلے صورت پر سوار ہیں غرض سبزۂ آغازی کے بعد تو بھادوں کے ناگر موتھے کی روئیدگی مات ہوجاتی ـــــ اور اگر رکھ لی تو پھر اُس کا رکھ رکھاؤ مُونڈنے سے زیادہ مشکل ہے ـــــ عوام بیچارے کس میں ہیں وہ خدائی کے اجارہ دار جو نعوذ باللہ خدا کے ساتھ کے کھیلے ہوئے سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کی پاکی اور ثقائیت

میں بھی آج کل کی متمدن سوسائٹی کے نزدیک صرف داڑھی ہی ایک سیاہ یا سفید (جس رنگ کی بھی ہو) دھبّہ ہے اور خواہ وہ مرسرائزڈ (Mercerised) ہو یا سُوتی ـــــ اُونی ہو یا مونجھ کی ـــــ اصلی ریشم کی ہو یا سنئی کی ـــــ خوب کٹے ہوئے رام بانس کی ہو یا بنگالی جُوٹ کی اور امریکن ٹوشیپ کی ہو یا کریپ سول اسٹائل کی ـــــ ہاتھی کی پونچھ کا ماڈل ہو یا بڑھئی کے بسولے کے شکل کی، غرض سفید بھیڑ کے دودھ اور خالص آسمانی برف سے دُھلی ہوئی برسوں کی رکھی داڑھی ہو یا خضابِ لاجواب کی تختۂ مشق ہو یا خلیفہ جی کے علم سینہ والے نسخے کے دسمے کی رنگی ہوئی ع

کہ ہے یک قلم زرد سُرخ و بنفش ہو

(ورنہ جیسا بھی رنگ دیجائے) ـــــ محاسن کی انتہائے ژولیدگی سے فولادی تاروں کے بنائے ہوئے زرہ بکتر یا کسی برائیڈل بیڈ کی میٹنگ کا نمونہ پیش کرنے والی داڑھی ہو۔ تاپیچ در پیچ پیچاں کی بالیدگی کا سبق پڑھی ہوئی ہو ـــــ اور خواہ افریقن گوریلا والی گول اور نرائی بھابھر کے بوڑھے نیل گائے والی لمبوتری داڑھی اور براقفش نوکیلی چونچدار داڑھی ہو، یا "نکہ در سایۂ او بچہ نہد نرگوشے"، جھاڑ جھنکار ستیارتھی داڑھی ہو اور خواہ کبوتر کے انڈے سینے کے قابل پورا پورا گھونسلا ہو یا من وعن بئے کی حونچ ہو یا سردار جی کی وہ داڑھی جس میں کچے ناریل کی طرح کھوپڑی اور داڑھی کے اُلٹے سیدھے کی

تمیز ہی نہ ہو۔ یا وہ متبرک داڑھی ہو جس میں فرشتے آسمان سے اُتر کر جھولا جھولتے ہوں یا دونوں کلّوں پر گوری شنکر اور کنچن چینگا اور ٹھوڑی پر وادیٔ تبت کا پورا پورا نقشہ راجپوتانی و پٹھانی داڑھی ہو ـــــ یا عنفوانِ شباب کی سبزہ آغازی سے سنِ کہولت کی آخری منزل تک اُسترے یا قینچی کی بے مرہون منت خودرو نرم نرم ریش مبارک ہو ـــــ یا "بٹیر کی دُم" فرانسیسی داڑھی ہو ـــــ اور خواہ ظہیر فاریابی کی تمسخرانہ شاہی عرض داشت میں پیش کردہ وہ سفید داڑھی ہو جو خود بھی جنت میں جائے گی اور اُس کے تصدق میں کالی داڑھی بھی جنت میں جائے گی اور پھر اس طبائع شاعر کی بیان کردہ موئے آتش دیدہ کے مجموعے کی زنجیر مسلسل حنائی داڑھی ہو یا تختۂ دار پر زندہ دل سر ٹامس مُور والی گریہ کنان و امان چاہنے والی داڑھی ہو ـــــ مگر بیسویں صدی کے وسط میں داڑھی ہے "ٹٹی" شکار کھیلنے کی ـــــ "آلہ" ہے دوسرے کی ذہنیت میں نقاب لگانے کا ـــــ "سائن بورڈ" ہے ریاکاری کا ـــــ یہاں تک کہ اُس کے وجود سے گھبرا کر اُن شہنشاہانِ عظّام نے جنھیں اپنی خاندانی روایات کے مطابق داڑھی رکھنی ضروری تھی ـــــ اُن امیر البحروں سے جنھیں داڑھی کے رکھ رکھاؤ کے لئے مثلِ رفیقۂ حیات کے وظیفہ ملتا تھا ـــــ ان پر جلال اور تقدس مآب مصری و ترکی علماء نے

اور نصاریٰ راہبین نے جن کی ایک مٹھی میں داڑھی اور دوسری میں ملکوں کی سرحدیں اور قوموں کی تقدیریں رہی تھیں۔ زمانے کے مطالبے کے جھگڑوں میں یہ خس وخاشاک اپنے سامنے سے اُڑتے ہی دیکھا۔

بھلا شہلا اور داڑھی!!——کوکب ہی اس سے کیا کم نالاں تھا۔ کچھ ہو جائے سردی ہو یا گرمی،—— اولا گرے یا پالا،—— کوئی مرجائے یا کہیں شادی ہو——خواہ بحیثیت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ شہر میں رام نومی اور محرم کے جلوس پر فائرنگ کرانے جانا ہو یا کسی نمائش یا ٹورنامینٹ کے چندے کی پبلک میٹنگ اٹنڈ کرنا ہو،—— بیڈ روم سے اُٹھ کر ڈرائنگ روم تک سلام لینے جانا ہو یا وزیر اعظم و کمشنر صاحب کے برآمدے میں کی سب خاک جوتوں میں لپیٹ کر لانا ہو مگر صبح تڑکے اُس کے تمدّن کا تقاضا تھا کہ بغیر ہی کلّی کے چہرے پر دائیں سے بائیں تک ہاتھ پھیرے اور آئینہ کے سامنے صابن اور برش سے دھینگا مشتی کر کے کھُرچا کھُرچی کا بازار گرم کر دے

اب ذرا اندازہ کیجئے اس بے چاری قانون کی ذمہ داریوں کا اس خصوص میں جو خیر سے ابھی عمر کی بائیسویں بہار لوٹ رہی ہوں، جنھیں اپنی تندرستی اور اپنے صاحب کے انگریزی پریسٹیج کی حفاظت اور رکھ رکھاؤ میں ایک متمدّن خاتون اور ایک اعلیٰ

سا ملی عہدہ دار ہونے کی وجہ سے سوسائٹی اٹنڈ کرنا فرض ہو۔ اور جس کے یہاں "عصمت بی بی ست از بے چادری" سے نہ تو اپنے دل ہی کو مطمئن کر سکتی ہوں اور نہ اپنی سوسائٹی کو ہی ـــــ اور جوان ـــــ کو پہنچ گئی ہو کہ سوسائٹی میں مُنھ دکھانا تو درکنار سگے شوہر سے جسے پردہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہو اور نوکر تو نوکر نوکرنیوں سے مُنھ چھپانے کو جی چاہتا ہو۔

مسز شہلا کو کب کے دونوں رخسار کئی مہینے تجربہ کار و ماہر ڈاکٹروں کے تختۂ مشق رہنے کے بعد بھی اس خس و خاشاک سے گلو خلاصی حاصل نہ کر سکے اور دونوں میاں بیوی بلکہ اب میاں بیوی کا ہے کو اچھے خاصے میاں میاں اپنی حرکت پر نادم عجیب چہ کنم میں اپنی اپنی جگہ گرفتار خاموش و متاسف گھر بیٹھ رہے اور شہلا جلسوں کی رونق، کلیوں کی روشنی، پارٹیوں کی جان شہلا کو اچھی خاصی کونے پڑ گئی ـــــ اور ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کے ع ـــــ مُنھ پھیر لیا ہم نے تو دنیا بھی نہیں ہے" ـــــ کے سہارے ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کے زندگی کے دن کاٹنے کو رہ گئی ـــــ

خواہ مغرب زدگی کے سیلان نے گھر کو بُنیادوں سے لے کر بُرجیوں تک ڈبو دیا ہوتا ہم ہندوستانی ترقی یافتہ عورت ہر چیز سے پیچھا چھڑانے کے بعد بھی ابھی تک کانچ کی ہتھکڑی سے

یوں تو ہر عطائی علاج سات، چودہ، اکیس اور حد ہی چالیس دن تک کے کورس کا علم سینہ میں بتایا جاتا ہے مگر منہاری کے اس عجیب و غریب مجرب نسخے کا اثر دو ہی ہفتہ میں ظاہر ہو گیا جس جڑ پر ایک مرتبہ اچھی طرح راکھ گئی وہاں پر پھر بال نہ جما ـــــ اور دوسری تیسری مرتبہ میں چہرے سے روئیدگی کی صلاحیت تو بالکل ختم ہو گئی مگر مجموعی طور پر رخساروں اور بالائی ہونٹ پر چوبیس گھنٹے کے کٹے ہوئے شیو والی کیفیت باقی رہ گئی ـــــ خیر اس رہی سہی کالونچ پر ولایتی غازوں اور مختلف قسم کے سائنٹیفک بھپاروں اور کریموں کی مدد سے غالب آجانا کوئی بڑی بات نہ تھی اور مستقل کوششوں کے ساتھ ساتھ روزمرہ صبح شام کی استرکاری کے بعد نکلنے بیٹھنے کے قابل تو صورت اُلٹی سیدھی ہو ہی جاتی تھی۔ دونوں میاں بیوی نے خدا کا شکر ادا کیا۔

"رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت"

اور چند مہینے شہلا ولایتی غازوں اور پوڈروں کی بھرمار سے اپنے بدنسبی چہرے پر سُرخی سفیدی پھیرے رہی مگر مشہور بات ہے لاکھ من کا بن ایک کائے کمل کو سپید نہیں کر سکتا ـــــ تاہم وہ اپنی ڈاڑھی کے غائب ہوتے ہی جوں ہی ذہنی طور پر مطمئن ہوئی تو اُس نے اپنے نوشگفتہ داخلی پھول پھر کھلے ہوئے پائے ـــــ مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے تحت الشعور میں ایک نامعلوم خوف، ایک بے آواز ماتم، ایک ناقابلِ تفصیل انتشار، ایک بے وجہ گریز اور ایک نامعلوم

انتظار کی خلش بھی متحرک پائی ـــــ اپنی تمام تر نوزائیدہ کیفیتوں اور اُمنگوں کے ساتھ ساتھ وہ ایک قسم کے خار سے بھی کبھی کبھی وقت دوچار ہو جاتی ـــــ کبھی کبھی اُس کے مُنہ کا مزہ ایسا ہو جاتا جیسے کسی نے کونین میں شکر ملادی ہو ـــــ جیسے وہ ایک ایسی چیز کی تلاش میں ہے جسے وہ اپنے ذہن میں تشکیل بھی نہیں کر سکتی وہ اپنے حسات کو الفاظ تو درکنار الفاظ کا بھی جامہ پہنانے سے قاصر ہے۔

اُس نے اندازہ کیا کہ بنگلہ کے پُرسکون کمپاؤنڈ اور سول لائن کی سنسان چوڑی چکلی کھلی شاہراہوں سے جگمگاتی گنگناتی تماشہ گاہوں اور کھلکھلاتے گونجتے کلبوں اور جلسوں تک غرض جدید تہذیب و تمدن کی قوسی روشنیوں کے عکس سے جگمگاتی دنیا کا ہر عصر تنگ سا معلوم ہونے لگا اور جاڑا ختم ہوتے ہی تو اسکا یہ انتشار ؎

اک مرض تھا پاؤں میں وحشت اثر چکر قلب
جب ترقی کر کے پہنچا سر میں سودا بن گیا

جیسے اُس کے سینے کے صندوق اور دماغ کی کوٹھریوں میں سے اُسے کوئی پکارتا ہے ـــ کیا ؟! اور کون ؟! ـــ یہ کچھ نہیں معلوم!۔

بہار کا موسم شروع ہوتے ہی کسی نتیجہ پر پہنچ کر اُس کے دل میں ایک خواہش جاگ اُٹھی ـــــ تبدیلِ آب و ہوا جیسے اُس کے اندر سے کسی نے پکارا ـــــ اور اگرچہ

ع ہر سوختہ جان کہ بہ کشمیر در آید
گر مُرغِ کباب است بہ بالُ پر آید

کے قول کے مطابق تو مرض بالیدگی و ترقی کا امکان تھا مگر شہلا یہ اُمید قائم کئے ہوئے تھی کہ بالوں کی روئیدگی جو اُس کے رنگِ دروں پر مستقل ایک قسم کا جلا ہوا اثر چھوڑ گئی ہے کشمیر کی آب و ہوا اُس کی اصلی صورت پھر واپس دلادے گی اور یک سوئی و تنہائی اُس پر ذہنی و جسمانی ہر اعتبار سے اچھا اثر ڈالے گی ـــــ بھلا کوکب کو ایسی رومانٹک اسکیم میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا اُس نے بھی ساتھ چلنے پر آمادگی ظاہر کی ـــــ مگر بندگی و بے چارگی ضلع کے اندر کچھ ایسے نازک حالات پیش تھے کہ جن کی وجہ سے کوئی لمبی چھٹی لے کر سیزن یا مہینہ دو مہینہ تو درکنار وہ شہلا کو کشمیر لے جانے تک کے لئے ہفتہ عشرہ کے لئے بھی رخصت حاصل نہ کر سکا اور مجبوراً شہلا کو با دلِ ناخواستہ اور با چشمِ نم تنہا ہی رخصت کرنا پڑا۔

تین چار مہینے کی صبر آزما جدائی کے بعد کوکب کو تار ملا :۔

"میں مع ایک لیڈی کمپنین (Ladi Companion) کے آرہی ہوں" (Ladi Companion) کے نام پر پہلے تو کوکب کا کچھ ماتھا ٹھنکا ـــــ مگر پھر بیوی سے زیادہ بیوی کی ساتھن کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ بیگم صاحبہ تشریف لائیں اور صاحب نے پہلی ہی نظر میں اندازہ کر لیا کہ پوری بورڈ میں گرفتار

ہو گئے تھے کہ چونکہ اس چھوکری کے ساتھ لانے کا مقصد ہی مجھے خوش اور مطمئن کرنا ہے لہٰذا اس خصوص میں شہلا انھیں قصداً آزادی بھی دے دیگی مگر یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس نکلا، کوکب نے بیوی کے اس لیڈی کمپینین کے ساتھ لانے کو جس شبہ کی نظر سے دیکھا تھا وہ اس کے بالکل خلاف ثابت ہوا۔ شروع میں کچھ عرصہ جانبین کو عجیب بیگانگی کے عالم میں گذرا اور کوکب اس چیز کو اپنی اُمید کے عین مطابق اور اپنے مقصد کی نیک فال سمجھ کر بیوی کی ساتھن کی جانب متوجہ ہوا اور اس کی جانب پہلی ہی نظرِ التفات میں شہلا نے اندازہ کر لیا کہ اُس کا شوہر اُس کی کمی اس کی ساتھن سے پوری کرنی چاہتا ہے تو اُس نے اندازہ کیا کہ اُس کے اندر ایک عجیب و غریب جذبہ متحرک ہو گیا۔ اور بجائے مخصوص نسائی حسد کے غیض و غضب اور رقابت کی آگ بھڑکی یہاں تک کہ وہ عورت کی حدود سے باہر پہنچ گئی جیسے وہ یک دم مارنے مرنے پر تُل جائے بہت جلد کوکب نے اندازہ کر لیا کہ اس کی رفیقۂ حیات کے اوپر قدرت اپنی ستم ظریفیوں کا اتمام کر رہی ہے اور صریحاً اسباب کی تاثیر چھین کر اپنی نُدرت اور صناعی کی اخیر ترین منزل پر پہنچ رہی ہے اور اُس کی بیوی کو فاعلی قوتوں نے سرفراز کیا ہے۔

اگرچہ ابھی تک شہلا کے پاس سوائے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنے یا وقتاً فوقتاً تھوڑے بہت ـــ اور کچھ عجیب اور بے معنی

اور مُہمل سے اختلاط کے کشمیرن کا کوئی اور مصرف نہ تھا اور صاحب غریب کے پاس سگی بیوی کا یہ بھی نہیں مگر اس پر بھی شہلا اپنی ساس پر صاحب کی ملکیت تو درکنار ایک ایسی ویسی نظر بھی برداشت نہ کرسکتی تھی۔ اور بہت جلد صاحب نے اندازہ کرلیا کہ اب اُن کا اور بیگم صاحبہ کا یہ میاں بی بی والا ڈھونگ عملی طور پر چلنا ناممکن ہے۔ اور اُس کے بعد اُس نے واقعات کیوں بلکہ حادثات کو دوسرے پہلو سے پرکھنا شروع کیا اور بہت غور و خوض کے بعد وہ ایک نتیجہ پر پہنچا۔ جہاں تک پرائیوٹ زندگی کا تعلق ہے اس پر غور کرکے کوکب نے صبر کرلیا۔ اب اسے اپنے دونوں بچّوں کے مُستقبل اور خود اپنی سوشل پوزیشن کے برقرار رکھنے کا خیال آیا اسے احساس تھا کہ ماں باپ کے اعمال عادات اور امراض تک کا اولاد پر جسمانی ذہنی اور سماجی طور پر کس درجہ اثر پڑتا ہے وہ خوب سمجھتا تھا کہ وہ دنیا بھر کے قصّے نبٹانے اور ڈھائی لاکھ کی مردم شماری کے ضلع کی باگ ہاتھ میں رکھنے کی روٹیاں پاتا ہے۔ خود اُسے ایسی حالت میں اپنی پوزیشن کے رکھ رکھاؤ کا بڑا لحاظ تھا لہٰذا اُس نے اپنی گھریلو زندگی پر لعنت بھیج کر اپنی حال اور اپنے دونوں بچّوں کے مستقبل کو برقرار اور کامیاب رکھنے کی کوشش کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اور اُس نے غور کیا کہ پورے ایک سال سے اس کے گھر کا ماحول گڈبڈ ہوتے ہوتے از فرش تا عرش ساری کی ساری فضا مکدر ہوکر رہ گئی ہے

اور اُس نے اندازہ کیا کہ اُنھیں ذمہ داریوں کے احساس نے اُسے ایک بھاری بھرکم صاحبِ ظرف انسان کی طرح اس سبکو برداشت کرایا ہے اور اُس نے جب یہ اندازہ کرلیا کہ ہلا سے بیوی نکرے میرے جنسی جذبات کا خیر مقدم مجھے دنیا کے اندر ایک کامیاب انسان کہلانے کی خاطر یہ ایثار بھی کرنا پڑے گا۔ اور باقی ماندہ زندگی اسی طرح تمام حالات کو نباہنا ہی پڑے گا۔

شہلا اور کوکب دونوں خاموشی اور انتظار کی اخیر ترین منزل پر پہنچ چکے تھے اور ہر لمحہ ایک دوسرے کے مُنہ سے کچھ سُننے کے لئے آواز کی بے چینی سے منتظر سے تھے وہ دونوں ایک دوسرے کی پوزیشن اور ارادے کو اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے اور فیصلہ کُن مکالمہ کی سخت ضرورت سمجھ رہے تھے۔ تقریباً ایک ماہ سے اُن کے گھر کی فضا سے قہقہہ کا نغمہ تو درکنار مسکراہٹ کی چمک بھی معدوم ہوگئی اور کوکب کو معتبر ذرائع سے اچھی طرح معلوم ہوگیا تھا کہ شہلا عنقریب سوسائٹی گھر شوہر بچّوں سب پر لات مار کر اپنی آبائی زرعی جائداد کے سہارے زندگی گذارنے کے لئے دیہات کی پُرسکون اور خاموش فضا میں جہاں "ہیچ آفت نہ کند گوشۂ تنہائی را" کا مضمون ہو اپنی ساکھن کی معیت میں سکونت اختیار کرنا چاہتی ہے اور جو کچھ وہ بن رہی ہے اُس کو چھپانے کی بجائے اُس کے اظہار میں فخر سمجھتی ہے اور جب اُس کے ارادے کی سُن گُن پاکر کوکب نے بچّوں

مسئلہ پر غور کیا تو اُس نے شہلا کے رویّہ اور انداز سے کچھ ایسی بے تعلقی محسوس کی کہ جیسے وہ ان دونوں کو بھی اپنا بچہ تصور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی اور خود کو کوکب غریب کے شوہر محسوس ہونے کا معاملہ تو اظہر من الشمس تھا ہی۔

بس ایک اوّل اور آخر فیصلہ کُن گفتگو کی ضرورت وہ دونوں پہلے ہی سے اپنی اپنی جگہ پر محسوس کر رہے تھے اور جب خاموش داخلی جوش و خروش پورا پورا بڑھ گیا تو تابکے بالآخر لاوا پھوٹ ہی پڑا کوکب ہی نے قفلِ خاموشی توڑا۔

"دیکھو شہلا ایک مدت سے ہم کو ایک دوسرے سے گفتگو کرنے کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی ہے شاید بلکہ یقیناً تمھیں بھی اس کا احساس ہوگا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے مُنھ سے کچھ آغاز کے منتظر سے تھے۔ ہے نا۔"

"جی ہاں کہیئے کہیئے!" شہلا نے بڑے ضابطہ کے لہجے میں اپنے روزمرّہ کے انداز سے بالکل علیٰحدہ کچھ تجارتی طرز سے کہا اور شہلا کے مُنھ سے آنکھ چار ہونے کے بعد سے اب تک پانچ سالہ ازدواجی و رومانی زندگی میں "جی ہاں کہیئے کہیئے کے ضابطہ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے الفاظ سُن کر وہ اُچھل سا پڑا اور اک آن کی آن کے لئے اُس کے چہرے پر ایک رنگ سا آگیا اور اُس نے فوراً سنبھلتے ہوئے کہا:۔۔۔۔۔ "دیکھو میری شہلا

یہ تو شاید تم سمجھ ہی گئی ہوگی کہ شاید قدرت کو یہ منظور نہیں ہے کہ ہم تم اب ہر جہتی طور پر میاں بیوی بن کر آئندہ زندگی گذار سکیں۔ جنسیات اور تعلقاتِ زن و شوئی اس اہم پلان پر جو ہمارے سامنے ایک مدت سے زیرِ غور تھا اچھی طرح اور ہر پہلو پر نظر ڈال کر اس مسلمہ نتیجہ پر تو میں پہنچا ہوں جسے میں سمجھتا ہوں کہ تم بھی گو زبان سے نہیں مگر عمل سے آپریشن کے بعد سے اب تک مختلف صورتوں سے تسلیم کرتی رہی ہو اور اب جنسی تعلقات کا اُلٹا سیدھا وہ ایکٹ جو تم کشمیر جانے سے پیشتر تک شاد و ناشاد نباہتی رہیں تمہارے بس کا روگ نہیں رہا۔ خیر کوئی بات نہیں، یہ ہمارے بس کی چیز نہیں، دُکھ اور بیماریاں خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہم نے حُسن و تندرستی کی حفاظت کا سامان کیا تھا یہ کیا معلوم تھا کہ اس سے یہ مصیبت نازل ہو جائیگی مگر علاوہ ان چیزوں کے ہر انسان کے ساتھ کچھ اور ذمہ داریاں اور احساسات بھی ہیں اور یہ کہتے ہوئے کوکب نے شہلا کا بُشرہ کنکھیوں سے بھانپا۔ اور پھر ذرا احتیاط کے ساتھ گفتگو شروع کی:

"ہاں پیاری شہلا تو میرا مطلب یہ ہے کہ ہر بنی نوع انسان بلکہ ہر جاندار کے علاوہ جنسی پوزیشن کے اور بھی کوئی پوزیشن ہوا کرتی ہے نا؟"

کوکب تقریباً ایک منٹ تک خاموش رہا ـــــ اور شہلا نے جیسے کچھ خشکی کے انداز سے کہا:

"ہاں تو پھر؟ ـــــ اس سے کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"میری شہلا! میرا مطلب یہ ہے کہ کشمیر کی واپسی کے بعد سے جو تمھارے اندر ایک نیا ذہنی انقلاب رُونما ہو رہا ہے یہ غور کرو کہ ہماری سوشل لائف کے لئے یہ کس درجہ خوفناک ہے۔"

"جی صحیح ہے — مگر! — مگر پھر، پھر

جب دل نہ رہا تو اُمید کیسی ؟ جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

آخر اس سوشل لائف سے مجھے دلچسپی ؟ — اور کیوں —" شہلا نے شدید تر انداز میں جواب دیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ وہ معاہدہ جو میاں بیوی خطبۂ نکاح کے وقت کرتے ہیں ہماری مادی دنیا کا اہم ترین معاہدہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ جنسی تعلقات اُس کی جان ہوتے ہیں اور جنسی تعلقات ہی وہ کیلی ہیں جس پر ابتدائے آفرینش سے ہمارا کرۂ ارض گردش کرتا رہا ہے — شاید تمھیں یہ نہیں معلوم ہے کہ گندم کھانے کے بعد آدم کا جنسی جذبہ بیدار ہو گیا اور پھر اُس کے لئے خلاق کو دنیا کی بنیاد ڈالنی پڑی — لہٰذا اس میں شک نہیں کہ انسان حیوان اور بلکہ نباتات میں بھی سب سے زیادہ اہم اور ناگزیر اور عین منشائے قدرت کے مطابق ہماری دنیا میں جنسیات ہی ہیں اور دیگر متعلقاتِ زندگی کی اُس کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت ہے مگر شہلا دیکھو دیگر متعلقاتِ زندگی بھی فطری طور پر اگر غور کرو تو اس سے کم اہمیت نہیں رکھتے — دیکھو خدا تعالیٰ انسان اور حیوان دونوں میں یہ جذبہ

یکساں پیدا کیا ہے مگر حضرت آدم سے لیکر تمام بنی انسانوں ہی میں پیدا کئے لہٰذا ظاہر بات ہے کہ اس جذبہ کو بھی صحیح راستے پر لگایا اور وہ روایت کہ قابیل اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو اسپر حرام تھی اس کی بنا پر دنیا میں پہلا قتل اسی قانون شکنی کے ماتحت ہوا۔ اس کے علاوہ مذاہب عالم نے دوسرے متعلقاتِ زندگی کی بھی اہمیت اس سے کم نہیں رکھی اگرچہ ہماری مادی دنیا بھی انھیں جذبات کا نتیجہ ہے جیسا کہ میں نے پہلے کہا مگر ایک درخت کی شاخ پھول پھل کی اہمیت اس کی جڑ سے کیا کم ہے بلکہ ایک صورت میں جڑ شاخ اور پھول سب کا وجود پھل کی خاطر ہے تو میرا مطلب یہ ہے کہ کیوں نہ ہم ایک کامیاب ساتھی کی طرح سوسائٹی اور دنیا کے اسٹیج پر میاں بیوی کا پارٹ جہانتک دیگر متعلقاتِ زندگی کا تعلق ہو کامیابی کے ساتھ کھیل کر گذار دیں۔"

کچھ عجیب بے معنی سے الفاظ شہلا کے کانوں کو معلوم ہوئے جیسے یہ الفاظ کہنے کا کوکب کو کوئی حق ہی باقی نہیں رہا۔ اُس نے اپنا تحت الشعور ان ہم خیالی، یکدلی اور اپنائیت والے احساسات سے بالکل عاری پایا جن کی بنا پر کوکب کو یہ الفاظ کہنے کا حق پیدا ہو سکتا تھا اُس نے نہایت سنجیدگی سے ایک دُکاندار کی طرح کہا:

"دیکھیئے مسٹر کوکب شہلا اب شہلا نہیں" اور جیسے اسکے اندر سے کسی نے پکارا "اور نہیں معلوم کہ کون!۔۔۔ اور کیوں!۔۔۔ اور کیا؟!"

ایک منٹ کو کب شہلا کے مُنہ سے کچھ اور سُننے کا منتظر رہنے کے بعد بولا: "دیکھو شہلا میں تمھارے راز کی تہ تک پہنچ گیا ہوں اب میں تمکو اپنی اور تمھاری پچھلی محبتوں کا واسطہ دلا کر کہتا ہوں کہ تم کم از کم میری ہی پوزیشن پر رحم کرو دیکھو ع جنکے رُتبے ہیں اُن کی سوا مشکل ہے اس خصوص میں ذرا میری مشکلات اور نازک پوزیشن کا خیال کرو۔ ان حالات کی خبر جب موٹی موٹی سرخیوں کیساتھ اخباروں میں شائع ہوگی اور چوراہوں پر لونڈے آواز دے دیکر اخبار بیچیں گے کہ "ڈپٹی کمشنر کی بیوی عورت سے مرد ہوگئی" تو مجھے سوائے چُٹکی بھر زہر کھا کر سو رہنے کے اور بھی کچھ مُضر ہوگا؟"

شہلا نے کہا: "مگر جیسی ظاہری طور پر مجھ میں تبدیلی واقع ہوئی ہے اس سے کہیں زیادہ داخلی انقلاب میرے اندر برپا ہے۔ اور اسی بنا پر مجھے معاف فرمایئے آپکی یہ باتیں بالکل بے معنی اور بے وزن معلوم ہوتی ہیں دراصل مجھے اپنے ماضی سے ذرہ برابر بھی دلچسپی یا لگاؤ باقی نہیں رہا اور میں اپنا ماضی تصور کرنے اور اس سے متاثر ہونیسے بالکل قاصر ہوں"۔

ہوشیار اور لسان بیرسٹروں اور وکیلوں کی جرح اور بحث کو چٹکیوں اور باتوں میں اُڑا دینے اور کاٹ دینے والے مجوز عالی عہدہ دار نے یہ رنگ دیکھکر دوسرا پینترا بدلا اور وہیں سے بات کا رُخ بدلتے ہوئے اُس نے رباب اناث کے نازک ترین تاروں کو چھیڑا اور اپنے دونوں بچے سامنے طلب کئے اور پھر سلسلۂ کلام جاری کیا اور یہ وہ نغمہ تھا جو سخت دل سے سخت دل

عورت پر رقت طاری کئے بغیر نہ چھوڑتا۔ اُسنے کہا:

"قدرت نے جسطرح ان دونوں بچّوں کی جسمانی پرورش اور پرداخت تمھارے اوپر عائد کی ہے اسیطرح انکی مدنی اور سماجی ذمہ داری بھی تمھارے سر ہے اور یہ تمھارے پاس تہذیب و تمدن کی معصوم اور پاک امانت ہیں بلاسے تم میری پوزیشن کا ذرا بھی لحاظ نکرو اور میرے اور اپنے رشتے کا یہی پہلو دیکھکر کہ یہ صرف ایک زبانی اور ذہنی معاہدہ کی رُو سے جڑا ہوا تھا اگرچہ اہمیت اُسکی بھی تمھارے گوش گذار ابھی کرچکا ہوں خیر ہٹاؤ چھوڑو اسکو مگر تم ان بچوں کو فراموش نہیں کرسکتیں جو قدرت نے تمھارے ہی جسم کے حصّے اور جگر کے ٹکڑے بنائے ہیں؛ ذرا غور کرو کہ اگر ہم تم دونوں ملکر اس پارٹ کو بخیر و خوبی نہ نباہ سکے تو ان غریب معصوموں کا مستقبل جو تمھارے پاس خدا، انسانیت اور تمدن کی امانت ہیں کسقدر تاریک ہوجائیگا"

اور اسکے بعد شہلا کے دماغ کے اسکرین پر دو دُھندلی دُھندلی آؤٹ آف فوکس (Out of Focus) مٹی مٹی سی ننھی مُنّی تصویریں منعکس ہوکر تاریکی میں غائب ہوگئیں اور جیسے اسکے اندر سے آواز آئی ـــــ مگر یہ سب ذمہ داری تو اُس ـــ اُس ـــ اُس شہلا ـــ اس شہلا پر ـــ تھی ـــ اور اور ـــ وُ ـــ وہ ـــ شہلا تو ـــ دور ـــ بہت دور ـــ دور اور فریب کے پیمانوں کی ناپ سے مختلف دنیا ـــ میں ـــ نہ معلوم کہاں !؟ ـــ اور کیا ؟! اور کون ؟! اور کیوں ؟! ـــ اور شہلا بہت کچھ سنبھلی سمٹی سٹپٹی، اور چہرے پر ایک ہاتھ پھیر کر جمائی لیکر ذرا درست ہوئی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی

خون

انور

صفحات :- ۱۸

سخن شبوں محل
معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن

سآجا ایک اکیلے مسافر کی مخصوص خاموشی کے ساتھ جہاز سے اُتر کر جیٹی پر کھڑا ہوگیا۔ چودہ سال کے لمبے عرصے نے اُوڑم گھاٹ میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کردی ہونگی۔ وہ اِن تبدیلیوں پر غور کرنے کی بجائے اپنے لٹھے کی نئی شلوار پر جہاز کے گندے ڈیک سے لگے ہوئے تیل کے دھبّوں کو دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کیلئے اُسکے احساس کی چادر پر ملال کے بڑے بڑے دھبّے آگئے، ہگلی کی ہلکی ہلکی لہروں نے جہاز کی سیاہ کھُردری دیواروں سے ہولے ہولے ٹکرا کر اُسکی شلوار کے سیاہ دھبّوں کو مٹا دیا اُس نے بغل سے اپنی ململ کی، کلف سے اکڑی ہوئی، نئی پگڑی کو نکالکر دیکھا اُسکا دماغ اُسکو یہ نہ بتا سکا کہ کلف نے اُسکی پگڑی میں بھی ہگلی کی لہریں پیدا کردی ہیں، لیکن جب اُس نے اِس پگڑی کو جہلمی انداز میں اپنے سر پر باندھ لیا تو

اُسکے دل نے محسوس کیا کہ وہ ہنگلی کی لہروں میں نہا رہا ہے۔ ایک دفعہ پھر اُسکی طبیعت میں دبی دبی مسرّت کا خاموش جیسا ساکن جیسا طوفان برپا ہوگیا اور اُس نے لاشوں پر اِدھر اُدھر حرکت کرنے والی اونچی اونچی کرنیوں کی طرف دیکھنے کی بجائے پاس سے گذرنے والے تیل سے بھیگے ہوئے چیتھڑوں میں ملبوس ایک کالے مریاڑ، مریل مُردار بنگالی قُلی کو کہا:

"جوان تمکو معلوم ہے، پنجاب کو گاڑی کتنے بجے جاتی ہے"۔

قُلی نے بیڑی کا ایک لمبا کش لیکر دُھوئیں میں سے جواب دیا۔

"ہمارے کو نئیں مالوم"۔

ساجے نے قُلی کو جانے سے روکنے کے لئے کندھے کے پاس سے اُس کی قمیص کا کپڑا پکڑ لیا۔

"اچھا یہ بتاؤ سٹیشن کو جانے والی سڑک کونسی ہے؟"

بودا کپڑا قُلی کے معمولی جھٹکے سے سرے تک پھٹ گیا۔ قلی کے کالے مُنہ پر زرد آنکھوں میں سُرخ خون اُتر آیا۔

"تُمارے کو ایک دپھے بولا ہم نئیں جانتا۔ پھر کائے کو پکڑتا؟"

ساجے کو غصّہ آگیا۔ اُسنے ہوا میں ایک مُکا بلند کرکے پنجابی اُردو میں کہا

"سُٹور — کا — پُتّور"۔

قُلی جلتی ہوئی بیڑی ساجے کے مُنہ پر مار کر رفوچکر ہوگیا۔

اگر ساجے کے پاؤں کے پاس اُسکا کالا ٹرنک نہ پڑا ہوتا تو وہ اُس قلی کے پیچھے بھاگ کر اُسکو دریا میں دھکّا دے دیتا۔ یا پھر کم از کم کسٹم والوں

میں سے تو ضرور وہ کسی ایک کو پیٹ ڈالتا اگر وہ جلدی سے اسکا چھٹکارا نہ کر دیتے، اچھا ہوا، سٹرینڈر روڈ کے سرے تک اُسکو غصہ چڑھا رہا۔ ورنہ وہ سٹیشن تک جانے کیلئے کسی رکشا والے کو آواز دے دیتا ــــــ ــــــ اور خواہ مخواہ روپے بارہ آنے کا نقصان ہو جاتا، وہ اپنی بغل میں ٹرنک دبائے جا رہا تھا۔

سٹرینڈر روڈ پر پہنچکر اُسکو ایک بنگالی بابو نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں سفید کھدر کی دھوتی کا ایک کنارہ، جسم چاولوں کی بادی سے پھولا ہوا کندھوں پر سر کی بجائے فٹ بال۔ ساجا اُسکے پاس چلا گیا۔

"یہ سڑک کہاں جاتی ہے بابو جی؟"۔

"آپکو کدھر جانے کو مانگتا مسٹر؟"

"سٹیشن"

"یہ سڑک تمہارے کو ہاوڑا برج لیجائیگا۔ برج کا دوسرا سائڈ ہاوڑا سٹیشن ملیگا"

ساجے نے سوچا کہ اگر وہ پانچ جماعتیں نہ پڑھا ہوتا تو اس بنگالی بابو کی طرح اُردو بولتا، اور نمبر ۹۴۸ کسطرح اُردو کی جگہ فنا پوٹا کرتا تھا، "ہم نے تمہارے کو بولیا ہمارے تاں پتھر کُٹ کُٹ کے ہتھاں میں چھالے پڑ گئے نے۔ اللہ نے تیرے کو جمعداری دئی ہے گرائیں ہو کے بھی آپ ہمارے لوگاں دا کھیال نہ رکھوں گا تاں ــــــ"

نمبر ۹۴۸ بھی جہلم کے ضلع کا رہنے والا تھا۔ بیچارہ اَن پڑھ، ساجا بھی اگر اَن پڑھ ہوتا تو وہ قیدیوں کا جمعدار نہ بن سکتا۔ اور گرفتار ہونے پر

اپنے آپکو سراج الدین ولد معراج الدین نہ لکھواتا۔ بلکہ ساجا ولد ماجا لکھواتا وہ زہریلی ہنسی والا تھانیدار۔ ساجے کو کئی دفعہ خیال آیا کہ تھانیدار کا بھی خاتمہ کر ڈالے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ انگریزی سے ڈر کر پانچویں جماعت سے نہ بھاگ اُٹھتا۔ جسطرح وہ قلی اُسکے مُکّے سے ڈر کر بھاگ گیا تھا بھاگ گیا نہیں تو وہ اسکی ریڑھ کی ہڈی توڑ ڈالتا اور پھر وہی پولس۔ پھر وہی چودہ سال یا شاید پھانسی۔ لیکن پھانسی کیوں ہوتی اگر وہ پانچویں جماعت سے نہ بھاگا ہوتا۔ شاید وہ تھانیدار ہو جاتا۔ یا کم از کم سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے انگریزی کے ان اشتہاروں کو تو پڑھ سکتا۔ چودہ سال پہلے جب وہ قیدیوں کی بندلاری میں اس سڑک سے گذرا تھا تو اُسے یہ خیال نہ تھا کہ یہ سڑک اتنی لمبی اور وسیع ہوگی۔ اوٹرم گھاٹ پر وہ جہازوں اور کرنیوں کو دیکھ کر یہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک طویل عرصے کیلئے اپنے عزیز وطن کو چھوڑ رہا ہے۔ جہاز، کرنیں، سمندر اور انڈمان۔

چاندپال گھاٹ کے سامنے پہنچکر اُس نے دم لینے کیلئے اپنے ٹرنک کو فٹ پاتھ پر رکھدیا۔ اپنی نئی سفید پگڑی سے اپنے مُنھ اور گردن سے پسینہ پونچھا۔ سامنے کی دوکان سے دو آنے کے چنے مول لئے۔ میونسپلیٹی کے ایک نلکے پر پانی پینے کیلئے چلا گیا۔ جب وہ ہاتھ دھو کر پانی پینے کیلئے جُھکا تو یکایک اُسکو کچھ فاصلے پر ایک رکشا جاتی دکھائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ رکشا والے کا پیچھے کی طرف سے تین چوتھائی حصّہ نظر آرہا تھا۔ ساجا پانی کو بھول کر رکشا والے کو غور سے دیکھنے کیلئے

آگے بڑھا لیکن رکشا ریڈ روڈ کی طرف مُڑ گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو کہا نہیں — نہیں

پانی پینے کے بعد اُسکو معلوم ہوا کہ اسٹیشن ابھی دور ہے۔ اُسکی دبی دبی مسرت پر بوجھ کا ایک ہلکا سا چھلکا آگیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اب وہ ٹرنک کے بوجھ کو نہیں اُٹھا سکے گا۔ اُس نے ایک رکشا والے کو بلایا۔ اپنا ٹرنک اُس میں رکھدیا اور خود اُس میں بیٹھ کر بولا "ہوڑا اسٹیشن"

تمام رستے اُسکو اپنے دل پر ایک غیر معلوم وزن کا احساس رہا۔

ہاوڑا برج پر پہنچکر معلوم ہوا کہ پنجاب میل روانہ ہوچکی ہے۔ ساجے نے ہگلی کی لہروں کی طرف دیکھا۔ ہگلی ساجے کی زندگی کے گھنے جنگل میں سے خاموشی کے ساتھ بہی جارہی تھی۔

اُس نے رکشا والے کو کہا "مجھے یہیں اُتار دے"۔

رکشا والے نے ٹرنک پُل کے ایک کنارے رکھتے ہوئے پوچھا۔ "رات کو کدھر سونے کا، دادا؟" ساجے نے اُسکی بات کا کچھ جواب نہ دیا رکشا والے نے رکشا کا کرایہ لیتے ہوئے رازدارانہ انداز میں پھر کہا "ہم بتائیں گا؟"

ساجے نے انڈمان میں کلکتے کے رکشا والوں کی بابت بہت کچھ سُنا ہوا تھا۔ اُس نے ایک دفعہ حقارت سے رکشا والے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ٹرنک پر جاکر بیٹھ گیا۔ رکشا والا چلا گیا۔

سامنے ہگلی پر نیا پُل بن رہا تھا۔ کتنا مشکل کام ہے پُل بنانا خصوصاً جب دریا کا طاس بہت چوڑا ہو۔ اُس پانی میں سُتونوں کی بُنیادیں کھوکھلی

کرتا رہیگا۔ پُل پُرانے ہوجایا کرینگے۔ اُنکی جگہ نئے پُل بنا کرینگے۔ وہ سامنے ہگلی پر نیا پُل بھی پُرانا ہوجائیگا ——

پھر اسکی جگہ ایک اور نیا پُل بنانا پڑیگا۔ کیا اُس نئے پُل پر بھی ساجا بیٹھے گا؟ لیکن ساجا اپنے لئے خود ایک نیا پُل کیوں نہیں بناتا۔ اُسکی زندگی کی بنجر زمین میں سے بھی تو ہگلی گذرتی ہے۔ اس ہگلی نے اسکی زندگی کی بنجر زمین کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان دو افتادہ حصّوں کو ملانے کیلئے ایک نئے پُل کی ضرورت ہے اور ساجا ہگلی پر بننے والے نئے پُل کی طرف دیکھتا رہا۔

آسمان پر شام کی شفق چھاگئی۔ بادلوں کی سُرخی نے ہگلی کے پانی پر سُرخی چھڑکدی۔ ساجے نے دیکھا کہ ہگلی میں خون بہا جا رہا ہے۔ خالص انسانی خون۔ وہی خون جس نے آج سے پندرہ سال پہلے اسکے کنویں کی مُنڈیر کو رنگ دیا تھا اور جس نے کنویں کی مُنڈیر سے بہہ کر کھیتوں کی طرف جانیوالے پانی کو ہگلی کے پانی کی طرح سُرخ کر دیا تھا۔ گودو کا خون اور گودو کے باپ کا خون، گودو جو کلکتہ سے کبھی کبھی گاؤں میں آکر سُوٹ بُوٹ پہنکر لوگوں کو کہا کرتا تھا کہ وہ اسکو گودو کی بجائے گوبند رام ورما کہا کریں گودو جو گاؤں کی بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کو کلکتہ کے خواب دکھا کر ان کو اکثر اپنے ساتھ بھگا لے جاتا تھا جو ساجے کے کنویں پر ہر روز اُسوقت منانے کیلئے آیا کرتا تھا۔ جب ساجے کی نوجوان خوبصورت بیوی' دارو' ساجے کیلئے کھانا لیکر آتی تھی ساجا اُسکی حرکت کو خوب سمجھتا تھا لیکن

گاؤں میں کوئی کسی کو اپنے کنویں پر نہانے سے منع نہیں کرسکتا۔ پھر جب ایک دن دارو کپاس کے کھیت کے پاس غصّے اور گھبراہٹ سے ہانپتی ہوئی دوڑی دوڑی آئی اور ساجے کو کہنے لگی: "گودو مجھے کہتا ہے میرے ساتھ کلکتہ چلو۔" تو ساجے کے آتش فشاں پہاڑ کی دبی ہوئی آگ بھڑک اُٹھی۔ وہ اس وقت ایک کلہاڑی سے اپنے کھیت کی باڑ کے چھدرے حصّوں میں کیکر کی جھینگیں لگا رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح کنویں کی طرف بھاگا۔ پہلا وار گودو کے سر کے پاس سے ہوکر اُسکے کندھے میں اُتر گیا۔ دوسرے وار کے وقت گودو لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گر رہا تھا اس لئے کلہاڑی اُسکے کولھے میں گڑ گئی۔ تیسرے وار کے وقت گودو کا باپ درمیان میں آگیا۔ پہلی ہی ضرب اسپر اتنی کاری پڑی کہ اُسکی گردن ایک طرف کو لٹک گئی اور وہ سیدھے گرے ہوئے گودو پر اوندھا گر پڑا۔ اسلئے بعد کی دو ضربیں بھی گودو کے بجائے گودو کے باپ پر ہی پڑیں۔ اسکے بعد گاؤں کے لوگ، وہ زہریلی ہنسی والا تھانیدار، مقدمہ اور پھر چودہ سال کی قید۔ کالے پانی کو جاتے وقت جب اُس نے اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو اُس نے کہا۔ "مجھے آپلوگوں کے آنسوؤں کا افسوس نہیں۔ اس بات کا افسوس ہے کہ جسکو میں مارنا چاہتا تھا وہ بچگیا اور جسکو میں مارنا نہیں چاہتا تھا وہ مرگیا۔ گودو بچگیا۔ گودو کا باپ مرگیا" جب اُس نے دارو کی سسکیاں سُنیں تو اُس نے کہا:۔ "دارو! چودہ سال کوئی بڑی بات نہیں۔ میرا انتظار کرنا؟" اور پھر جب

اپنی دو تین سال کی بہن نوری کی طرف دیکھا جو سب کو روتا دیکھکر چیخیں مار مار کر رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی "میں بھی ساتھ جاؤنگی میں بھی ساتھ جاؤں گی" تو اُس کے دل کے کسی کونے میں پہلی دفعہ یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید اُس نے غلطی کی ہے۔ اُس نے نوری کو اُٹھا کر گلے سے لگا لیا اور کہا "نوری — نوری — نوری" اور اُسکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے جنگل کی لہریں شاید اُن آنسوؤں کو نہ دیکھ سکی ہوں۔ کیونکہ شفق کی سُرخی سلیٹی ہوکر سیاہی مائل ہوگئی۔ گودو اور گودو کے باپ کا خون بھی دیر تک کنویں کی مُنڈیر پر جمع رہنے کی وجہ سے شام کے وقت سلیٹی ہوکر سیاہی مائل ہوگیا تھا۔ اُس نے اپنی پگڑی کے شملے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور جب اُس نے شملے کے اُس حصّہ کو دیکھا، جہاں اُس نے آنسو پونچھے تھے تو اُس نے دیکھا کہ اُس کا دل سلیٹی ہوکر سیاہی مائل ہوگیا ہے اور یہ سیاہی شام کی سیاہی کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وہ ڈر گیا۔ وہ ڈر گیا کہ کہیں رات نہ آجائے۔ اُس نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے سایوں کو اپنی پوری قوت سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی اور ایک دفعہ تو وہ ان بڑھتی ہوئی بھیانک تاریکیوں کو چیر کر اپنے گاؤں میں پہنچ گیا جہاں اُس نے اپنے گھر کی دہلیز پر دارو کو اپنی چودہ سال کے انتظار سے پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اُسکو چُومنے کیلئے بڑھا لیکن

یک بیک پُل پر بجلی کے قُمقُموں کی قطار روشن ہوگئی۔ اُس نے ایک ہارے ہوئے سپاہی کی دلدوز مایوسی کیساتھ اوپر کو دیکھا اور اُس کو یقین ہوگیا کہ رات آگئی۔

رکشا والے نے اُسی رازدارانہ لہجے میں کہیں سے آکر کہا "دادا"۔

ساجا چونک گیا اور اس سے پہلے کہ اُس کا دماغ اُسکے معاملے میں دخل دے سکتا اُٹھ کے کھڑا ہوگیا۔ "کہاں لے جاؤگے؟"

"فس کلاس پنجابن ہے — مس نیلم — کیسا پیارا نام ہے —"

کرائے کی کچھ باتیں ہوئیں اور رکشا چل پڑی۔

ہریسن روڈ

گرے سٹریٹ

سوناگچی

تھوڑی دیر کے بعد رکشا والے نے آکر کہا "ہم تمھارے کو کیا بولینگے دادا، تم بڑا لکی ہے، وہ سالہ سنیما جانے کو دیکھتا تھا۔ آؤ — آؤ —" اور ٹرنک اُٹھاکر آگے آگے چل پڑا۔

چودہ سال کے بعد ساجا پہلی دفعہ ایک ایسی رات کے دروازے پر آیا جس کے قفل کی چابیاں اُس کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ رات اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ اُس کے پیروں پر پڑی تھی۔ وہ اُسکو ٹھکرا سکتا تھا۔ اُچھال سکتا تھا جھنجھوڑ سکتا تھا۔ چاہتا تو قمقموں کی زرد روشنی میں رنگ دیتا۔ چاہتا تو اُسکو اندھیرے کے اتھاہ غار میں دھکیل دیتا۔ اختیار

کے اس احساس نے اُسکے جذبات میں آگ لگادی۔
گندمی رنگ کی ایک پنجابی عورت جس کا سب سے بڑا حُسن اُسکی گدرائی ہوئی جوانی تھا۔ اپنے ہوشربا سینہ کے ساتھ، اپنی بڑی بڑی معصوم آنکھوں کے ساتھ گہرے سبز دوپٹے میں آسمانی رنگ کی ریشمی قمیص میں اور ساٹن کی سفید شلوار میں، اُسکے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

"اندر آجاؤ — کیا سوچتے ہو؟ — اُداس ہو؟"

"نہیں تو"

وہ اُس کو بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی۔ ایک کرسی پر بٹھا دیا — کرسی کے بازو پر بیٹھکر اُس کی پگڑی کے شملے سے کھیلنے لگی اور پھر ہنس کر اُس کی رانوں پر بیٹھ گئی۔ ساجے میں اختیار کا احساس جاگ اُٹھا۔ اختیار کے اس احساس نے اُس کے جذبات میں آگ لگادی اور جذبات کی اس آگ نے اُس کو بے اختیار کردیا۔ اُس نے نیلم کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور اپنے ہونٹوں کے انگاروں کو اُسکے گالوں پر رکھدیا۔ ایک منٹ۔ دو منٹ۔ تین منٹ۔ وہ گھبرا گئی۔ اُس نے ایک دو دفعہ سی سی کی اور پھر یکایک اُوئی اُوئی کرکے اُس کے بازوؤں میں سے نکل گئی۔ وہ اُٹھکر اُس کے پیچھے بھاگا۔ ایک ہاتھ نیلم کی کمر میں چلا گیا، دوسرے ہاتھ نے بجلی کا قمقمہ بجھا دیا۔

کپڑوں کی سرسراہٹ — اور — اور —

پھر روشنی ہوگئی۔ ساجا اپنی گبرون کی قمیص کے بٹن لگا رہا تھا۔

نیلم آئینے کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی اور پریشان بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ دوبارہ میک اَپ کرتے ہوئے اُس نے کہا:

"سنو — ہم سینما جا رہے ہیں — سیکنڈ شو۔"

"نہیں نیلم، میں تمھیں نہیں جانے دونگا۔"

"میری سہیلی آیا ہی چاہتی ہے۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلوگے۔"

وہ اُس کے پیچھے جاکر کھڑا ہوگیا اور اُس کی بنگالی فیشن میں گُندھی ہوئی دو چوٹیوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ کچھ عرصے آئینے کے سامنے وہ اُسکے جسم کے مختلف حصّوں کو سہلاتا رہا، پھر وہ دونوں بستر پر لیٹ گئے اور امریکہ کے ایک رسالہ میں سے ننگی تصویریں دیکھنے لگے۔ ساجے نے انگڑائی لے کر کروٹ بدلی۔ اُس کا بازو بے خودی میں نیم عُریاں سینہ پر چلا گیا۔ رسالہ پلنگ سے نیچے گر پڑا۔ بجلی کا قُمقمہ بُجھ گیا اور پھر —

ایک عرصہ تک پُراسرار خاموشی کے بعد دونوں بستر پر لیٹے لیٹے باتیں کرنے لگے۔

"مجھے اپنا نام بتادو۔"

"نام پوچھکر کیا لوگی کل شام کو جا رہا ہوں۔"

"کلکتہ میں کیا کرتے ہو؟"

"یہاں تو میں آج ہی آیا ہوں۔"

"کہاں سے؟"

"کالے پانی سے۔"

"تم کالے پانی سے آئے ہو؟"۔

"ہاں"

"پھر تو تم ساجے کو جانتے ہوگے"

کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ سوال ساجے کے دماغ پر پتھر کی طرح گرا، وہ اُٹھکر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے ارادے پر زور دے کر اپنی حیرت کو تجسّس میں تبدیل کرلیا اور کمرے کا بلب روشن کرتے ہوئے کہنے لگا

"ہاں میں ساجے کو جانتا ہوں۔ وہ میرا دوست ہے"

روشنی میں بھی وہ بالوں اور کپڑوں کی پریشان حالت میں اُسی طرح بے حجابانہ بستر پر لیٹی رہی۔ اُس نے اپنے جسم کے اُن حصّوں کو بھی جنھیں آدمیوں سے چھُپایا جاتا ہے، چھُپانے کی پروا نہیں کی اور کروٹ لے کر اپنی ہتھیلی میں اپنا سر رکھے ہوئے بے پروائی سے باتیں کرتی رہی۔

"پچھلے سال میں اپنے گاؤں میں گئی تھی۔ ساجے کی بہن نزدیک کے گاؤں سے میرے پاس آئی اور مجھے کہنے لگی۔ تم کلکتہ میں رہتی ہو۔ کلکتہ کالے پانی کے پاس ہے۔ کالے پانی میں میرا بھائی رہتا ہے۔ اُس نے پچھلے پانچ سال سے ہمیں کوئی خط نہیں لکھا۔ اگر تم کو وہ کہیں ملے تو اُس کو میرا پیغام دے دینا۔

ساجا بے چینی کے ساتھ ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"ہاں، میں جانتا ہوں، وہ بڑا لاپرواہ ہے۔ اُس نے ضرور ایسا کیا ہوگا

اُس نے ضرور کوئی خط نہیں لکھا ہوگا۔"

"اُس نے مجھے کہا کہ اگر تم کو ساجا ملے تو اُس کو بتانا کہ ہمارے ماں باپ غم سے نڈھال ہوکر مرگئے ہیں۔ ہماری ساری زمین بک گئی ہے اُس کی بیوی دارو اُسی گودو کے ساتھ جس کو ساجے نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی، بھاگ گئی ہے ـــــ گودو کی بابت معلوم ہوا کہ وہ کلکتہ میں کوئی اچھا کاروبار نہیں کرتا۔ وہ وہاں رکشا چلاتا ہے اور بازاری عورتوں کا دھندا کرتا ہے۔ اُس نے دارو کو بھی بازار میں بٹھا دیا ہے ـــــ"

ساجے پر غشی کی سی حالت طاری ہوگئی لیکن زہر کے ان گھونٹوں کو جو ساجے نے پیئے تھے اُس کے چہرے پر ظاہر نہیں ہونا چاہیئے اس بازاری عورت کے سامنے اس کو یہ راز فاش نہیں کردینا چاہیئے کہ وہ بدکار عورت اُسی کی بیوی ہے۔ وہ دیوار پر ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔ لیکن اُس کو اُس میں اصلی نقوش کی بجائے ریڈ روڈ کی طرف مُڑنے والی رکشا دکھائی دی اور ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اُس کے کانوں میں کہہ رہا ہے۔

"ہاں ـ ہاں ـ"

نیلم کی آواز مدھم ہوگئی۔ اُس کے الفاظ بھیگ گئے۔

"ـــــ اُس نے کہا ساجے کو بتانا۔ اب میرا دنیا میں کوئی نہیں نمبردار کے بچے کھلاتی ہوں۔ گوبر کوڑا اُٹھاتی ہوں۔ گالیاں سہتی ہوں۔ مار کھاتی ہوں ـــــ"

ساجا بڑبڑا اُٹھا۔

"نیلم میں جاتا ہوں۔"

"کہاں؟"

"میں ابھی ساجے کو یہ سب باتیں بتا دوں گا۔ میں اُسکو مجبور کرونگا کہ وہ ابھی، اپنے گاؤں کو چلا جائے۔ اُسے رات ہونے سے پہلے چلا جانا چاہیئے تھا وہ مورکھ ہے۔ وہ نہیں جائیگا۔ وہ نہیں جائیگا۔"

نیلم حیران ہو کر بیٹھ گئی اور اپنے کپڑے سنبھالتی ہوئی بولی:

"تو کیا ساجا کلکتہ میں ہے؟"

"ہاں۔"

"تو اُسکو فوراً جا کر کہہ دو کہ وہ اپنے گاؤں کو نہ جائے۔"

ساجے نے ایک لمحہ خاموش حیرت سے نیلم کی طرف دیکھا اور پھر اُسی تیقن کے انداز میں کہا:

ساجا ضرور اپنے گاؤں کو جائیگا۔ کیا وہ اپنی بہن کی یہ حالت "

"بلکہ اُسکو اِن باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہ بتانا اور اُسکو گاؤں تو ہرگز نہ جانے دینا۔"

"کیوں نجانے دوں آخر؟"

"اُسکا گاؤں کو جانا بے سُود ہوگا۔ اُسکی بہن اُسکو وہاں نہیں ملیگی۔"

"کیوں نہیں ملے گی؟"

"میں اُسکی بہن ہوں۔"

ساجے کی کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔ اُس کا دماغ دُھواں بنکر کمرے میں

پھیلنا شروع ہوگیا۔ بجلی کی روشنی چھوٹے چھوٹے دھبّے بن کر اُڑنے لگی۔ اس رنگ برنگ دُھندلکے میں اسکو اپنے کالے ٹرنک کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ کالے ٹرنک پر اپنے ہاتھوں میں اپنی کنپٹیاں لے کر بیٹھ گیا۔

نیلم پلنگ کے پاس کھڑی ساجے کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

سیڑھیوں میں سے پیروں کی آہٹ نے ساجے کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ جذبات کے غاروں میں سے نکلنے کی کوشش میں اسکو کچھ راحت محسوس ہوئی۔

"نیلم ــــ جلدی ــــ جلدی ــــ نی ــــ لم"

اور دوسرے لمحے نیلم کی سہیلی دروازے پر آگئی۔ ساجے کے زخمی دماغ نے ایک اور تازہ زخم کھایا۔ درد کے رُکے ہوئے سیلاب میں بھیگی ہوئی آواز پھڑپھڑائی۔

"دارو ــــ"

اور دارو نے دروازے کی چوکھٹ کو مضبوطی سے پکڑ کر گرنے سے بچتے ہوئے حیرت آمیز مُردہ لہجے میں کہا۔

"ساجا!"

نیلم نوری بنکر تھرا گئی۔ اُسکے رُونگٹے اُسکے جسم پر دوڑنے لگے۔ اُسکے جسم سے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گہرائیوں کی طرف بھاگنے لگے اور جب نوری کو یقین ہوگیا کہ وہ عنقریب کسی بھیانک چٹان سے ٹکرا کر فنا ہو جائیگی تو اُسکے خشک گلے اور خشک ہونٹوں سے ایک دُل ہلا دینے

والی چیخ نکلی اور پلنگ کے بیک سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑی۔

"بھیا ــــ بھیا ــــ یہ کیا ــــ میرے اللہ ــــ میرے اللہ"

ساجا کالے ٹرنک پر پتھر بن گیا۔ اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کے سامنے انڈمان کے قیدی انسانی دماغوں کے پتھروں کو ہتھوڑوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔ رنگ برنگے دُھندلکوں اور روشنی کے چھوٹے دھبّوں کے درمیان ہگلی بہہ رہی تھی۔ ہگلی کی طوفانی لہروں پر ایک رکشا والا اپنی رکشا دوڑائے جا رہا تھا۔ نئے ہاؤڑا برج کے پاس ایک سمندری جہاز اُس رکشا سے ٹکرا کر ڈوب گیا۔ خزاں دیدہ جنگل کے تمام پتے جھڑ کر ہگلی میں بہہ گئے۔

چڑھاوا

پریم ناتھ در

صفحات :- ۱۶

وہ باریک ذرّے مینھ کی بوندوں سے ذرا ہی بڑے تھے۔ برف کے عام گالوں کی طرح زمین پر نہیں گرتے تھے، وہ تو اٹکھیلیاں کرتے ہوا میں چکر کاٹ کاٹ کر نیچے آرہے تھے۔ مُہم کے تین فرنگیوں نے ان ذرّوں کو خوب دیکھا، اُنکی اٹکھیلیوں کو سراہا، انکو کنواریوں سے تشبیہہ دی کیونکہ ان کی حرکتوں میں کچھ ویسی ہی جھجک تھی، جیسے زمین تک کا سفر کرنے کے بعد زمین تک پہنچ جانے کی انکی صلاح ہی نہ تھی —— تینوں فرنگیوں نے قدرت کی اس نقل کو خوب جی بھر کر دیکھا لیکن اُنھوں نے اپنے چھ قُلیوں کے زرد چہرے نہیں دیکھے جو ایک ساتھ زرد سے زرد تر ہوتے جارہے تھے۔

بڑے قلی ولی جُو نے فرنگیوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔

وہ اُنکی بولی کے کئی لفظ جانتا تھا۔ اِن لفظوں کو اس نے طرح طرح کے استعمال کیا اور اُنکو یہ سمجھانا چاہا کہ یہ پہاڑ "واوہ بال" موسم کا احترام نہیں کرتا تھا۔ اِس پہاڑ کے متعلق ہولناک کہانیاں سُننے میں آئی تھیں۔ یہاں بیچ گرمیوں میں برف گرتے سُنی تھی، پھر جب فضا میں برف کے ذرّے اسوقت موجود تھے ایک خاصی برفباری کا احتمال کیسے نہیں تھا؟ لیکن ولی جُو بولتا گیا اور فرنگی اُسکے آدمیوں سے تنبو اُکھڑواتے گئے، اور جب سامان اکٹھا ہوگیا تو برف جیسے ٹھنڈے اور بہرے فرنگیوں نے سامان اُٹھانے اور آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ ناچار ولی جُو نے اپنے آپکو اور قلیوں کو فرنگیوں کی رسّی میں جوتا اور فرنگیوں نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

فرنگی بہت دور سے اس بلندی کو سر کرنے آئے تھے۔ سائنس کی برکتوں سے پوری طرح مسلح تھے اُتند آندھیوں سے ٹکر لینے کے کرتب وہ جانتے تھے، فطرت کی نبض نبض کا اُنکو علم تھا، کتنی ہی چوٹیوں پر اُنھوں نے جھنڈے گاڑے تھے، کتنے برفانی دریاؤں کو عبور کیا تھا۔ برف کے ناچتے ہوئے ذرّے اُنکو کیا ڈراتے؟ اِس پہاڑ پر بھی وہ کئی دن سے لگاتار چڑھتے آئے تھے اور اب اُس بلندی پر پہنچ گئے تھے جہاں سے آگے چڑھنا واقعی دشوار تھا۔ وہاں سے آگے کئی ڈھلانوں پر جمی ہوئی برف کے تختے شیشے کی طرح چمک رہے تھے اور اُنکے پیروں کو کیا اُنکے سایوں تک کو سہنے کیلئے تیار نہیں تھے؟ لیکن رات میں برف کے اُن حسین ذرّوں نے اُنکی یہ مشکل بھی حل کی تھی جمی ہوئی

ڈھلانوں کی نوفناک پھسلن انہی ذروں نے چکپے چکپے ماردی تھی۔ پھسلتے
سشیشوں پر روئی کی مانند نرم نرم ملکی تہوں کا ایک غلاف سا چڑھ گیا تھا
جس پر قدم دھرنا نہ صرف آسان ہو گیا تھا بلکہ دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ وہ
فطرت کی اس بھول کا فائدہ کیسے نہ اٹھاتے ــــ؟

لیکن وہ باریک ذرے رفتہ رفتہ پھولتے گئے اور حقیقتاً برف
کے بڑے بڑے گالے اٹکھیلیوں بغیر جیسے مقصد کو لئے عموداً گرنے
لگے۔ تین فرنگیوں اور چھ قلیوں کے سروں پر اور اُن کی پیٹھوں پر برف
جمع ہونے لگی۔ فرنگی اس برف کو جھاڑتے ہوئے آگے بڑھتے گئے
اور قلی گاڑی کے پہیوں کی طرح ایک سمت فرنگیوں کی پیروی کرتے
گئے۔ اپنی اپنی پیٹھ پر کے بوجھ کا اور اُس بوجھ پر برف کی تہوں کا جیسے
اُن کو احساس نہ تھا۔ جیسے یہ سر اور پیٹھیں اُن کی اپنی نہیں تھیں۔ لیکن
فرنگی جوش میں تھے، برف کی اچھوتی سطحوں میں "کرکر ــــ کرکر" گڑھے
کھودتے گئے اور قلیوں کے پیر کاٹھ کی چھڑیوں کی طرح اُٹھتے گئے اور
انہی گڑھوں میں گرتے گئے۔ اُن کے سانسوں کی چھ پھولی پھولی ابری
لکیریں بھی فرنگیوں کی تین لکیروں کے بعد ایک سیدھ میں نکلتی چلیں اور
مہم برابر آگے بڑھتی گئی۔

پھر یہ ہوا بھی مدھم پڑتی گئی اور برف بلا روک ٹوک پوری شدت سے
گرنے لگی۔ آسمان سے لے کر زمین تک، فضا کے ہر ملی میٹر پہ جیسے
روئی کے گالے ان گنت اور الوپ دھاگوں میں پروئے گئے، ایسے

سلسلے جن کے گائے گائے میں حرکت تھی، پُرعزم تیزی تھی۔ جیسے آسمان بھر کو نیچے کھینچ کر بچھانا تھا ـــــ پھر اتنی گھما گھمی میں سانس تک کی آواز نہ تھی۔ اور وہ حقیر سا انسانی سلسلہ جو "ہُش ہُش" اور "کرکر" کی آوازیں نکالتا اس عالمگیر ہم آہنگی کے خلاف کش مکش میں مبتلا تھا۔ کتنا سُست اور بھدا تھا۔ پھر یہ انسان جو بظاہر ایک رسّی میں بندھے ہوئے تھے، بظاہر ایک سمت کو جا رہے تھے ان کے نو دلوں میں نو کیفیتیں تھیں۔

ولی جو کُڑھ رہا تھا کہ ان فرنگیوں نے اس کے تجربے اور دور اندیشی کو ٹھکرایا تھا ـــــ پھر اُسی پہاڑ "واوہ بال" کی ہولناک کہانیاں سنانی آندھیوں کیطرح اُسکے ذہن پر آندھیاں چھا رہی تھیں۔ واوہ بال کا مالک اُنہی برفوں میں رہتا تھا، یہی برفیں گراتا تھا اور اپنی سلطنت میں ناپاک انسان کے دخل کا یہی بدلہ لیتا تھا، یہی غضب ڈھاتا تھا ـــــ کاش وہ اُن فرنگیوں کے ساتھ آیا ہی نہ ہوتا۔ لیکن واوہ بال کے مالک سے اُسکے گاؤں کا ضلعدار کہیں زیادہ ظالم تھا، مالک کیطرح وہ الوپ تو تھا نہیں بلکہ اپنی بڑی بڑی ہڈیاں اور تھلتھلاتے گوشت کو لئے گاؤں بھر میں گھر گھر گھومتا تھا۔ ہر دن اُسکا سامنا تھا۔ وہ اُسکے حکم کو کیسے ٹالتا؟۔

اور قلیوں میں سے ایک تو یہ رونا رو رہا تھا کہ اُس نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ اُسکی نسوار کیلئے فرنگیوں سے ایک خوبصورت سی خالی شیشی مانگ لائیگا۔ اب جو فرنگی اُسے موت کی طرف گھسیٹے لئے

جا رہے تھے بڑھیا شیشی کہاں سے لیتی ؟ نسوار ہی اب اُسے کون دیتا؟ وہ اب کھاتی ہی کہاں سے ـــــ ؟ کچھ ولی جُو کے ڈر سے وہ رونے کی آواز کو گھونٹتا رہا کچھ اُسکا وہ غصّہ آنسوؤں کو جلاتا رہا جو اُسکو اپنی بیوی نوری پر آرہا تھا ـــ ذرا ذرا سی باتوں پر نوری اُسے کوستی رہتی تھی اب وہ کونسے سچے ہو رہے تھے ..... سچے ہو رہے تھے ..... خبر سُنتے ہی نوری غفار کو بلائیگی اور اُسکے ساتھ دوسرا بیاہ کریگی ـــــ وہ رنج اور غصّے کی دو کیفیتوں کو اپنے دائیں بائیں پیروں کیساتھ ساتھ اُٹھاتا اور گراتا جا رہا تھا

تیسرا جو فرنگیوں کے دسترخوان کو جھاڑتا تھا سوچ رہا تھا کہ ولایتی ٹکیوں کے چُورے سے اُس نے یُونہی جیبیں بھر رکھی تھیں ۔ بچے کہاں ۔؟ اب موت اُسکا انتظار کر رہی تھی ۔ اور جب وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا تھا اُسکی آنکھوں میں جیسے وہ ساری برف گھُسی جاتی تھی کیونکہ اُسے ایسا دکھائی دیتا تھا کہ بچے اُسکی جیبوں پر ٹُوٹ پڑے ہیں اور مُٹھیاں بھر بھر نکال رہے ہیں ۔

ایک اور تھا جسکی بیوی ایک طویل جھگڑے کے بعد میکے سے آئی تھی ۔ اُسے یہ افسوس کھائے جا رہا تھا کہ وہ کچھ اور دن بھی زندہ نہیں رہیگا ۔ اُس گرم گرم بدن کی یاد عالمگیر برف کے باوجود اُسے جیسے گرم سلاخوں سے چھُو رہی تھی ۔ کاش اُسے پہلے پتہ ہوتا کہ اُسے ایسی مُہم پر آنا ہوگا ۔ وہ بیوی کیساتھ ایک طویل جھگڑے میں وقت کیوں ضائع کرتا ؟

پھر وہ بھی تھا جسکے گلے کو برانڈری کی چُسکی جلا رہی تھی جو ابھی ابھی فرنگی نے دی تھی ، وہ یہ دعا مانگ رہا تھا کہ موت کے وقت اُسے کلمہ پڑھنا یاد

رہے نہیں تو یہ شراب کی چسکیاں اُسے جہنم میں پھینک دیں گی۔

وہ تین فرنگی بھی انسان تھے۔ یہ مُہم اُنھوں نے ٹھیک موسم میں شروع کی تھی۔ اس موسم میں برف کے ذرّوں کو دیکھکر وہ حیران تو ہوئے تھے لیکن وہ یہ سمجھے تھے کہ یہ قدرت کی ایک چھوٹی سی بھول تھی جس نے اُسکی ایک بڑی مشکل کو حل کیا ـــــ لیکن اس معرکے کی برفباری کی اُن کو کہاں اُمید تھی؟ پہلے گالوں کو دیکھکر ایکدوسرے سے مذاق کئے کیونکہ برف کے گالوں کو بھی وہ فطرت کی ایک بھول سمجھے۔ پھر جب برف سنجیدگی کیساتھ گرتی رہی وہ ہمت کے ساتھ ایک نئے تجربے کو حاصل کرنے کیلئے آگے بڑھتے چلے لیکن جب برف نے رُکنے کا نام نہ لیا اُنکے دل بھی دھڑکنے لگے۔ پھر اُنپر یہ بھی واضح ہوتا گیا کہ سائنس نے اُنکا ساتھ چھوڑ دیا ہے، اُنکے تجربے نے اُنسے دغا کی ہے اور وہ اپنی بےبسی کو اپنی اپنی جگہ چھپانیکی کوشش کرنے لگے

اُنمیں جو سب سے آگے تھا وہ کچھ اور قدم اپنے ساتھیوں کی آزمائش کرنے کی قوت رکھتا تھا، کچھ اور قدم غصّے میں اپنی ہی بوٹیاں کاٹنا چاہتا لیکن اب تو ہر قدم پر اُسکی رانیں تک برف میں گڑجاتی تھیں۔ وہ ساتھی فرنگیوں کی بےمثال خودغرضی پر خشمناک اچنبھے میں تھا، کسی نے ایک قدم رُکا ہی ہوتا ـــــ یہ تو وہ جانتا تھا کہ پہاڑ کی اُس کیفیت میں واپس اُترنا آگے بڑھنے سے کم نہ تھا لیکن واپس اُترنے کی بات پہلے وہی کیوں چھیڑتا؟ پھر بھی اُس نے مُوڑ مٹر کے بہانے سے کئی بار پیچھے چھوڑے ہوئے گڑھوں کو دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ ننھے گڑھے کیا یہ گرتی برف تو گہری وادیوں کو بھرنے لگی تھی ـــــ اور

بدن کا ہلنا چونکہ جینے کیلئے ضروری تھا وہ آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔
دوسرے فرنگی کیلئے آگے بڑھنا نسبتاً آسان تھا کیونکہ اُسکے پیر ٹھیک اُن گڑھوں میں گرتے تھے جو اگلے کے پیر قدم پر جان توڑ کر کھود رہے تھے لیکن یہ فرنگی اِس اُمید میں اگلے کی پیروی کر رہا تھا کہ وہ ایک لمحہ رُک جائیگا، اور اُسکی رائے پوچھیگا — لیکن اگر اگلا رُک بھی جاتا، پوچھ بھی لیتا، یہ اُسے کیا مشورہ دیتا۔ برف اتنی اونچی ہوگئی تھی کہ وہ کچھ اور سوچ نہیں سکتا تھا۔ اُسکی آنکھوں کے سامنے یک بیک وہ مکالمے اور کتابیں آرہی تھیں جو وہ مہم کے بعد لکھتا .... اُس نے مشاہدے اور تخیل کو جوڑنے کے کیا کیا ارادے کئے تھے لیکن آہ اب اُسکی تصویر بس ایکبار چھپے گی جسکو دیکھکر اُسکی محبوبہ بس ایکبار روئیگی — پھر یہ اگلا بیوقوف آگے کہاں بڑھتا جا رہا تھا وہ کس جنون میں سب کو گھسیٹے لے جا رہا تھا۔
تیسرا فرنگی فلسفی تھا۔ عمر بھر اُس نے کتابیں لکھی بلکہ پڑھی تھیں۔ وہ بس اپنی یاد کو ٹٹولتے جا رہا تھا کہ اُس نے کسی کتاب میں یہ بات پڑھ لی تھی کہ آسان اور بغیر صرف برف اور سردی کی شدت سے ہی میسر ہوتی ہے۔
"حمد کھودایا" قطار کے اخیر سے چھٹے قلی رحمان نے اُونچی آواز میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اس آواز نے اچانک منتشر دلوں پر ایک ہتھوڑا مارا اور سب میں غصّے کی ایک بھڑک پیدا کی۔ اُسی دم سب کے قدم وہیں رُک گئے جیسے اُجڈ رحمان نے پیچھے سے رسّی کو ہی کھینچا تھا۔ اگلا فرنگی پھٹ پڑا، دوسرا فرنگی پھٹ پڑا اور تیسرے کے دماغ میں بھی اُس کتاب کا

نام آیا ہی چاہتا تھا جب وہ آواز پیچھے سے کاٹنے آئی — اگلے نے تو آگے سے صاف انکار کیا، دوسرے نے واپس اُترنے کیلئے آسمان سر پر اُٹھایا اور ولی جو بھی اسوقت یہ بھول گیا کہ وہ رسّی میں بندھا ہوا تھا کیونکہ وہ رحمان کو پیٹنے کیلئے واپس مُڑنے لگا تھا، جیسے ہی واوہ بال کی سلطنت میں خدا کا نام لینا بھی جرم تھا — عجیب افراتفری سی پڑگئی۔ کیونکہ وہ قلی بھی رحمان کی طرف مُڑکر رونے سے لگے تھے اور رحمان اس احساس میں وہیں گڑ گیا کہ اُس نے ایک بڑی غلطی کی تھی۔

"حمد کھودایا" رحمان کے مُنہ سے یونہی نکل گیا تھا۔ اُسکی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں پلکیں نہیں تھیں، اور اُنپر بھویں بھی نہیں تھیں۔ مقابل کی ہوا برف کے گالوں کو اُسکی آنکھوں میں دھکیلتی تھی۔ پھر جب ہوا بالکل رُک گئی برف کے گالے اُسکی آنکھوں کے نیچے اُبھری ہوئی ہڈیوں پر ہی رُکنے لگے۔ اُس کی آنکھوں کو آرام ملا تو اُسکے مُنہ سے "حمد کھودایا" کی آواز نکل آئی اس ایک پریشانی کے علاوہ اُسکے دل میں کوئی تلخی نہیں تھی کیونکہ وہ فولاد کا بنا ہوا تھا اُسکے گھر میں ایک موسی کے سوا کوئی بھی نہ تھا، اُسکا اپنا کوئی بھی نہ تھا جسکی یاد اُسے رُلادیتی۔ وہ موسی بھی اُسکی روٹیاں تب ہی پکانے آئی تھی جب اُسکے خاوند نے اُسکو گھر سے نکالدیا تھا — پھر ایک اور بات تھی۔ اگر وہ پانچوں قلی مرہی جاتے اور وہی اکیلا گھر پہنچ بھی جاتا اُسے تب بھی یہ اُمید نہ تھی کہ اُنکی پانچ بیواؤں میں سے ایک بھی اُس کیساتھ نکاح کرلیگی — خدا نے اُسکی صورت کچھ ویسی ہی بنائی تھی۔

مہم والوں نے اپنے غصّے کو ایک مشترکہ فیصلے سے بُجھایا کہ اُنکی قطار وہیں پر واپس مُڑے اور سب سے آگے بدشگون رحمان بیلچے سے برف کو پیٹتا چلے اور راستہ بناتا جائے۔ کیونکہ یہ اُمید تو تھی کہ وہ لوگ اُس اپنی جگہ پر واپس آجائینگے جہاں سے وہ اُسی صبح چل پڑے تھے۔ وہاں پر پہاڑ کی ایک گودسی کھل رہی تھی جہاں پر اس نئی برف کو دبا کر ایک آدھ تنبو تو کھڑا کیا جا سکتا تھا۔

اُجڈ رحمان بیلچے مارتا گیا اور اُترتا گیا۔ اور ولی جو جو فرنگیوں کے قریب رسی میں جُتا ہوا تھا فرنگیوں کو پھر سے واوہ بال کے مالک کی دہشتناک کہانیاں سُناتا گیا اور جب کافی اُترنے پر بھی اُنکو وہ پھیلی ہوئی گود نہ ملی تو ولی جو فرنگیوں کو سمجھانے لگا کہ مالک ان گودوں میں بھی نئے گھٹنے ڈال سکتا تھا دیکھے بھالے راستوں کو تبدیل کر سکتا تھا۔ انتقام لینے کی خاطر سب کچھ کر سکتا تھا — فرنگیوں کو یہ راز کی باتیں بتاتے ہوئے اُسکی نظر رحمان پر رُکی اور اُسے یقین ہو گیا کہ رحمان بہت تھک گیا ہے تو وہ اِس بات پر زور دیتا گیا کہ پارٹی میں سے کسی ایک کا مالک کے نام قربان ہونا ضروری تھا۔ اور اگر پارٹی خود ہی کسی ایک کو مالک کے نام چڑھائے تو مالک چڑھاوے کو قبول کریگا۔ اور باقیوں کو معاف کر دیگا۔

اُترتے اُترتے جب دن کی بیشتر گھڑیاں بیت گئیں اور اُنکی ٹانگوں میں خون سُست ہونے لگا پانچ اور قلیوں نے موت کو سامنے دیکھا اور رسی کو ترک کیا، بیلچوں کو نکالا اور تھپا تھپ برف کو پیٹتے چلے موت سے

بھاگنے کا اپنا اپنا راستہ اپنی اپنی قوت کے مطابق بناتے گئے اور اُترتے گئے اور رحمان جو بہت تھک گیا تھا فرنگیوں کیساتھ قلیوں کے بعد اُنہی کے راستوں پر اُترتا چلا — مُہم میں اس تھپا تھپ کیساتھ ایک اُمید کی سی بھڑک اُٹھی گویا یہ اُمید اُنکی اپنی ہی رگوں سے اُٹھی جنمیں اس والہانہ حرکت کی وجہ سے خون اُچھلنے لگا تھا۔ ورنہ فضا میں وہی گمراہی تھی، وہی خوفناک عزم تھا، وہی خشمناک تیزی تھی۔

دِن کا ایک اور حصّہ جب ڈھل چکا تو فلسفی فرنگی نے رُک کر دوسرے فرنگیوں سے کہا کہ اُسے نیند آرہی ہے — نیند!! مہم کے باقی آدمی وحشیوں کیطرح نیچے دوڑنا چاہتے تھے، بدن کی بوٹی بوٹی کو ہلا کر وہ نیند کے تصور تک کو اپنے سروں سے جھاڑنا چاہتے تھے دو فرنگیوں نے فلسفی فرنگی کو کچھ پلایا، اُسکی آنکھوں میں اُنھوں نے مرچوں سی کوئی دوائی جھونکدی، دونوں طرف سے اُسکے ہاتھ پکڑ لئے اور اُسے نیچے کھینچتے گئے۔

برف کا ایک گالا پھولتا ہی گیا اور گلے پر گالا پہاڑ پر جیسے پہاڑ چڑھتا گیا — محض اسلئے کہ چند انسانی جانیں خطرے میں تھیں یہ برف کیوں تھم جاتی — ؟ گرتے پھسلتے یہ انسان پہاڑ کی ٹیڑھی لکیروں کو برابر کھوجتے رہے لیکن اُنھیں کوئی ایسی ڈھلان، کوئی ایسا ٹیلا دکھائی نہ دیا۔ جسکو دیکھکر وہ اپنی جگہ پر پہنچ جانے کی اُمید میں ایک اور بار اُچھل پڑتے اور جب وہ پہاڑ کسی طرف سے بھی ختم ہونا دکھائی نہ دیا اُنکو اپنی زندگی کی سرحد صاف دکھائی دیں جنکے قریب وہ لڑکھڑاتے ہوئے بھی چلے جارہے تھے۔

اب تو اُنکے بیلچے اُٹھتے اور گرتے ہوا میں دائرے بنا رہے تھے، پھر ایک کے بیلچوں کی آواز میں خوفناک وقفے سُنکر دوسرے کا اپنا بیلچہ اُلٹا گرتا اور برف میں دھنس جاتا، پھر اپنی بے حسی پر اُسکا کلیجہ مُنہ کو آتا، اُسکے اوسان خطا ہونے لگتے، اور جب موت کی گرفت سے وہ جُوں توں نکلنا چاہتا اُسکے کھوکھلے کونوں سے رہی سہی، زندگی ایک بھبوکے میں اُچھل پڑتی اور وہ بھی بیلچے کو کھینچ لیتا اور ہوا میں اُٹھاتا۔

یکے بعد دیگرے بیلچے خاموش ہوگئے اور مہم کے سب قلی برف پر بیٹھ گئے اور ٹانگیں پھیلا دائیں بائیں ہاتھ برف میں گاڑ کر غیر واضح اترائیوں پر دھیرے دھیرے کھسکنے لگے۔ اُنکا خون اب اُنکی رگوں کو چیرنے لگا۔ اُنکے کانوں میں جیسے موت کی گھنٹیاں بجنے لگیں، جیسے یہ گھنٹیاں اُنکے دماغوں کو بھی سُن کرنے لگیں کیونکہ اب وہ جس طور کھسک رہے تھے اُس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ حرکت صحیح دماغ کی تدبیر نہیں تھی بلکہ وارفتہ زندگی کی اپنی پھڑپھڑاہٹ تھی — رحمان جو واقعی فولاد کا تھا ان سب کے پیچھے اب تو فلسفی فرنگی کو اپنی پیٹھ پر لئے قدم بہ قدم اُتر رہا تھا اور دو فرنگی رحمان کے دونوں طرف کھڑے کھڑے اُتر رہے تھے، رحمان کو تھامے ہوئے رحمان کے سہارے اُترے ہی تھے فلسفی کے نرم نرم بوجھ سے رحمان کے دل میں گرمی کا تصور آگیا تھا بلکہ حقیقتاً اُسکے سانس کی اب تو سب میں گھنی تھی

آخر مہم رُک گئی — وہاں سے پہاڑ کا ایک مونڈھا سا ایک لمبے تابوت کی شکل میں اُفق تک پھیلا ہوا تھا۔ اُسکے موڑ میں نیچے پہنچانے کا

ذرا بھی وعدہ نہ تھا۔ اور چونکہ وہ کمر توڑ لمبائی وہیں سے سالم نظر آ رہی تھی۔ کھسکتے جسموں کو جیسے سکتہ ہوا۔ لیکن اُس نقطے پر پہاڑ کی ایک تھوڑی سی بھی نکل رہی تھی جسکا نکیلا سرا نیچے کیطرف خلا میں لٹک رہا تھا۔ اُسکے نیچے کی دنیا کا پتہ برف کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو کیسے چلتا؟ لیکن اُس سرے کی بعد کی دنیا یقیناً نچلی دنیا تھی، مہم کا ایک آدمی اُس نقطے سے اُچھلنا چاہتا تھا، ایک ہی پھاند میں نیچے جانا چاہتا تھا لیکن اس وارفتگی کی حالت میں بھی وہ انسان تھے، پہلے اِس بات کا یقین چاہتے تھے کہ نیچے کوئی دنیا تھی اور وہی اپنی دنیا تھی جہاں وہ پہنچنا چاہتے تھے، پھر چونکہ کودنا بھی تھا وہ اُس دنیا کو کہیں نزدیک ہی چاہتے تھے ـــــ ان سب باتوں کا پتہ کون لگاتا؟ کسی ایک کو تو کودنے میں پہل کرنی تھی۔

اس موقع پر وکی جُو نے آپکو ہلایا، جھنجھوڑا، اور اپنے ہی دماغ سے صلح کی۔ اُسے فوراً وہ بال کا مالک یاد آ گیا۔ چڑھاوے کا اب بھی موقع تھا بلکہ صحیح موقع اور مقام وہی تھا۔ اُس نے سوتے اور جاگتے ہوئے فرنگیوں سے رحمان کو الگ کیا اور اُسکو یونہی کودنے کا حکم دیا لیکن اُجڈ رحمان کو اِس بات کا شعور تھا کہ اُس وقت اُس اکیلے میں اُن سب کا مقابلہ کرنے کی طاقت تھی۔ وکی جُو کا طنطنہ یونہی گیا تو فرنگیوں نے دخل دیا۔ اُنھوں نے رحمان کو بہت بہت سلام کہا، کہ وہ سب میں قابل تھا، کہ وہ سب کی زندگیاں بچا سکتا تھا، وہی اُس سرے کے نیچے سی پتہ لا سکتا تھا۔ باتوں باتوں میں اُنھوں نے رسّی کا سرا رحمان کی کمر میں باندھ دیا اور

رحمان کا خون خوف سے جمنے لگا۔ اور جب رسی بندھ گئی، اُس سے نہ رہا گیا، وہ بھی اپنی مری ہوئی ماں کو پکارنے لگا اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔

رو رو کر اُس نے اپنے گاؤں کے پانچ آدمیوں سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر درخواستیں کیں کہ رسّی کے دوسرے سرے کو وہ سب دبائے رکھیں اور جب وہ آواز دے یا رسی کو ہلائے تو وہ اُسکو اُسی وقت واپس کھینچ لیں۔ پھر اُسنے خدا کا نام لیا ایک جُھرجُھری لی اور سرے سے نیچے سرک گیا۔ ولی جُونے رسی ڈھیلی کی اور رحمان ہوا میں لٹک گیا۔۔۔۔ پہلے ہی جھٹکے میں تمام رسی ہاتھوں میں سے نکل گئی! شاید اسلئے کہ ہاتھ سُن ہو چکے تھے، شاید اسلئے کہ واوہ بال کے مالک نے چڑھاوے کو قبول کیا تھا اور وہ خود رحمان کو کھینچ رہا تھا — اور رحمان پر تو اُس پہلے ہی جھٹکے نے بجلی گرادی، اُسکی تمام جان نے رسّی کی بیکار نوک کو پکڑے رکھا۔ موت کی آندھی میں اُسکی بوٹی بوٹی اُس رسّی سے لپٹنے دوڑی، لیکن وہ رسّی اُس سے پہلے نیچے کیچڑ میں بھاگتی گئی، اور اُس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور ایک چُور چُور کر دینے والی چوٹ کی اُمید میں اپنے دانت ایکدوسرے پر دبا دیئے۔ جب ٹھوس زمین کیسا اُسکے پیر ذرا ہی چھُوئے اُسکے مُنہ سے ایک وحشیانہ چیخ نکلی اور وہ گر پڑا!

دوسری دنیا میں رحمان کے دل میں پہلے یہ حیرانی آئی کہ وہ گرتے وقت کافی لمبے ہوا میں رہا تھا۔ پھر یہ کہ گر کر اُسکے ٹکڑے نہیں ہو گئے تھے۔۔۔ پھر اُسکی دھڑکن بہت تیز ہوئی اور اُسکے سب حواس واپس آ گئے اُس نے دیکھا کہ اُسکی بوٹی بوٹی سالم اور جُڑی ہوئی ہے، اُس نے یہ بھی دیکھا کہ

وہ برف کی ایک آرام کرسی پر گر پڑا ہے۔ اُسکو یہ بھی سمجھ آگئی کہ یہ کرسی اُسکے بدن نے گرتے ہوئے کھودی ہے ــــ لیکن یہاں کی دنیا نئی ضرور تھی، یہاں کی برف گھٹنوں سے ذرا ہی اُونچی تھی اور ہوا میں برف کے باریک باریک ذرّے چکّر کاٹ کاٹ کر نیچے آرہے تھے۔ یہاں کے بادل بھی اِتنے اُونچے تھے کہ رحمان باریک ذرّوں کے بیچ میں سے چاروں طرف دیکھ سکتا تھا۔ اور جب وہ اُسی دھڑکتے ہوئے دل کو لے کر آرام کرسی سے باہر آیا اور اپنی باز کی جیسی آنکھیں نیچے کی طرف لگا دیں اُسے پہاڑ کی ایک میٹھی میٹھی ڈھلان دکھائی دی جسکے نیچے کالے کالے سوراخوں کا ایک جھرمٹ دکھائی دیا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ کے دیکھا تو وآوہ بال کے قدم پہچان لئے اور اُن کالے کالے سوراخوں میں جھونپڑیاں دیکھیں!!

ــــ اور اُسی وقت اُس میٹھی میٹھی ڈھلان کے کہیں اوپر وآوہ بال کا مالک برف کی ایک تیز آندھی چلا رہا تھا ــــ!!

Do not read.

انگڑائی

ممتاز شیریں

صفحات :- ۳۰

"آپا، گلنار آپا! وہ دیکھو مچھ فنا ۔ ۔ ۔ ۔" جاوید ننھے ننھے ہاتھوں سے میری ساری کھینچ رہا تھا۔

"ارے ہٹ بھی جب دیکھو آپا آپا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھ تو میری سلوکی کا ناس کئے دے رہا ہے۔ سفید ساڑی کل ہی تو پہنی تھی۔ اور یہ دھول میں اٹے ہوئے ہاتھ۔ مٹی سے کھیل رہا تھا کیا بدتمیز!" میں نے غصہ سے اُسکے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ اُس نے رونی صورت بنالی:—

"نہیں تو آپا مچھ فنا نچھ ہمالی گلی میں ۔ ۔ ۔ ۔" اُس نے سسکتے ہوئے کہا۔ "اُنھیں بلاؤ نا ۔ ۔ ۔ ۔ مچھ فنا نچھ کتنی اچھی ہیں۔ اچھو دن مجھے کھیک دیا تھا اول کوکو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھی اچھی کوکو ۔ ۔ ۔ ۔ آپا اُنھیں بلالو اچھی آپا ——"

"ارے!" میں چونک پڑی۔ "مس فنانس یہاں؟" میں نے دریچے کی طرف نگاہ ڈالی۔ ہاں وہ سچ مچ کچھ دور پر کسی عورت سے باتیں کرتی ہوئی اِدھر آرہی تھیں ــــ تو انھیں بلاؤں؟ میں نے سوچا۔ پھر جلدی سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کتابیں بکھری ہوئی، اور فرنیچر! ایک کرسی دیوار کی طرف مُنھ کئے کونے میں پڑی ہے اور ایک کمرے کے عین بیچ میں، گویا اپنی پالش سے بے نیازی پر نازاں بیٹھی ہو۔ اور صوفہ! اُونھ! یہ بڑا سا سوراخ اور اُس میں سے میلی میلی روئی جھانکتی ہوئی ..... ٹیبل کلاتھ؟ اس پر تو جاوید نے بڑے ہی خوشنما نقش بنا رکھے ہیں۔ اور سیاہی برتنے میں بڑی فیاضی دکھائی ہے۔ میرے اللہ! ایک چیز بھی سلیقہ کی ہے؟ اُف کس بدتمیز نے فرش پر کاغذ بکھیرے ہیں؟ ایسے شریر بچے بھی کسی کے ہوتے ہیں۔ اور یہ دھول کی ایک انچ موٹی تہہ ــــ یہ کریمن بھی کہاں مرگئی؟ کمبخت سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ صبح صبح کمروں میں جھاڑو دیدیا کرے۔

"کریمن! او کریمن ذرا جھاڑو لیتی آنا ــــ کیا تم نے یہ دھول بنچ کے نیچے جمع کر رکھی ہے؟"

"آئی بی بی، ابھی آئی۔ ذرا توے سے روٹی تو اُتار لوں، جل جائے گی ــــ"

بھاڑ میں جائے وہ اور اُس کی روٹی۔ کمبخت ہر وقت چولھے میں گھسی رہتی ہے۔ آخر میں کیوں جھنجھلا رہی تھی بیچاری غریب۔ کیا کیا

کرے، ایک ہی تو تھی۔ اور گھر کا سارا کام اُسی کے سر۔ ہم ایسے کوئی امیر تو نہ تھے کہ دس نوکر رکھتے۔ ایک بھی غنیمت ہے۔

میں نے جلدی سے ٹیبل کلاتھ بدلا۔ اور کرسیوں کو اپنی اپنی جگہ گھسیٹ کر۔ فرش پر بکھرے ہوئے کاغذ سمیٹنے لگی۔ سمیٹتے سمیٹتے اُٹھ کر کھڑکی پر نظر ڈالی تو میری سانس جیسے رُک گئی۔ اُف، مس فنانس کتنی نزدیک آگئی تھیں۔ "زکیہ، زبیدہ!" میں حلق پھاڑ کر چلّائی۔ جواب ندارد دروازے میں جا کر دیکھا تو بس جل ہی گئی۔ دونوں آنگن میں موجود۔ زکیہ جاوید کو اُٹھائے گیٹ کے باہر کھڑی تھی تو زبیدہ گیٹ پر چڑھی ہوئی گردن بڑھا بڑھا کر مس فنانس کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"زکیہ! ادھر آؤ تو۔ شرم نہیں آتی تمھیں؟ یوں باہر کھڑی ہو۔"

"خفا کیوں ہوتی ہو آپا۔ میں ہمیشہ تھوڑے ہی کھڑی ہوتی ہوں یونہی آج ....."

پھر وہ میرے پھولے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنس پڑی۔ "اخاہ آپا! آج تو آپ کے غصہ کا پارا خوب چڑھا ہوا ہے۔ اہا ہا، ابھی آتا ہے دیتی ہوں اپنی آپا کا ٹمپریچر — دیکھونا، ایسی مزے کی بات بتاؤں گی" پھر مُنھ بنا تالیاں بجاتے ہوئے بولی: "بتادوں آپا ..... اُوں .. .. اوں ....." زکیہ کو جانے کیوں شرارت سُوجھ رہی تھی۔

"بھئی آخر ....." میں جھنجھلا گئی۔

"اوں ..... اوں .... مس فنانس یہاں سے گذر رہی ہیں"

"یہ تو مجھے معلوم ہی ہے۔ اچھا آؤ ذرا کمرے کو صاف کرنے میں مدد دو۔ تمھیں تو بس باتیں بنانی آتی ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"تو آپا مس فنانس کو بلاؤ گی؟" اُس نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔ زبیدہ بھی ناچ رہی تھی۔ اوہ ابھی تک یہ بچے مس فنانس کو اتنا چاہتے ہیں!

زکیہ پھر دروازے کی جانب تکنے لگی۔ میں بھنا گئی۔ کاغذ سارے کمرے میں پھیلے پڑے تھے — "ہُونہہ نہیں بلاؤں گی! دیکھو تو گھر کتنا صاف ہے —" میں نے جھنجھلا کر سمیٹے ہوئے کاغذوں کو دے مارا۔

"کیا کہہ رہی ہو آپا؟" زکیہ تعجب سے میرا منہ تکنے لگی میں نے اُسکی طرف توجہ کئے بغیر زبیدہ کو پکارنا شروع کیا۔ "زبیدہ آجاؤ اندر۔"

"کیوں آپا؟" زبیدہ نے پوچھا۔

"آجاؤ اگر مس فنانس تمھیں دیکھ لیں تو اُنھیں معلوم ہو جائیگا کہ یہ ہمارا ہی گھر ہے۔ اور وہ یقیناً مجھ سے ملنے آئیں گی"۔ میں نے جاوید کو بھی اندر گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اور اچھا ہوگا۔ وہ کیوں نہ آئیں آپا؟"

"گویا تم سب نے گھر کو بڑی اچھی طرح سجا کر رکھا ہے"۔

"ہم ابھی سب کچھ ٹھیک کر دینگے۔ اُنھیں آنے دو آپا"۔ دونوں نے نہایت اشتیاق سے التجا کی۔

"کہہ جو دیا کہ نہیں بُلائیں گے"۔

"اوہ آپا! مس فنانس! اور اتنے دنوں کے بعد انھیں دیکھنا نصیب ہو۔ آخر تمھیں کالج چھوڑے دو تین ماہ ہو گئے نا؟ اتنے دنوں کے بعد وہ خود اتفاقاً یہاں آئیں۔ ہمارے گھر پر سے گذریں اور تم!.... تم انھیں نہیں بلاؤ گی؟ آپا تم تو مس فنانس پر...." زکیہ سنجیدہ لہجے میں کہتی کہتی یکایک زور سے ہنس پڑی۔ اور شرارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ "ہوں! اچھا! میں جان گئی.... جب سے پرویز بھیا...."

"اری چپ! بہت باتیں بنانے لگی ہے" میں نے زور سے اُس کے ایک چٹکی لی۔

"ہُونہہ آپا۔ تم بہت بنتی ہو۔ ابھی دیکھو نا پرویز کا نام آتے ہی کیسے شرما گئیں۔ میں یونہی شرماتی، لجاتی، سمٹی سمٹائی سب کچھ بھول کر وہیں کھڑی رہی۔ گویا اس نام نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔ کیسا حسین نام ہے، کتنا پیارا نام ہے — پرویز!

میں اِس شیریں تصور سے چونکی تو سامنے کیا دیکھتی ہوں، دروازے کے کواڑ کھلے پڑے ہیں۔ پردہ ہوا سے اُڑا جا رہا ہے اور مس فنانس ہمارے گھر کے بالکل مقابل میں کھڑی مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں جونہی میں نے اُنھیں دیکھا۔ وہ مُسکرا کر ہمارے گھر کی طرف بڑھنے لگیں۔

"یا اللہ! اب کیا کیا جائے؟" میں زکیہ کو جھنجھوڑنے لگی —

"اب تم ہی سب کچھ دیکھ لو، دیکھو وہ آ رہی ہیں" میں بے تحاشا

وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں جا کر دم لیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے وہاں جھانک کر دیکھا۔ مس فنانس برآمدے کے بازو والے کمرے میں کرسی پر بیٹھی تھیں۔ اور ذکیہ ایک خوشنما برتن میں کیلے اور سنگترے لئے ہوئے اُنکے پاس کھڑی تھی۔

"گلنار کو بلاؤ نا" مس فنانس کہہ رہی تھیں۔ اچانک اُنھوں نے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور مسکرا کر آواز دی "گلنار!" میں شرما کر دروازے کی اوٹ میں ہوگئی .... میرے یوں شرما جانے سے وہ کیا سمجھی ہونگی؟ یہی نا کہ میرے جذبات اب بھی اُنکی طرف ایسے ہی ہیں ـــ ہُونہہ! اُنھیں کیا معلوم کہ میں اب ..... مگر اُنھیں یہ غلط فہمی ضرور ہوگی۔ میں پہلے بھی تو اُنکے سامنے یونہی شرمایا کرتی تھی۔ جب وہ کہیں سے آنکلتیں تو میں بھاگ کر کہیں جا چھپتی۔ وہ میری طرف دیکھتیں تو دونو ہاتھوں میں مُنھ چھپا لیتی۔ گو دل تو یہی چاہتا کہ وہ یونہی دیکھتی رہیں عجیب لڑکی تھی میں بھی کچھ سال پہلے ـــ! رفتہ رفتہ میں اُن سے کھلکر بات کرنے لگی تھی۔ پھر بھی جب کبھی اچانک اُن سے مُڈبھیڑ ہوجاتی تو میری بدحواسی نہ پوچھیئے۔ ہفتہ بھر میں جسدن اُن کا گھنٹہ نہ ہوتا وہ دن کسقدر منحوس دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ دن بھی کیا دن تھے چھٹی ہونے پر کالج کے برآمدے میں گھنٹوں اُنکا انتظار کرنا میرا معمول تھا۔ ہاں میں اُن پر مرتی تھی ہیں دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔ اور لڑکیاں مجھے کیسے تنگ کرتی تھیں ـــ "گلنار نہ جانے تم کیوں مس فنانس پر مرتی ہو۔ وہ کونسی ایسی حسین ہیں بلکہ

اُنھیں بدصورت بھی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔" جی چاہتا اِن چُڑیلوں کے مُنھ نوچ لوں۔ انھیں کیا معلوم کہ وہ مجھے کیسی حسین نظر آتی تھیں۔ دوسری لڑکیاں تو کیا میں زرینہ سے بھی اُسدن خفا ہو کر رُوٹھ گئی تھی۔ گو زرینہ میری سب سے پیاری سہیلی تھی۔ اُسدن میں نے کالی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اور پربھا سے سادو مانگ کر پیشانی پر سیاہ بوٹو بھی لگایا تھا۔ اور گلے میں کالے منکوں کی تنگ سی مالا پہنی تھی۔ میں اور زرینہ ہاسٹل کے کمپاؤنڈ میں ٹہل رہے تھے۔ اندرا کہیں سے آنکلی۔ "آہا۔ آج تو تم بلا کی حسین نظر آرہی ہو گلنار!" مس فنانس کی سی" میرے مُنھ سے بے اختیار نکل گیا تھا "ہُونھ! مس فنانس!" زرینہ نے طنز سے کہا تھا "مس فنانس! وہ تین دفعہ مر کر جنم لیں تو شاید تمھارا حُسن اُنھیں نصیب ہو!" مجھے کتنا غصہ آیا تھا اسپر۔

"رُوٹھ گئی گُل؟ اچھا بھئی وہ تجھ سے پانچ گنا زیادہ حسین ہیں! خوش ہوگئی اب تو؟" ــــ پھر وہ قہقہہ پر قہقہہ لگانے لگی۔ اور اندرا بھی مسکرانے لگی۔ جی میں آیا زرینہ سے لڑ پڑوں، آخر وہ کون ہوتی ہیں مس فنانس کی توہین کرنے والی! یہاں میرا جی جل رہا ہے اور وہ یوں کھڑی ہنس رہی ہے! اگر ایک بات بھی اُنکے خلاف کہی جاتی تو زرینہ سے تو کیا کالج بھر کی لڑکیوں سے لڑنے کو تیار رہتی۔ بھلا میں ایک ہی تھی کئی لڑکیاں میرا ساتھ دیتیں۔ اور بھی تو بہت سی لڑکیاں اُنھیں چاہتی تھیں۔ للیتا۔ غریب لڑکی۔ وہ تو مجھی کو اُنکی محبت کا حقدار سمجھتی میرے

راستے میں کوئی رُکاوٹ نہ پیدا کرتی۔ بلکہ مس فنانس کو مجھ سے محبت کرتے دیکھ کر اور خوش ہوتی۔ کیسی بے لوث لڑکی تھی! اسکے برخلاف وہ لکشمی! حسد کی پُتلی! کیا کیا جتن نہ کرتی تھی کہ مس فنانس کی توجہ میری بجائے اُسپر ہو۔ نہ جانے کہاں سے لاتی تھی۔ ایسی خوبصورت ساریاں اور اُنھیں کس سلیقے سے پہننے کی کوشش کرتی۔ جھوٹے موتیوں سے طرح طرح کے زیور بنا کر پہنا کرتی اور بعد میں تو اُس نے برقی مشین سے اپنے بالوں کو گھنگریالے بھی بنا لیا تھا۔ ہُونہہ۔ ان سب جتنوں سے کیا ہوتا وہ حسین تو بھی نہیں۔ مس فنانس مجھی کو دیکھا کرتیں۔ وہ جل مرتی مس فنانس کے خاص سبجکٹ پر تو وہ دنیا بھر کی کتابیں پڑھتی۔ مگر کہیں مجھ سے اچھا لکھ سکتی تھی؟ مجھ سے زیادہ نمبر بھی کبھی لئے تھے؟ آخر کچھ بن نہ پڑتا تو مجھ سے خوب جلا کرتی اور ہمیشہ اسی کوشش میں لگی رہتی کہ ایسی باتیں کرے جس سے میرے دل کو ٹھیس لگے۔ یہ دیکھ کر کہ میں حسین سمجھی جاتی تھی وہ کیسے کُڑھتی تھی۔ کہا کرتی:—

"ہونہہ! سُرخ و سفید رنگ کے بغیر بھی کوئی حسین کہا جا سکتا ہے۔ دراز قد اور چھریرا بدن تو حُسن کے ضروری جُزو ہیں—"

وہ خود بھی گوری تو نہ تھی۔ لیکن تھی دراز قد اور دُبلی پتلی مگر اُسکے چھریرے بدن میں خاک بھی حُسن نہ تھا۔ وہ ایسے دکھائی دیتی تھی گویا ایک لانبی سی لکڑی کو تراش کر صاف کر دیا گیا ہو۔ نہ وہ بدن کو دلکش نشیب و فراز، نہ کوئی لچک، نہ کوئی ادا، چپٹی بے جان لکڑی—!

جی چاہتا مُنہ توڑ جواب دوں :۔۔۔۔ "ہُونہہ! خوبصورتی کیلئے دلکش نقش صبیح رنگ سے زیادہ ضروری ہیں اور بھرا ہوا گول بدن اتنا ہی خوبصورت ہوتا ہے جتنا نازک جسم بلکہ اس سے کہیں زیادہ دلکش"۔ مگر مُسکرا کر چُپ ہو رہتی اور یہ ظاہر نہ ہونے دیتی کہ میں اُسکے طعن کو سمجھ گئی ہوں۔ کبھی وہ کسی گوری رنگت والی کو دکھا کر کہتی :۔۔۔ "دیکھو گلنار وہ لڑکی کیسی حسین ہے۔" اور اُسکی بتائی ہوئی لڑکی، اتنی بدصورت، اتنی کریہہ صورت ہوتی کہ میں بے اختیار ہنس پڑتی۔ بیٹھی ناک، پھیلے ہوئے نتھنے، بیحد موٹے ہونٹ، بھدّا جسم، مگر ہاں سفید رنگت! میں ہنسکر کہتی :۔ "تمھاری حُسن شناسی کی داد دیتی ہوں۔۔۔۔" جب اِن باتوں سے کام نہ چلتا تو سیدھی ذاتیات پر اُتر آتی اور بار بار مجھے 'کالی' کہتی حالانکہ میرا رنگ اچھا خاصا گندمی تھا ..... اور زینت، وہ تو مِس فنانس کے پیچھے ہی لگی رہتی۔ کیسی سادگی سے شکایت کرتی تھی :۔

"گلنار مس فنانس تو تمھیں کو زیادہ چاہتی ہیں"۔

اور وہ بیحد موٹی لڑکی، لڑکی نہیں بلکہ عورت ..... وہ بھی تو انھیں کا دم بھرا کرتی تھی! اور اپنی محبت کیسی عجیب طرح سے جتایا کرتی تھی۔ مِس فنانس کو بے اختیار ہنسی آجاتی۔ اور نیلینی .....

"گلنار بی بی!"

"کیا ہے کریمن؟"

"بیگم نے میٹھے ٹکڑے بنانے کو کہا ہے۔ وہ جو کوئی مس صاحب

آئی ہیں نا! ــــ بہت کام ہے بیٹی، ذرا اس روٹی کے ٹکڑے کو تو کاٹ لو۔ اچھی بیٹی عمر بھر دعا دیتی رہوں گی۔"

میں نے کواڑ کھولے اور آہستہ سے جھانک کر دیکھا۔ کہ کہیں مس فنانس ادھر دیکھ تو نہیں رہی ہیں؟ امی بھی پاس بیٹھی ہوئی تھیں وہ امی سے باتیں کرنے میں مشغول تھیں۔ میں نظر بچا کر باورچیخانہ میں چلی آئی۔ چاقو کو اچھی طرح صاف کر کے روٹی کاٹنے بیٹھ گئی۔ کریمن نے قیمہ دھو کر چولھے پر رکھا اور اس میں نمک مرچ ڈال کر آٹا گوندھنے لگی

تو یہ میٹھے ٹکڑے مس فنانس کیلئے پکائے جا رہے ہیں۔ یہ انھیں بہت مرغوب تھے نا! اور میں نے کتنی دفعہ میٹھے ٹکڑے اپنے ہاتھوں سے پکا کر انھیں بھیجے تھے۔ ان دنوں وہ یہیں کالج میں پروفیسر تھیں۔ اور جب اُنکا ٹرانسفر ہوا تھا تو میں کتنا روئی تھی! وہ منا رہی تھیں، تسلی دے رہی تھیں اور میں روتی جا رہی تھی .... پھر میں نے رو دھو کر ابا کو مجھے اسی جگہ بھیجنے پر رضامند کر لیا جہاں مس فنانس کام کر رہی تھیں اور اُن سے جا ملی تھی۔ دیکھتے دیکھتے دو سال یونہی گذر گئے۔ مجھے اس کالج کا آخری امتحان دینا تھا اور اسکے بعد مس فنانس سے دائمی جدائی! میں اسکا خیال بھی نہ کر سکتی تھی۔ کاش، اس کالج میں ایم۔ اے کا کورس بھی ہوتا اور میں اور دو سال اُنکے ساتھ رہ سکتی!..... پھر بھی میں نے اس مرتبہ فیل ہونے کی ٹھان لی تھی۔ ایک ایسی لڑکی کیلئے جو جماعت میں ہمیشہ اوّل آیا کرتی

ہو فیل ہونا شرم کی بات تھی۔ اِس بات کا مجھے خیال تک نہ آتا تھا۔ پروفیسروں نے مجھ سے کتنی اُمیدیں باندھ رکھی تھیں ——— میں کانوکیشن میں بہت سے تمغے اور انعامات حاصل کرونگی۔ سب لڑکیوں میں اول آنا تو میرا معمول تھا۔ اِسکے الگ تمغے ملینگے۔ سوشیالوجی اور انگریزی میں تو ریاست بھر میں اوّل رہوں گی۔ لڑکے دیکھتے کے دیکھتے رہجائیں گے۔ اور کالج کا نام کیسے چمکیگا ——— اُن کی اُمیدوں پر پانی پھرنے کی مجھے پروا نہ تھی۔

آخر وہ دن آگیا جب امتحان ختم ہوچکا تھا اور میں مس فنانس سے آخری بار ملی تھی۔ اُنھیں خدا حافظ کہکر جب ہاسٹل لوٹ سیدھی اپنے کمرے میں جاکر بستر پر گر پڑی اور تکیوں میں مُنھ چھُپاکر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ اتنا کہ آنکھیں سُرخ ہوگئیں اور تکیہ پوش بھیگ گیا۔ پھر جب زرینہ آئی تو اُس نے مجھے گلے سے لگالیا اور تسلّی دینی شروع کی۔ وہ جتنا مناتی تھی میں اور زیادہ روتی جاتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس رات زرینہ کتنی دیر تک میرے پاس بیٹھی سمجھاتی رہی۔ یہانتک کہ میری آنکھیں جو رونے کی وجہ سے بُری طرح جل رہی تھیں نیند کے غلبے سے بند ہونے لگی تھیں۔ کتنی محبت کرنے والی لڑکی تھی زرینہ!

"تو تم نے ٹکڑے کاٹ لئے بیٹی؟ ادھر لاؤ میں گھی میں بھون لوں۔ اور اچھی بیٹی، ذرا ان پوریوں میں قیمہ بھر کے سموسے بنالینا۔ بیگم نے جلدی تیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیا کروں بیٹی! تم دیکھتی ہو

بہت بوڑھی ہوگئی ہوں۔ ہاتھ سے زیادہ کام بن نہیں پڑتا۔ ورنہ میں تمھیں کام کرنے کو کہتی، توبہ توبہ اس بوڑھے مُنھ میں کیڑے نہ پڑ جاتے! یہ نازک نازک ہاتھ جو صرف قلم پکڑتے تھے، اُنکو میں، موئی نوکرانی کام کرتے دیکھتیں! آنکھیں نہ پھوٹ جاتیں!" بوڑھی کریمن خوشامد کرنے لگی۔ میں بغیر جواب دیئے قیمہ بھر کر سموسے بنانے لگی۔

وہ خود بھی مجھے کتنا چاہتی تھیں۔ کئی بار اُنھوں نے مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔ اور کتنا اصرار کرتی تھیں کہ میں اُنکے ساتھ سیر کو جایا کروں اُس دن اُن کی آواز میں کیسی التجا تھی:

"صرف ایک بار آجاؤ گلنار! میں تمھیں اپنی کار میں گھُما لاؤں۔ فلاں فلاں گارڈن میں لے جاؤں گی۔" میں نے بصد ناز اُن کی التجا کو ٹھکرا دیا تھا۔۔۔۔۔۔ اور اپنے پرچوں میں مجھے کتنے زیادہ مارکس دے دیتی تھیں۔ اسّی پچاسی فیصدی! یہ دیکھ کر لڑکیاں مجھ سے بہت جلتیں، کہا کرتیں۔ "آخر تم تو اُنکی فیوریٹ ہو نا! ہمیں کہاں سے ملیں اتنے نمبر۔۔۔۔" میرا نام اس چٹخارے سے لیتی تھیں گویا اُنکے مُنھ میں لذیذ مٹھائی رکھی ہو۔ جب میری طرف دیکھ کر مُسکراتی تھیں تو اُنکا تبسّم کتنا محبت آمیز ہوتا تھا۔ میرے دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوتی کہ انھیں مس فنانس کے بجائے "اینجلینا" کہا کروں۔ یا کم از کم ایکبار چپکے سے کہدوں "میری اینجلینا" مگر مجھے کبھی جرأت نہ ہوئی تھی۔ اُنکے سامنے کہتی نہیں تھی تو کیا خطوں میں تو جو جی میں آیا

لکھ دیتی تھی۔ میرے دل کی ملکہ، میری جان، ملکۂ حُسن، میری آسمانی اینجلینا، اور کیا کچھ نہیں لکھا کرتی تھی۔ عجیب رومان بھرے خط لکھا کرتی تھی میں تو! اور وہ کبھی خفا نہ ہوتی تھیں۔ اُنھوں نے بھی تو ایک دن ... ... اُس دن میں اور للیتا اُن کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے باتوں باتوں میں للیتا نے پوچھا تھا:

"مس فنانس آپ گھوڑے کی سواری جانتی ہیں؟"

"نہیں" اُنھوں نے جواب دیا "مگر بہت دنوں سے سیکھنے کی خواہش ہے اور اسکے لئے رائیڈنگ سوٹ بھی سلانے والی ہوں" اور پھر اچانک میری طرف مخاطب ہوکر "کوٹ اور پتلون گلنار!" اس انداز سے کہا تھا کہ میں شرم سے پانی پانی ہوگئی تھی۔ "میں اس سُوٹ میں بالکل مرد معلوم ہوں گی نا ــــــ"

میں دونوں ہاتھوں میں مُنھ چھپائے بیٹھی رہی۔ ہاں ان میں کچھ کچھ مردانہ جھلک بھی تو تھی۔ بہت دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، اور ایسی نظروں سے دیکھتی تھیں کہ میں بے اختیار شرما جاتی تھی۔ خواہ وہ کتنی ہی لڑکیوں کی بھیڑ میں کھڑی ہوں وہ باتیں تو اُدھر لڑکیوں سے کر رہی ہوتیں مگر نظر مجھ پر جمی ہوتی۔ اور وہ ــــــ، نارنجی ساری میں وہ کیسی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ شاید ساری کے عکس کی وجہ سے چہرہ کا رنگ سُنہری سا جھلکتا اور رخساروں پر ہلکی سُرخی جس میں کچھ نیلاہٹ کی آمیزش بھی ہوتی ... اور دور سے تو چیچک کے داغ بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔

میں نے سموسوں کی سینی کرمین کے آگے رکھدی۔ کرمین انھیں تلنے لگی۔ اب کہیں فرصت ملی ان کاموں سے۔ اتنی دیر چولھے کے پاس بیٹھنے سے بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوئے ساری کے آنچل سے انھیں خشک کرتے ہوئے پھر اس کمرے کی طرف نگاہ دوڑائی جہاں مس فنانس بیٹھی ہوئی تھیں، انھوں نے آج بھی نارنجی ساری پہن رکھی تھی۔ کسی بات پر وہ مسکرا رہی تھیں۔ وہی ساحرانہ مسکراہٹ جو مجھ پر جادو سا کر دیتی تھی۔ اب میں بخوشی اُنکے پاس جانے کو تیار تھی دفعتہً میری نظر ساری پر پڑی۔ جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی اور جاوید کے ہاتھوں کے نشانات صاف نظر آرہے تھے۔ میں یہ ساری پہنکر کیسے جاسکوں گی۔؟ اتنے میں زبیدہ آنکلی۔

"زبیدہ" میں نے آواز دی۔ وہ توجہ کئے بغیر بھاگی جارہی تھی۔

"زبیدہ اِدھر تو آجاؤ۔!"

"ہُونہہ۔ نہیں آؤنگی مجھے مس فنانس کے پاس جانا ہے۔"

"میری اچھی مُنّی مان لیگی اپنی آپا کی بات۔ چاکلیٹ دونگی منی کو!"

"کیا ہے آپا؟" چاکلیٹ دیکھ کر اُسکی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

"اچھی مُنّی! مجھے الماری میں سے ایک ساری لادو نا! دیکھو یہ کیسی میلی ہو رہی ہے مس فنانس کے پاس یہ پہنکر کیسے جاؤں یہ لو الماری کی کنجیاں!"

"ہاں آپا، جلدی جاؤ مس فنانس بار بار تمھیں یاد کر رہی ہیں۔"

تو وہ اب بھی مجھے چاہتی ہیں ؟ ہاں شاید۔ دو ماہ پہلے میں نے ایک لڑکی کے ذریعے اُنھیں خط بھیجا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا نا کہ وہ خط پاکر کیسی خوش ہوگئی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ اور اُسدن بھی تو وہ خوشی سے دیوانی ہوئی جارہی تھیں۔ میں ایک ایسی جگہ چھپ گئی تھی جہاں سے میں تو اُنھیں دیکھ سکتی تھی مگر وہ مجھے نہ دیکھ سکتی تھیں۔ اور ایک لڑکی کو اُنکے پاس بھیجا تھا کہ اُنھیں اطلاع کردے میں اس کالج میں داخلے کیلئے آئی ہوں۔ اُنھوں نے فرطِ مسرت سے کئی بار میرا نام دہرایا تھا۔ "گلنار! گلنار! گلنار! یہاں سچ کہو۔" لڑکی نے اُنھیں یقین دلایا۔ "وہ کہاں ہیں بتاؤ نا ؟" لڑکی اُنھیں بتارہی تھی میں کس جگہ ہوں۔ مگر وہ دیکھے بغیر گلنار! گلنار! تم کہاں ہو؟ کہتی ہوئی ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ اُنھیں یوں بیتاب دیکھنے میں بڑا ہی مزا آیا تھا۔

"لو اللہ اللہ کرکے سب چیزیں تیار ہوگئیں، اب میں اس بوڑھے جسم کو ذرا آرام تو دے لوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

کمبخت بوڑھی جب دیکھو بڑبڑاتی رہتی ہے۔ میں جھلا کر رہ گئی۔

"خدا بھلا کرے گلنار بی بی کا۔ مجھ بوڑھی کی کتنی مدد کرتی ہے۔"

کریمن باورچیخانہ میں ٹاٹ بچھا کر وہیں لیٹ گئی ـــــ "آہا بیٹی تم یہیں ہو ابھی ابھی یاد کر رہی تھی۔ دیکھا بہت دراز عمر ہوگی۔ میری بی بی کی! اور بیٹی! تمھارے لئے کتنی ہی دعائیں میرے مُنھ سے نکلتی ہیں۔ جھوٹ نہیں کہتی۔ کتنی ہی جگہ کام کیا پر نا بابا ایسی بچی کہیں نہ دیکھی۔ ذرا سے

لونڈے تک مجھے ڈانٹ بتاتے تھے۔ میری بی بی نے تو ابتک ایک سخت لفظ بھی نہ کہا۔ اب تو میرے کام کرنے کے دن گئے۔ اسی لئے تو تمھارے ہاں بھی کام چھوڑ دیا تھا۔ سچ کہتی ہوں بیٹی۔ صرف تمھاری شادی کی خبر سُنکر آئی تھیں ان آنکھوں سے دُلہن بنی دیکھوں۔ بہت دنوں سے یہی ارمان ہے۔ خدا کرے بہت اچھا دولھا نصیب ہو"۔

بھلا پرویز سے اچھا دولھا بھی کوئی ہوگا؟ ایک ہلکی سی مُسکراہٹ میرے لبوں تک آگئی۔ میں نے جلدی سے منھ پھیر لیا کہ کہیں کرین دیکھ نہ لے پھر جیسے دماغ خیالات سے یکلخت خالی ہوگیا ہو اور اُنکی جگہ پرویز! پرویز! پرویز! پرویز!! ــــ اور میں ایک حسین دنیا میں جا پہنچی، جذبات کی ایک رنگین دنیا، ہاں نہایت حسین، کالج اور مس فنانس والی دنیا سے کہیں زیادہ حسین!!

کبھی میں یہ سوچا کرتی تھی کہ میری شادی ہوجائے تو میں اپنے شوہر سے محبت بھی کرسکونگی۔ ایکدفعہ زرینہ نے جو پامسٹری جانتی تھی میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا "تمھارے شوہر کو تم سے بیحد محبت ہوگی"۔ تو مجھے اپنے اس ہونیوالے شوہر پر کتنا رحم آیا تھا کہ میں اُسکی محبت کا جواب نہ دے سکونگی اور اب؟ ..... اب تو میں اپنے پرویز کو دیوانہ وار چاہونگی۔

"آپا ساری لے لو"۔ میں نے زبیدہ سے ساری لیکر میز پر رکھدی اور بال بنانے لگی۔

آخر میں مس فنانس کو کیسے بُھلا سکی؟ وہ بھی تو مجھے بہت چاہتی تھیں ہُونہہ! چاہتی ہونگی کبھی اُنھوں نے زبان سے اسکا اظہار بھی کیا تھا؟ میں ساتھ

ہوتی تھی تو ڈر کے مارے مری جاتی تھیں۔ "گلنار! لڑکیاں کیا کہتی ہونگی؟ گلنار اگر پرنسپل دیکھ لیں تو؟"

لڑکیاں دیکھیں تو دیکھیں کیا ہمنے کوئی جرم کیا تھا کہ یوں ڈریں، اُف بے بُزدلی! اور جب ہمارے مضامین کی کاپیاں تصحیح کر کے کلاس میں لاتی تھیں تو میرے لکھے ہوئے نظریوں اور نکتوں کی تو بہت تعریف کرتیں مگر کبھی لڑکیوں کو بتایا بھی تھا کہ یہ میرے پیش کئے ہوئے نکتے ہیں۔ جوابات کے پرچے واپس کرتے ہوئے تو کبھی بھولے سے بھی میرا نام لیا تھا . . . مگر وہ مجھی کو سب سے زیادہ نمبر دیتی تھیں . . . . . ہُونہہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ میں تو ہر پرچہ میں اوّل آتی تھی . . . لیکن کوئی اُستانی اتنے نمبر نہیں دیتی تھیں مس فنانس تو اسّی پچاسی دیتی تھیں . . . ہُونہہ! صرف زیادہ نمبر دیدیئے تو کیا ہوا۔ مجھے کتنی خوشی ہوتی اگر وہ کلاس میں لڑکیوں کے سامنے میری تعریف کرتیں اور کہتیں دیکھو گلنار نے کتنے نمبر لئے ہیں۔ فلاں نمبر نے اتنے مارکس لئے ہیں، فلاں نمبر نے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے، فلاں نمبر، فلاں نمبر، میں تو بس "فلاں نمبر" ہی ہو کر رہگئی تھی ـــــ اور وہ مس جونس جو تھیں آکسفورڈ کی ایم۔ اے، وہ تو آدھ آدھ گھنٹے تک میرے مضمون کی تعریف ہی کرتی تھیں گو اُنکے جانچنے کا معیار بہت ہی اعلیٰ تھا۔ اور مسز شوئیل! سروجنی نے کہا تھا نا کہ وہ میرا پرچہ لئے بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔ "ماشاءاللہ گلنار نے تو اسدفعہ کمال ہی کر دیا۔ کتنے اچھے جواب ہیں۔ میں نے تو اس پرچے کو کئی مرتبہ پڑھا ـــــ" وہ دوسری ٹیچرس اور لڑکیوں کے سامنے ہمیشہ میری تعریف کرتی رہتی تھیں اور مس

کملاہائی بھی۔ لیڈی ٹیچرس تو کیا مرد پروفیسر بھی میری ذہانت اور قابلیت کی داد دیتے تھے! فقط تھیں تو مس فنانس جو تعریف میں ایک لفظ بھی کہنا شاید اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھیں ـــ ہُونہہ!

اور میرا دل کیسے چاہتا تھا کہ وہ میرے حُسن کی تعریف کریں ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھی بیتابی سے کہدیں۔ "گلنار! تم کتنی حسین ہو!" کم از کم ایک دفعہ اُنکے مُنہ سے نکلجائے "آج تو تم بہت خوبصورت نظر آرہی ہو گلنار!" یا یہی سہی "یہ ساری تو تمھیں بہت سجتی ہے"۔ میں اُسکے لئے کتنے ہی جتن کرتی تھی جس دن اُنکا گھنٹہ ہوتا وہی ساریاں پہنتی جو مجھے بہت بھاتی تھیں۔ بالوں کو خاص توجہ سے سنوارتی کبھی کبھی بوٹو لگاتی۔ اچھی اچھی خوشرنگ چوٹیاں پہنتی، اور مجھے اپنی کلائیوں اور اُنگلیوں پر بہت ہی ناز تھا۔ میں اپنے ہاتھ میز پر اِس انداز سے ٹیکے رہتی کہ چوڑیاں جم کر کلائیوں پر آپڑیں۔ اور مس فنانس کی سیٹ سے اُنگلیوں کی خوبصورتی کا اچھی طرح جائزہ لیا جاسکے ... مگر یہ تو ظاہر تھا کہ وہ مجھے حسین سمجھتی تھیں۔ ورنہ یوں نہ تکتی رہتیں اور جب کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ آج خصوصیت سے اچھی نظر آرہی ہوں ایسے موقعوں پر تو وہ مجھے بہت ہی توجہ سے دیکھ رہی ہوتیں۔ اُنکی نگاہ مجھ پر سے ہٹتی ہی نہ تھی.. ... اچھا یونہی سہی۔ لیکن کیا میں ایک پتھر کا مجسمہ تھی یا نقاش کی کھینچی ہوئی تصویر تھی کہ یوں خاموش دادملتی۔ آخر میں ایک انسان تھی۔ ایک سترہ سالہ نوخیز لڑکی۔ رُومانی اور جذباتی! کبھی تعریف کردیتیں تو اُنکا خزانہ کھوجاتا؟۔ مانا بھی کہ وہ پروفیسر تھیں۔ مسز سوشیل بھی تو پروفیسر ہی تھیں۔ کیا وہ میری

صورت کی تعریف نہ کرتی تھیں۔ اُسدن جب مجھے ایک ٹیابلو میں حصّہ لینا تھا جسمیں یہ بتایا جانیوالا تھا کہ ملکۂ نورجہاں رقص اور موسیقی سے لُطف اندوز ہو رہی ہے مسز سوشیل میرا میک اَپ کرتی ہوئی کیسے سراہتی جاتی تھیں "گلنار! نورجہاں کی تمثیل کیلئے تم ہی موزوں ہو تم کیسی اچھی انگریزی لکھتی ہو مسٹر سوشیل بھی تمھارے ہی گُن گاتے رہتے ہیں۔ وہ بھی تمھارے لیچر رہ چکے ہیں نا" پوڈر، کریم روج لگا چکنے کے بعد اُنھوں نے کہا۔ "اب آنکھیں اوپر اُٹھاؤ، انکا بھی میک اَپ کر دوں" ــــ میں نے آنکھیں اُٹھائیں تو "واللہ! کتنی خوبصورت آنکھیں!!" اور کس شدّت سے میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی۔ کہ کاش مسز سوشیل کے بجائے مس فنانس ہوتیں، آخر میں مسز سوشیل ہی کو کیوں نہ چاہتی۔ مس فنانس میں کونسے سُرخاب کے پر لگے تھے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ اور زرینہ بھی تو میری آنکھوں کی تعریف کرتے کرتے تھکتی ہی نہ تھیں! اور للیتا! وہ تو اشعار لکھا کرتی تھی میری آنکھوں پر! زینی بھی کہا کرتی تھی نا گلنار، تم چشمہ نہ پہنا کرو۔ یہ تمھاری حسین آنکھوں کو چھپا دیتا ہے" سبھی تعریف کرتی تھیں۔ اِسی لئے تو میں اسکا خاص خیال رکھتی تھی کہ مس فنانس میری آنکھوں کو دیکھیں اور اُنکی کلاس میں چشمہ بھی تو اُتار کر رکھدیتی تھی۔ گو مجھے بورڈ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے میں بڑی دقّت ہوتی ہُونہہ! اس بے حس پر کچھ بھی اثر ہوتا تھا؟ مگر پرویز، پرویز کی حُسن شناس نگاہیں پہلی ہی نظر میں میری آنکھوں کا حُسن دیکھ لینگی۔ وہ بے اختیار کہہ اُٹھینگی۔ "تمھاری آنکھیں، غزالی آنکھیں، کتنی سیاہ! کیسی مدھ بھری!! ۔ ۔ ۔ ۔

. . . . کالج ڈے میں تو میں نے صرف اسلئے ڈرامہ میں پارٹ کیا تھا کہ مس فنانس دیکھیں۔ اسدن کیلئے برناڈ شا کے ڈرامہ "سینٹ جون" Saint Joan کا انتخاب ہوا تھا۔ اور میں جون بنی تھی۔ مجھے کیسی اچھی طرح سنوارا گیا تھا۔ میں خود آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ پھر مجھے ہنسی بھی آگئی۔ جون ایک دیہاتی لڑکی، پھر وہ ایک قیدی جو کورٹ میں لائی جارہی تھی۔ کیا اُسوقت بنی سنوری ہوگی۔ لیکن یہاں کے فلموں اور اسٹیجوں پر تو صرف یہی خیال رکھا جاتا ہے کہ جو لڑکی ہیروئن کا پارٹ کرے وہ خوبصورت ہو اور اُسے اچھی طرح سنوارا جائے۔ لیکن یہ تو مسز سوشیل اور مس جونس کی غلطی نہ تھی۔ اُنھوں نے میرا ٹھیک ہی میک اَپ کیا تھا۔ مس جونس نے اپنا خاکی رنگ کا رائیڈنگ سوٹ مجھے پہنایا تھا۔ خاکی کوٹ اور خاکی پتلون۔ اور میرے لانبے بال پنوں میں لپیٹ کر شانوں پر ڈالدیئے گئے تھے۔ بالوں میں کنگھی تک نہ کی تھی۔ بال پیشانی پر اور رخساروں پر نہایت بے ترتیبی سے بکھیر دیئے گئے تھے۔ غلطی تو ویڈیسی کی تھی جس نے ڈیوک آف وارک کا پارٹ کیا تھا۔ وہ اپنے لبوں پر لپ اسٹک لگا رہی تھی۔ ڈرامہ کا وقت ہوگیا تھا۔ مجھے جاتے دیکھ کر اُس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچ لیا ـــــ "ہائے گلنار! یہ کیا؟ تم تو ہیروئن ہو، نہ روژ نہ لپ اسٹک!" ـــــ اُس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگادیا اور گالوں پر روژ مل دیا۔ اور جاتے ہوئے میں نے آئینہ پر نظر ڈالی تو خود ہی ٹھٹک گئی۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے رُوکھے

بال تو اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا مس فنانس آج میری تعریف ضرور کرینگی۔ بلکہ تعریف کرنے پر مجبور ہو جائینگی۔ ڈرامہ کے اختتام پر مسز شوپل، مس جونس، مسز ڈیانیل دوڑی ہوئی اسٹیج پر چڑھ آئیں اور پردے کے پیچھے آکر بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے مجھے مبارکباد دی کہ میں نے جون کے سے مشکل پارٹ کو بہت اچھی طرح نبھایا تھا۔ سب میری اداکاری پر عش عش کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ اور مس فنانس؟ انھوں نے حاضرین میں شامل ہو کر ڈرامہ دیکھا تک نہیں۔ پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر اداکار لڑکیوں کو ہدایت دیتی رہیں۔ میں نے کتنی التجا کیساتھ کہا تھا کہ حاضرین میں بیٹھ کر ڈرامہ دیکھیں۔ اُنکے دونوں شانے پکڑ کر نہایت ملتجی نگاہوں سے اُنھیں دیکھا تھا۔ میری یہ ملتجی نگاہیں تو پتھر سے دل کو پگھلا دیتیں لیکن وہ تو شاید پتھر سے بھی زیادہ بے حس تھیں۔ "گلنار کیا کروں میں نے اپنے ذمہ یہ کام لیا ہے تو مجھے کرنا ہی ہوگا"۔ واہ رے تمھارا کام! تاہم انھوں نے پردے کے پیچھے سے تو دیکھا تھا۔

اس رات مجھے ہوسٹل لوٹنے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ گو ہاسٹل کالج ہی کے کمپاؤنڈ میں تھا۔ لڑکیاں قدم قدم پر مجھے گھیر لیتی تھیں "گلنار! تمنے تو کمال ہی کر دیا، تمھاری اداکاری کے کیا کہنے" ——— "تم اسٹیج پر کیسی حسین نظر آرہی تھیں گلنار!" ——— ان سب سے پیچھا چھڑا کر تھکی ہاری ہوسٹل لوٹی۔ زرینہ باہر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی "میری گلنار۔ تم بال کٹوا کر یونہی میک اَپ کیا کرو نا۔ آج تو تم

پری معلوم ہو رہی ہو لیکن بھئی جون کیلئے تمھارا میک اَپ ٹھیک نہ تھا۔ انکوئیزیٹر Inquisitor کہہ رہا تھا "Joan you look pale to" "ٹھہلہ اور تمھارے گالوں سے شفق پھوٹ رہی تھی!" ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے ڈائننگ ہال پہنچے۔ سب لڑکیاں کھانے پر بیٹھ چکی تھیں۔ میرے آتے ہی سبھوں نے تعریف کی بوچھار کر دی۔ اور اُس رات میں کیسی خوش خوش بستر پر جا لیٹی تھی۔ نیند ہی نہ آتی تھی ہُونہہ! ان سب تعریفوں کی مجھے کیا پروا؟ کل میں اپنی مس فنانس اپنی اینجلینا سے ملونگی تو وہ یہ کہینگی، وہ کہینگی، یوں تعریف کرینگی ....

دوسری صبح ان اُمنگوں اور اُمیدوں کو لئے ہوئے گئی تو اپنی اینجلینا کے پاس کیا رکھا تھا؟ ایک جذبات سے عاری چہرہ اور پھیکی بے مزہ باتیں .... زرینہ سچ کہتی تھی "گلنار، تم اتنی رومانوی لڑکی اور مس فنانس کی سی بے حس اور سرد مہر، کہیں تمھارا جوڑ بھی ہے۔ تم تو آگ ہو اور وہ برف .... ہاں وہ ضرور جذبات سے بالکل عاری تھیں۔ بے حس اور مُردہ دل، پتھر کا مجسمہ، برف کا تودہ! بھلا پرویز سے انکی کیا مُناسبت؟ میرے پرویز کی رگ رگ میں زندگی ہے، بجلی ہے۔ تصویر ہی میں وہ کتنے رومانٹک معلوم ہوتے تھے اور میں نے اُسدن چوری سے جھانک کر اُنھیں دیکھ لیا تھا نا! جب ابّا نے اُنھیں سلامی دینے (نذرانہ دینے) کیلئے کھانے پر مدعو کیا تھا، اُسدن زرینہ بھی آئی ہوئی تھی اور حبین بھی ــــ "دولھا بھائی آگئے" زبیدہ کی آواز آئی اور میرا دل کیسے دھڑکنے لگا۔ زرینہ اور حبین بھاگ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں

زرینہ بھی مجھے گھسیٹنے لگی ــــ "اُٹھو گلنار! تم بھی اپنے دولھا کو دیکھ لو نا ــــ" میں پہلے تو جھجکی۔ گو میرا جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ اُنھیں ایک نظر دیکھ لوں ــــ "امی کیا کہینگی؟" ــــ "اری امی کی بچی اُٹھ۔ ایسا زریں موقعہ کھو دیگی۔" زرینہ نے آخر مجھے کھینچ ہی لیا۔ وہ ابا کے سامنے کیسے شرمائے شرمائے کھڑے تھے۔ پھر جب وہ ہال میں آئے تو ہمنے دروازے کے سوراخوں میں سے جھانکنے کی کوشش کی ــــ کمبخت سوراخ کتنے چھوٹے تھے آخر ہمیں ایک ترکیب سُوجھ ہی گئی۔ جین نے ہمارے کمرے کی روشنی گل کردی تاکہ باہر والے ہمیں نہ دیکھ سکیں۔ اور زرینہ نے آہستہ سے چٹخنی کھولکر ایک کواڑ کو ذرا سا کھولدیا۔ پھر کیا تھا جین اور زرینہ دونوں ٹوٹ پڑیں مگر میں نہ جانے کیوں پیچھے ہٹ گئی ۔۔۔۔

"بڑا خوبصورت نوجوان ہے گل!" زرینہ نے فرطِ مسرت سے گلے لگا لیا میں نے شرما کر آنکھیں جھکالیں ــــ "میری گل! ایسا اچھا جوڑ ہے تیرا اور اسکا" وہ میری تھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اُٹھاتے ہوئے بولی ــــ "اسکی آنکھوں سے کیسی محبت ٹپک رہی ہے!" وہ پھر جھانکنے لگی ــــ "فارم بھی بہت اچھا ہے اور آنکھیں کیسی حسین ہیں۔ ادھر آ تو گل! بڑی آئی کہیں کی امّی سے ڈرنے والی" زرینہ مجھے پھر گھسیٹنے لگی ــــ "دیکھا تو نے اپنے پرویز کی آنکھوں کو؟ بخدا تیری آنکھوں کا جواب ہیں وہ تو!" ۔۔۔۔۔ ہاں میں نے دیکھا، سب کچھ دیکھا اُس خوبصورت چہرے کو، ان متبسم آمیز ہونٹوں کو، اُن حسین آنکھوں کو جن میں شوخی اور بیتابی کُوٹ کُوٹ کر بھری تھی ۔۔۔۔ "اری بڑا رومانٹک معلوم ہوتا

گل تجھ پر دیوانہ نہ ہو جائے تو میرا ذمہ! ابھی سے کہے دیتی ہوں گل، وہ تجھے آنکھوں میں بٹھائیگا، گلے کا ہار بنالیگا" اور میں وفور جذبات سے پھنکی جا رہی تھی۔ اُسکے بازوؤں میں گر پڑی ..." دیوانی مس فنانس پر مری جاتی تھی۔ آخر تو نے کیا اُمیدیں باندھ رکھی تھیں اس پتھر کی سی بیحس عورت سے مسرت یا رنج، غصہ ہو یا بیتابی، وہی پھیکا چہرہ، وہی بے نور آنکھیں! پرویز کو دیکھ کتنا اکسپریشن ہے اُسکے چہرے پر۔ گویا جذبات کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں" ... ہاں اسوقت وہ مجسم اضطراب نظر آرہے تھے۔ اُنکی آنکھیں کس بیتابی سے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں کیوں؟ شاید اسلئے کہ کہیں میں نظر آجاؤں!

جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ دروازے توڑ دوں، سب کی موجودگی کو فراموش کرتے ہوئے اُنکے سامنے جا کھڑی ہو جاؤں ... کاش میں کسی پردے کی آڑ ہی میں کھڑی ہوتی، ایک لمحے کیلئے پردہ کھسک جاتا اور میں اُن کی طرف شوخ نظروں سے دیکھ کر مُسکرا دیتی پھر جلدی سے نظریں جُھکا کر شرما جاتی اور اُنھیں دم بخود کر دیتی! ہاں وہ ضرور دم بخود ہو جاتے۔ میں اس نیلی جارجٹ کی نقرئی باڈر والی ساری میں بہت دلکش نظر آرہی تھی نا؟ ... بھونچہ میں یہ ساری کیوں پہنکر جاؤں میں وہ جارجٹ کی ساری پہنونگی جو میرے پرویز کی لائی ہوئی ہے۔ میں نے ساری کھینچکر پھینکدی جو ابھی ابھی پہن رہی تھی۔ اور ذکیہ کو آواز دی۔ ذکیہ ایک برتن میں سموسے لئے جا رہی تھی۔ "ذکیہ ذرا میری نیلی ساری لے آنا وہی جارجٹ کی" ـــــ "اچھا لے آؤنگی مگر تم جلد آنا امی کہہ رہی تھیں کہ وہ مس فنانس کیساتھ کھانے پر نہیں بیٹھیں گی۔ اُن کی

بجائے تم بیٹھو تو بہتر ہے۔

میں نے بے پروائی سے اُس کمرے کی طرف نگاہ کی مس فنانس ہاتھ پر تھوڑی رکھے اوپر دیکھ رہی تھیں۔ جذبات سے خالی بے نور آنکھیں۔ بید پتلے پھیکے رنگ کے ہونٹ، زرد چہرہ جسپر چیچک کے داغ ہی داغ تھے۔ مجھے ایسا دکھائی دینے لگا کہ وہ داغ بڑھ رہے ہیں، گہرے ہوتے ہیں اور پھیلتے جا رہے ہیں، اُنکی صورت کیسی کریہہ ہوتی جا رہی تھی۔ میں جلدی سے اندر کھسک گئی اور سر کو زور سے جھٹکا دیا کہ دماغ پر کھینچی ہوئی تصویر ہٹ جائے اُسکی جگہ دماغ کے پردہ پر ایک تصویر اُبھرنے لگی پرویز کی! وہ خوبصورت نیلی آنکھیں، بڑی بڑی، بادامی نشیلی، لانبی اور خمیدہ پلکیں، بیضوی چہرہ، کشادہ حسین پیشانی، اور ہونٹ؟ کتنی حسین تراش تھی ان ہونٹوں کی۔ رسیلے بھرے ہوئے اور کناروں پر وہ ہلکا سا خم گویا وہ مُسکرانے کیلئے ہی بنائے گئے ہوں۔ وہ سانولا سانولا رنگ، شیام سندر! ہاں میرے شیام اور میں رادھا! میں نے میز پر رکھی ہوئی تصویر اُٹھالی .... پرویز کی، اور فرطِ بیتابی سے اُسے چُوم لیا۔ "یہی ساری نا؟"... میں نے گھبرا کر تصویر رکھدی کیونکہ ساری لئے کھڑی تھی۔ "ہاں یہی" "آپا جلدی آؤ نا سموسے ٹھنڈے ہوتے ہیں اور یہاں ساریوں پر ساریاں بدلی جا رہی ہیں۔ اِدھر یہ بے پرواہی اور اُدھر دیکھو تو مس فنانس نے گلنار گلنار ہی کی رٹ لگا رکھی ہے۔"

"اچھا ابھی آئی۔" میں نے پھر تصویر اُٹھالی اور سب کچھ بھول کر اسی حسین تصویر میں کھو گئی۔ کیسا ہنس مکھ چہرہ۔ آہا یہ ہونٹ! نظر پہلے ان ہونٹوں

پر ہی جا جمتی تھی ۔ یہ ہونٹ اور ——— اُف! کیا خیال آگیا ہے ۔ میں مارے شرم کے عرق عرق ہوگئی ۔ میں نے تصویر رکھ دی اور ساری پہننے لگی ..... اُن کی شخصیت میں کتنی دلکشی تھی! ——— اُف ——— کس بلا کا سجیلا پن! گٹھا ہوا بدن، دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، لانبے مضبوط بازو ۔ اِن بازوؤں میں .. ہتھیلیاں گول بھلیاں جو samuse کھاتے ہیں ویسی ہی تھیں ..... جیسے رگ رگ میں بجلیاں کوند رہی تھیں، دل کی دھڑکن کیسی تیز ہو رہی تھی! ۔ اور خون جیسے اُبلا جا رہا ہو ۔ نس نس میں گرمی، آگ، اُف یہ جذبات کا ہجوم، یہ طوفان! میں بستر پر گر پڑی اور تکیوں میں مُنہ چھپا لیا ——— یہ ہیجان کیسی لذت تھی اس میں!

"گلنار آخر تمھیں کیا ہو گیا ہے ———؟" میں نے چونک کر دیکھا امّی کھڑی تھیں ۔ اُن کا چہرہ غصّہ سے تمتما رہا تھا ——— "مس فنانس کب سے تمھارا انتظار کر رہی ہیں تمھیں کچھ پاس بھی ہے بڑوں کا ۔ اور وہ تو تمھاری اُستانی ہیں ———" امّی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں ۔

"تمھارا انتظار کر رہی ہیں، تمھیں کو یاد کر رہی ہیں، تمھارے نام کی رٹ لگا رکھی ہے" اچھا بھئی جاؤں گی ..... ہاں کیوں نہیں ضرور جاؤں گی ۔ یہ ساری پہن کر جو میرے پرویز نے لا کر دی ہے ۔ اور ہاں وہ انگوٹھی بھی پہنوں گی جو پرویز سے میرے منسوب ہونے کی نشانی ہے میں نے ایک چھوٹی سی مخمل کی ڈبیہ نکالی کیسی خوبصورت انگوٹھی تھی ۔

میری "انگیجنٹ رنگ" P. Engagement Ring. پرویز کے نام کا پہلا حرف کس خوبصورتی سے تراشا گیا تھا! ہیروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کئے دیتی تھی۔ اور ان سفید نگینوں میں ایک سبز رنگ جگمگا رہا تھا۔ میں نے فخر سے دیکھا اور انگوٹھی پہن لی۔ ہاں اسی طرح جاؤنگی اور انھیں بتادوں گی کہ مجھے اپنی شادی کی کس قدر خوشی ہے۔ وہ اپنے دل میں خیال کر رہی ہوں گی کہ میں اُن سے شرمندہ ہوں۔ مُنہ بسورے ہوئے بڑی ہی مغموم صورت بنائے اُن کے پاس آؤں گی، درد بھرے لہجہ میں اپنی مصیبت بیان کروں گی کہ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ اور شاید رونے بھی لگوں۔ ہُونہہ! ——— میں انھیں کیسے حیران کردوں گی! ساری پر نظر پڑتے ہی کہہ اُٹھیں گی نا:

"کیسی خوبصورت ساری ہے"

اور میں بڑے فخر سے کہوں گی کہ یہ پرویز لائے ہیں۔ پرویز ہی کی باتیں کروں گی۔ خوشی سے جھومتی ہوئی انھیں بتاؤں گی کہ پرویز کس قدر حسین ہیں۔ انھیں اپنی شادی میں شرکت کرنے کے لئے اصرار کروں گی اور ——— جذبات کی شدت کا پورے طور پر اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہدوں گی کہ ——— میں پرویز سے کتنی محبت کرتی ہوں ——— یہ سُنکر بس جل ہی جائیں گی ——— جلیں گی؟ کیوں؟ ہ۔ ضرور۔ اُس وقت [illegible] جب میں چھٹی لئے بغیر گھر آئی تھی۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھیں نا ——— "گلنار کہیں تمھاری شادی تو نہیں ہو رہی ہے؟" ——— میں نے کہا ——— "نہیں"

اُنھیں یقین ہی نہ آتا تھا ـــــ "تم مجھ سے چھپاتی ہو گلنار!"
اور جبھی تو اُنھوں نے میری منگنی کی خبر ملنے پر مبارک باد تک نہ لکھ بھیجی تھی . . . . . .

اور اب تو میرے چہرے پہ بجائے رنج کے یہ وفورِ شوق، مسرت اور بے تابی دیکھ کر کیسے جل اُٹھیں گی ـــــ ہُونہہ! جلیں گی تو جلیں! خوب جلیں۔ میری بلا سے!!

میں نے چلتے چلتے پرویز کی تصویر بھی لے لی۔

۲۳۳

آشیانہ

مدھوسودن

صفحات :- ۴۰

مہندر آخری آدمی تھا جو رات آشیانے میں لوٹا۔ رندھیر اس رات گھر نہیں آیا تھا۔ وہ اکثر رات کو گھر نہیں آتا تھا۔ مہندر نے اندھیرے میں ٹٹول کر بجلی کا بٹن دبایا لیکن روشنی نہیں ہوئی۔ شاید آج پھر فیوز اڑ گیا تھا آشیانے میں اندھیرا تھا مہندر نے کسی کو آواز نہ دی اُسے معلوم تھا کہ باقی سب چھت پر سوئے ہوئے ہونگے درمیان کے دروازے سے گذر کر وہ اندر کمرے میں چلا گیا۔ جہاں گلی کے لیمپ پوسٹ کی روشنی آتی تھی۔ آشیانہ بلڈنگ کا یہ فلیٹ ایک کمرے اور کچن پر مشتمل تھا اور اسمیں پانچ نوجوان رہتے تھے۔ مہندر جسوقت بھی مکان کے اندر آتا تھا، یہاں کی بے ترتیبی اور سامان کی بھیڑ کو دیکھ کر اُسے جگہ کی قلت کا ایک گھٹا ہوا سا احساس ہوتا تھا، چھ مہینے یہاں رہنے کے باوجود یہ احساس زائل نہ ہوا تھا، وہ اس کا عادی نہ ہوا تھا۔

گلی میں سے آتی ہوئی لیمپ پوسٹ کی روشنی میں وہ کپڑے بدلنے لگا
کمرے میں ایک ہلکی سی روشنی تھی جس سے سامان کی زیادتی کا احساس ہوتا تھا
کواڑوں پر کھونٹیوں پر، زمین پر پڑے ہوئے میلے کپڑے، بے ترتیبی سے بکھرا ہوا سامان
جوتے، کتابیں، ٹرنک، سب اسطرح پھیلے پڑے تھے جیسے کسی کو انکی پروا
نہ تھی۔ ایک عجیب سی بے پروائی اس فلیٹ کے رہنے والوں پر چھائی ہوئی
تھی جسے مہندر اب آہستہ آہستہ سمجھنے لگا تھا۔ اس فلیٹ کے رہنے والے
[illegible] اپنی زندگی کی بہتری کیلئے ایک بھیانک کشمکش میں مبتلا تھے۔ اپنے
گھروں کو چھوڑ کر بمبئی آئے ہوئے تھے، اس چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے جو
صرف ایک جوڑے کیلئے بنایا گیا تھا۔ پے در پے ناکامیوں نے انھیں بے پروا
بنا دیا تھا، انھیں ذمہ داری سے نفرت ہوگئی تھی، سلیقے سے نفرت ہوگئی تھی
انھیں اب نہ صفائی کی چاہ رہی تھی نہ ترتیب کی۔ مہندر ان لوگوں میں ابھی نیا
تھا اور اس ماحول میں ایک گھٹن سی محسوس کرتا تھا۔ وہ ادیب تھا اور فلم میں نوکری
کرنے آیا تھا، لیکن پچھلے چھ مہینے کوشش کرنے کے باوجود کسی پروڈیوسر نے
اُسے موقع نہ دیا تھا۔ آج وہ خوش تھا۔ آج ایک دوست نے اُس سے وعدہ کیا تھا
کہ وہ اُسکے لئے کچھ کریگا۔ اور آج اُسے ایک لڑکی ملی تھی۔ کپڑے بدلکر اُس نے
سوچا کہ جاکر اوپر چھت پر سو رہے لیکن اسوقت وہ اکیلا رہنا چاہتا تھا، اکیلا
رہکر سوچنا چاہتا تھا مستقبل کے بے پایاں اندھیرے میں جو ایک چراغ
کی لو اٹھی تھی اُس سے محظوظ ہونا چاہتا تھا۔ بستر کو جھاڑ کر اُس نے کھڑکی کے
سامنے کھینچا اور لیٹ گیا۔ باہر ناریل کے اونچے اونچے درخت ہوا میں ہل رہے

تھے اور اُنکے عقب میں آسمان پر ایک ہلکی سی سفیدی پھیلی ہوئی تھی۔ اُس شدت درختوں کو دیکھ کر اُسے ایک خوبصورتی کا احساس ہوا آج اُسے کہٹی ملی تھی۔ سر جھکا

شام وہ اُداس تھا۔ آشیانے کے دوست باہر گئے ہوئے تھے وہ اکیلا تھا۔ تنہائی میں اکثر اُسکے دل میں اُداسی کا بے ذائقہ تیزاب پھیل جاتا تھا۔ زندگی کی ناکامرانی ایک مغموم دُھند بنکر چھا جاتی تھی۔ اسوقت وہ اکثر سمندر کے کنارے ٹہلنے چلا جاتا تھا۔ لیکن جب دل اُداس ہو تو نہ سمندر کی بیچین لہریں خوبصورت ہوتی ہیں، نہ شفق کے زریں حُسن میں وہ جانبخش تازگی اور سمندری اُفق پر چھایا ہوا دُھندلکا۔ اُسے ایک بے پناہ یاسیت میں لپیٹ دیتا۔ اُسے محسوس ہوتا کہ تمام کائنات ماتم میں ہے، یہ انسان کی دنیا دُکھی ہے۔ اور رگ رگ میں کرب و اضطراب کی ایک دیر پا لہر دوڑ جاتی، زندگی سے مایوسی ہو جاتی۔

شام وہ بہت اُداس تھا۔ یہ کیوں ہوتا ہے کہ انسان ناکامیوں سے ٹکرا کر جان دیدیتے ہیں، یہ کیوں ہوتا ہے کہ اُنھیں زندگی میں کبھی خوشی نہیں ملتی اور مسرت کی ایک نوخیز کرن کو دیکھنے سے پہلے موت کے بیکراں اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں؟ یہ زندگی موت سے بدتر ہے، نہ روپیہ پاس ہے، نہ عورت ہے، نہ محبت ہے، نہ خوشی ہے۔ سمندر کا حسن بیکار ہے، لہروں کا مسلسل شور بے معنی ہے، شفق کی سُرخی بیسود ہے۔ اس تہذیب کی دنیا میں روپیہ چاہیئے۔ روپے کے بغیر خوبصورتی متاثر نہیں کرتی، حُسن اثر نہیں کرتا۔ یہ چیزیں تمھارے لئے نہیں ہیں۔ نادار ہو کر تم دنیا کے دُکھ کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ تمام انسانیت کا دُکھ تمھارے سینے میں سمٹ آتا ہے۔ آج وہ بہت اُداس تھا اور سوچتا رہا اور اندھیرے کے ذرات فضا میں

گھنے ناریل کے درختوں پر تاریکی چھاتی گئی اور کمرا ایک اُداس، بے مصرف کمرہ جان اندھیرے سے معمور ہوتا گیا۔

اچانک اُس نے ایک آواز سُنی۔ کھنہ اُسے نیچے گلی میں سے بلا رہا تھا۔ مہندر نے جھانک کر بالکنی سے دیکھا۔ کھنہ کیتھا کار میں دو پارسی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ لڑکیوں نے شوخ رنگ کے فراک پہنے ہوئے تھے۔ کھنہ اوپر آگیا تھا۔ اُس نے مہندر کو ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ وہ یونہی سیر کو جا رہے تھے۔ یہ لڑکیاں اُسے دادر پر ملی تھیں، ایکبار مسکرائی تھیں، دوسری بار کہنے پر کار میں آبیٹھی تھیں۔ کھنہ اکیلا تھا، لڑکیاں دو تھیں۔ وہ مہندر کا ساتھ چاہتا تھا۔ مہندر اُنکے ساتھ چلا گیا۔

اور آج شام کتنی خوبصورتی سے گذری تھی۔ وہ اُداسی نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ ایک عورت کے قُرب نے دل کی پژمُردہ کیفیت کو دُور کر دیا تھا۔ یہ ریشمی کپڑوں کے نیچے اُسکے جسم کا لمس تھا، اُسکے جسم کی حرارت تھی، مُلائمیت تھی، کچھ تھا جس نے اُسکی رگوں میں زندگی کی مضطرب لہر دوڑا دی تھی۔ پچھلی سیٹ پر کیٹی اُسکے ساتھ تنہا تھی اور کار باندرہ کے پُل پر اُڑی جا رہی تھی، سمندر کا پانی نیلا تھا، آسمان کیطرح نیلا، دور ایک کشتی اپنے سفید بادبان پھیلائے جا رہی تھی، ہوا سے کیٹی کے بال اُڑ رہے تھے، ساحل پر ناریل کے درخت کھڑے تھے، دُور سے نظر آتے تھے جیسے ابھی اپنے بچپن میں ہوں۔ اور کار باندرہ کے پُل پر بھاگی جا رہی تھی۔ کیٹی نے آہستہ سے جُھک کر اُسکے کان میں کہا۔ آئی لَو یُو، مجھے تم سے عشق ہے۔ مہندر نے اپنا بازو اُسکی کمر کے گرد ڈال لیا اور کیٹی اُسکے قریب سمٹ آئی۔ مجھے تم سے عشق ہے، تمہارے اس جسم سے عشق ہے جسکی حرارت میری روح میں جذب ہو رہی ہے

تمہارے اس فقرے سے جسے کہکر تمنے میرے سینے میں سوئی ہوئی اُس شدت کو جگا دیا ہے، اور کٹی کے کمر کے گرد اُسکے بازو کا حلقہ تنگ ہوگیا، وہ کٹی پر جھکا اُسکے سُرخ ہونٹوں کو چُوم لینے کیلئے کٹی مُسکرائی اور اُس نے اپنا چہرہ ہٹا لیا۔ کار ساحل پر رُک گئی تھی، وہ کار سے اُتر کر ساحل پر ٹہلنے چلے گئے۔ آج ساحل پر بھیڑ نہ تھی۔ سمندر کے وسیع کنارے پر صرف چند آدمی نظر آرہے تھے، وہ ساحل پر ٹہلتے رہے، سورج غروب ہوچکا تھا، سمندری اُفق پر ایک ہلکی سی سرخی کا سایہ باقی تھا اور سمندر کی بسیط سطح پر ننھی ننھی کشتیاں اپنے بادبان پھیلائے بہہ رہی تھیں۔ کٹی باتیں کر رہی تھی، وہ باتیں کرتے رہے، بے معنی باتیں۔ مہندر کو بُرا لگا جب کٹی نے کہا کہ یہاں سمندر کے کنارے سیر کرنے میں کوئی لطف نہیں۔ وہ کار میں بیٹھکر سیر کرنا چاہتی تھی، وہ واپس کار میں آبیٹھے۔ گھر سے چلتے ہوئے کھنہ نے پٹرول ڈلوالیا تھا۔ رات تک وہ کار میں بیٹھے سمندر کے کنارے کنارے بمبئی کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ مہندر خواہش کی آگ میں تپتا رہا اور کٹی نے اُسے اپنے ہونٹوں کو چُومنے کا موقع نہ دیا۔ اُنھوں نے کافے میں جاکر کھانا کھایا۔ کٹی اب جانا چاہتی تھی، اُس نے کہا ہمیں وہیں چھوڑ دو جہاں سے ساتھ لیا تھا۔ کھنہ نے اُنھیں دادر پر اُتار دیا۔ کٹی نے اگلے دن ملنے کا وعدہ کیا اور کار سے اُترتے ہوئے پھر مہندر کے کان میں کہا۔ آئی لَو یُو۔ اور مُسکراتی ہوئی چلی گئی۔

گھر آتے ہوئے کھنہ اور مہندر بحث کرتے رہے۔ یہ لڑکیاں کون تھیں کس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ بہت پڑھی لکھی نہ تھیں، انگریزی کے اُنھیں چند فقرے یاد تھے، ہندوستانی وہ ٹھیک سے بولتی نہ تھیں۔ اُنکی زبان گجراتی تھی اور اپنی زبان سے

آگے اُنھیں کچھ نہیں آتا تھا۔ پھر اسطرح مُسکرا کر کار میں آجانا، شاید وہ طوائفیں ہوں۔ مگر اُنھوں نے کچھ بھی تو نہیں مانگا، پھر کچھ بھی ہو وہ خوبصورت تھیں ایک شام اُنکے ساتھ رہی تھیں اور اس شام کا نشہ ابتک اُنکے ذہن پر طاری تھا۔

اگر وہ طوائفیں ہی ہوئیں، مہندر نے بستر پر لیٹے ہوئے سوچا۔ تو کم از کم اُسکے متعلق تو اُنھوں نے ضرور دھوکا کھایا۔ وہ کھنہ کی کار پر ریجھ گئیں لیکن اگر وہ اوپر جاتیں، یہاں آکر اس مکان کو دیکھ لیتیں تو کٹی کے ہونٹوں سے "آئی تو یُو" نہ نکلتا۔ اگر وہ طوائفیں نہ ہوتیں تب بھی اس مکان کو دیکھ کر بات کرنا گوارا نہ کرتیں۔ ہماری زندگی میں انسانی برتری کا معیار ایک کار ہے۔ مہندر نے دوہرایا، ایک کار انسان کو نظروں میں اُٹھا دیتی ہے، ایک کار نہ ہو تو انسان انسان نہیں رہتا، ایک کلرک، ایک مزدور۔ ایک سپاہی رہجاتا ہے۔ کٹی نے سوچا ہوگا کار کے مالک کھنہ کا دوست مفلس نہ ہوگا۔ اُسے کیا معلوم کہ آشیانے کا ہر ایک فرد اپنا سرمایہ ختم کر چکا ہے۔ اچھا ہوا وہ آشیانے میں نہیں آئی۔ ورنہ اسکا ہاتھ کٹی کی کمر کے گرد نہ جا سکتا۔

چھ مہینے پہلے جب مہندر بمبئی میں وارد ہوا تھا تو اُسے خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ زندھیر کی آشیانہ بلڈنگ مقابل ماہم پوسٹ آفس میں یہ حالت ہوگی۔ یہاں آکر دیکھا کہ آشیانہ بلڈنگ میں اُسکے پاس ایک کمرہ اور ایک کچن پر مشتمل ایک فلیٹ ہے جسمیں پہلے ہی پانچ آدمی رہتے ہیں۔ وہ چھٹا آدمی تھا۔ جو آشیانے میں رہنے کیلئے آیا۔

آشیانہ ماہم میں واقع ہے۔ ماہم شہر میں بدنام علاقہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں ماہم کے ہر مکان میں ایک طوائف ضرور رہتی ہے۔ اِن مکانوں میں زیادہ تر عیسائیوں کی

آبادی ہے۔ شروع شروع میں مکانوں کی بالکنیوں سے لٹکتی ہوئی ہر عورت کی سانولی، کالی یا بدصورت شکل کو دیکھ کر مہندر کو اُس پر طوائف ہونے کا شبہ ہوتا۔ بمبئی آکر اُسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ طوائفوں کے شہر میں آگیا ہے۔ اپنے اس احساس کا اُسے جواز نہ ملتا تھا۔ وہ خوش تھا کہ بمبئی نسبتاً آزاد خیال شہر ہے، یہاں عورتوں کو گھروں کی چہار دیواری میں گھوٹ کر نہیں رکھا جاتا، یہاں عورتیں بھی سمندر کے کنارے سیر کرنے جاتی ہیں۔ یہاں عورتیں بھی بسوں میں، ٹراموں میں، ریلوں میں سفر کرتی ہیں لیکن اکثر کسی عورت کو دیکھ کر اُسے احساس ہوتا کہ یہ طوائف ہے۔ طوائفوں کی اس کثیر تعداد کو دیکھ کر اُسے خیال آتا کہ انسان جتنا زیادہ مہذب ہوتا جاتا ہے طوائفیں بڑھتی جاتی ہیں اور یونہی بڑھتی جائینگی، اگر عورت کو مرد سے اور مرد کو سرمایہ دار کے چنگل سے آزاد نہ کیا گیا۔

آشیانہ بلڈنگ ایک عرصے تک مہندر کیلئے ایک طلسم رہی تھی۔ کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس عمارت میں رہنے والے کیسے رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں۔ فرشی منزل پر بائیں طرف ایک گجراتی رہتا ہے، خاموش، بعید۔ مہندر نے آج تک اُسے کسی سے بات کرتے نہیں سُنا۔ بمبئی کے آدمی، وہ سوچا کرتا ہے، ایک مخصوص تاجرانہ ذہنیت کے مالک ہیں، وہ انسانی دوستی پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ یہاں دو آدمیوں کے درمیان انسانیت کا رشتہ نہیں۔ روپیلی تاروں کا رشتہ ہے۔ انسان کے جذبات بھی جنس بن گئے ہیں۔ ہر شخص اپنی دھن میں مست ہے۔ ہر شخص کو اپنی پڑی ہے۔ ریلوں میں، بسوں میں، ٹراموں میں، گاڑیوں میں، ہر جگہ لوگ اپنے مطلب سے چلے جا رہے ہیں۔

فرشی منزل پر یہ گجراتی اپنی بیوی اور ایک بچے کیساتھ رہتا ہے۔ چند مرتبہ اسنے

گجراتی کی بیوی کو کھڑکی کی سلاخوں سے لگے دیکھا ہے، اسکا چہرہ زرد ہے، چہرے پر ایک عجیب بے رونقی چھائی رہتی ہے، جیسے اُسکی رگوں میں خون کی بجائے تیل بھرا ہُوا ہو۔ شام ہوئے وہ ٹائلیٹ کرتی ہے، نہاتی ہے، شام سے پہلے اُسنے گجراتی کی بیوی کو کبھی ٹائلٹ کئے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ دن میں جب بھی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی سو کر اُٹھی ہے۔ عمارت میں کسی اور سے گفتگو کرتے ہوئے بھی مہندر نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ اکثر اندھیرا ہونے کے بعد اوپر بالکنی میں کھڑا ہوا مہندر دیکھتا ہے کہ کوئی کار کبھی وہ ٹیکسی ہوتی ہے کبھی ذاتی کار، گلی کے موڑ پر رُکتی ہے، گجراتی اُسمیں سے اُتر کر گھر میں آتا ہے، پھر چند منٹ بعد بیوی کار میں آبیٹھتی ہے، کار چلی جاتی ہے۔

مہندر نے اکثر یہی ہوتے دیکھا تھا، اور ایک تجسّس اُسکے دل میں چٹکیاں لیتا رہا۔ پھر ایکدن برابر کے فلیٹ میں رہنے والے پنجابی نوجوان نے بتایا کہ گجراتی کی بیوی طوائف ہے، اور گجراتی؟ وہ اُسکا شوہر ہے اور اپنی بیوی کا ایجنٹ بھی۔ مہندر کو یکلخت یقین نہیں آیا، پھر اُسے یقین آگیا، پھر غصہ آیا، پھر رحم آیا۔

اس شخص کی وہ غیرت کہاں گئی جو اُس نے اپنے بزرگوں سے پائی تھی، وہ حمیت کہاں گئی، عزت کا وہ احساس کسی جہنم میں جھلس گیا جو انسان کو انسان بنائے رکھتا ہے، ایک دلّال، ایک بھکاری، ایک فقیر بننے سے بچاتا ہے۔ وہ کونسی منحوس ضرورت تھی جس نے سب کچھ نوچ لیا اور ذلت بھر دی، مہندر نے سوچا اور ایک بھیانک حقیقت اُسکے دل میں اُجاگر ہونے لگی، بھوک، بھوک، اور گجراتن کا بے رونق چہرہ اُسکے سامنے آگیا۔

یہ فرشی منزل کا پہلا فلیٹ ہے، اسمیں ایک گجراتی رہتا ہے اور اُسکی بیوی، اُن کے ایک بچّہ ہے۔

گجراتی کے مقابل کے فلیٹ کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔ یہ فلیٹ مالک مکان نے اپنے لئے رکھا ہوا ہے۔ وہ صرف ہفتے کی شام کو آتا ہے اُسکے ساتھ ایک عورت ہوتی ہے۔ یہ عورت ہمیشہ نئی ہوتی ہے لیکن اُسکی مُسکراہٹ، اُس کے انداز، اُسکی روح ہمیشہ ایک ہوتی ہے۔ عورت مالک مکان کے ساتھ اندر چلی جاتی ہے۔ مالک مکان کی کار اگلی شام تک باہر کھڑی رہتی ہے۔ اس کار کو کھڑا دیکھ کر بارہا مہندر کے دل میں بغاوت اور تشدّد کا ایک شدید جذبہ اُٹھتا ہے اور وہ بالکنی سے ہٹ کر اندر کمرے میں چلا جاتا ہے۔

دوسری منزل پر پہنچنے سے پہلے ایک کُتا بھونکتا ہے۔ اس کُتے کو دیکھی خارش ہے، اسکی آنکھوں میں ہمیشہ کیچڑ بھری رہتی ہے۔ آنے جانے والے پر وہ اسطرح بھونکتا ہے۔ جیسے وہ اُسکی تنہائی میں مُخل ہُوا ہو۔ مہندر نے اس کُتے کو دوسری منزل کی سیڑھیوں سے ہٹ کر اور کہیں نہیں دیکھا۔ یہ کُتا بھونکنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتا۔ چند بار بھونکنے کے بعد خود ہی سرنگوں ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اُسے دیکھ کر اکثر ایک ہمدردی سی ہو جاتی ہے، یہ کُتا دوسری منزل کے اِس عیسائی خاندان کا ہے۔ مہندر کو اکثر خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ عیسائی نہیں پارسی ہیں، لیکن اُسے کبھی یہ پوچھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ شوہر شاید بہت جلد اپنے کام پر چلا جاتا ہے اور بہت دیر میں واپس آتا ہے۔ دو تین مرتبہ کے علاوہ مہندر نے شاذ ہی اُسے دیکھا ہوگا لیکن اُسکی وہ چند تصویریں ذہن پر مُرتسم ہو گئی ہیں۔ ایکبار مہندر نے

دیکھا تھا کہ عیسائی (اگر وہ پارسی نہیں ہے) سیڑھیوں پر کھڑا ہوا خارش زدہ کُتّے کو پیار کر رہا تھا۔ اُسکی آنکھوں میں اُسوقت غمگُساری، دوستی اور ہمدردی کا ایسا جذبہ تھا کہ مہندر آجتک اُسے بھول نہ سکا۔ مہندر کو دیکھ کر اُس نے صرف ایکبار اپنی آنکھیں اُٹھائیں اور پھر کتے کو پیار کرنے لگا اور وہ ایک نظر آجتک مہندر کے سینے میں محفوظ ہے، جیسے وہ تمام دنیا کا دُکھ تمام دنیا کا غم اپنے دل میں لئے ہو۔

عیسائی کے کوٹ اور پتلون کو دیکھ کر ہمیشہ ایک مفلسی کا احساس ہوتا ہے اُڑے ہوئے رنگ کی ایک سیاہ ٹائی ہمیشہ اُسکے بشاشت سے محروم چہرے کو بے جان بنائے رکھتی ہے۔ عیسائی کے کئی بچے ہیں لیکن نجانے وہ کسطرح رہتے ہیں کہ گھر کے اندر سے کوئی آواز نہیں آتی، دروازہ بند رہتا ہے کبھی کبھی دیکھا جاتا ہے کہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور عیسائن دروازے کے پاس بیٹھی ہوئی سبزی فروش سے سودا کر رہی ہے، عیسائن ہمیشہ ٹخنوں تک نیچا ایک فراک پہنے رہتی ہے، اُسکی جلد سفید ہے لیکن جسم پر گوشت نام کو نہیں ہے۔ اسوقت اگر کوئی پاس سے گذرے تو وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں، جو اُسکے بے گوشت چہرے پر اور بھی بڑی معلوم ہوتی ہیں۔ اُٹھا کر دیکھتی ہے۔ بے مقصد، بے معنی نگاہ۔ ایک بچہ اکثر اُسکی گود میں ہوتا ہے یا اُسکا سایہ پکڑے پاس کھڑا ہوتا ہے۔ سبزی والے کے جانیکے بعد دروازہ پھر بند ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ مہندر کے زینے پر چڑھنے کی آواز سُنکر اچانک دروازہ کھلا ہے اور اُسے دیکھ کر پھر بند ہو گیا ہے اسوقت مہندر کو احساس ہوتا ہے جیسے یہ لوگ کسی کا انتظار کر رہے ہیں کسی ایسے شخص کا انتظار جو آکر انھیں نجات دلائے گا۔

انکے مقابل کے فلیٹ میں ایک مدراسن رہتی ہے مہندر اور اُسکے دو
میں سے جو اخبر میں باہر جاتا ہے وہ فلیٹ کی چابی مدراسن کو دے جاتا ہے۔
مدراسن ایک بیوہ ہے اور اپنی تین جوان لڑکیوں، بیٹے اور داماد کیساتھ رہتی ہے
اکثر زینے پر چڑھتے یا اُترتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ مدراسن کے گھر میں لڑائی
ہو رہی ہے لیکن جیسے وہ کسی کے آنے کی آواز سُنکر وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔
پچھلے مہینے سے مدراسن کا بیٹا پاگل ہو گیا ہے۔ وہ اب اکثر کھڑکی کی سلاخیں
پکڑے کھڑا رہتا ہے، بے حس، بے حرکت۔ اور خلا میں اسطرح تکتا رہتا ہے
جیسے اُسکی نظریں جامد ہو گئی ہوں۔ اُسے دیکھ کر اکثر دل پر سے ایک موہوم سے ڈر
کا سایہ گزر جاتا ہے۔ مدراسن کی کنواری جوان لڑکی کو دیکھ کر بھی ایک عجیب سا
احساس ہوتا ہے۔ اُسکی بڑی بڑی آنکھوں میں ہمیشہ ایک ایسا جذبہ ہوتا ہے گویا
وہ اپنے آپکو کسی وجہ سے کمتر خیال کرتی ہے۔ اُس سے زیادہ خاموش لڑکی
آشیانے کے دوستوں نے کبھی نہیں دیکھی اُس سے عشق کرنے کا خیال ہی نہیں
آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اُس سے عشق کرنا اُس سے ناجائز فائدہ اُٹھانا ہوگا
آشیانے کا کوئی دوست اُسے نظر بھر کر نہیں دیکھتا۔ مہندر، ہری، رندھیر، گورمکھ
وغیرہ سب اُوشا کو پھنسانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اُوشا مدراسن کی دوسری لڑکی
اور مدراس میں اپنے خاوند کو چھوڑ کر چلی آئی ہے۔ اوشا کا شوہر شرابی ہے۔ وہ خود
شراب پیتا ہے اور اُسے مارتا ہے۔ اور اُوشا اُسکے پاس رہنا نہیں چاہتی۔ سکو
اُوشا سے سخت ہمدردی ہے، آخر یہ کہاں کی انسانیت ہے، ایکدن مہندر سب کے
سامنے کہہ رہا تھا کہ ایک عورت اپنی جوانی کو یوں اُجاڑ دینے پر مجبور کر دی جائے۔

دکھاتا۔ سدن وہ مدراسن کی نگہداشت سے خصوصاً بیزار تھا۔ مدراسن اُوشا کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتی ہے۔ اُسے ایک لمحہ گھر سے باہر اکیلا نہیں رہنے دیتی۔ چابی تک لینے کیلئے دروازے پر خود آتی ہے۔ اُسے اپنی اور بیٹی کی آبرو کا ڈر ہے۔ مہندر کہتا ہے عورت اُسوقت تک دُکھ اُٹھاتی رہیگی جبتک اقتصادی طور سے آزاد نہ ہو جائیگی لیکن اُوشا اقتصادی طور سے آزاد نہیں ہے۔ وہ اپنے شوہر کے پاس اُس سے بیٹی تھی اور اُس سے بچنے کیلئے یہاں چلی آئی ہے۔ مہندر اور دوست کہتے ہیں اُس کی زندگی تباہ ہو رہی ہے۔ اُوشا کی آنکھوں میں صرف ایک مایوسی کی لکیر ہے۔

یہ مایوسی کی لکیر کٹی کی آنکھوں میں نہ تھی۔ اُسکی آنکھوں میں ایک چمک تھی ایک خود اعتمادی، جیسے وہ خود کو کسی کا دستِ نگر نہ سمجھتی ہو۔ جیسے یہ احساس اُسکی روح کو کچلنے کو موجود نہ ہو۔ مہندر نے سوچا کٹی کی آنکھوں میں یہ مایوسی کی لکیر دیر میں آئیگی۔ جبتک یہ نظام یونہی رہیگا جبتک اُن چیزوں کی خریداری جاری رہیگی جو خریدنے کیلئے نہیں بنیں۔ عورت کی آنکھوں سے مایوسی کی لکیر دور نہ ہوگی۔

ابھی کٹی کی آنکھوں میں چمک ہے۔ اگر آج وہ آشیانے میں آجاتی تو دوبارہ بات کرنا گوارا نہ کرتی۔ مگر آج وہ آشیانے میں نہیں آئی۔ کل وہ اُسے دادر سرکل پر ملیگی جبتک کٹی کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ وہ قلاش ہے یہ دوستی قائم رہیگی۔ مہندر اس دوستی کو قائم رکھنا چاہتا تھا لیکن اچانک اُسے خیال آیا کہ اُسکی جیب میں کل کٹی پر خرچ کرنے کیلئے روپیہ نہیں ہے۔ وہ اس بات کو بھول گیا تھا، حالانکہ یہ کانٹا تمام شام اُسکی روح میں کھٹکتا رہا تھا۔ سیر کے دوران میں ہر مرتبہ کھنہ نے خود ہی بل ادا کیا تھا اور ہر بار مہندر نے ایک شرمساری سی محسوس کی تھی لیکن آج شام کھنہ

بہت خوش تھا اور بلا دریغ خرچ کر رہا تھا کٹی سمجھ تو گئی ہوگی کہ "سیٹھ" وہی ہے لیکن اس کے باوجود بھی اُس نے مہندر سے کہا تھا، آئی لو یو۔

یہ الفاظ متواتر اُسکے شعور کی سطح کے نیچے گھوم رہے تھے لیکن اُس نے یہ سوچا نہ تھا۔ اب اُسے خیال آیا کہ کٹی روپیہ ہی نہیں چاہتی، ایک کار ہی نہیں چاہتی وہ کار اور روپیہ کے ساتھ خوبصورتی بھی چاہتی ہے۔ مہندر کو اپنی جسمانی خوبصورتی پر کافی فخر تھا۔ اُسکے فخر نے آشیانے کے دوسرے دوستوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا تو کٹی روپیہ ہی نہیں خوبصورتی بھی چاہتی ہے۔ اُس نے مہندر کے کان میں جھک کر کہا تھا۔ مجھے تم سے عشق ہے۔

خود مہندر کے اور اکی وجود کے نیچے اس عشق کے جذبے نے جنم لے لیا تھا۔ وہ کٹی سے جذباتی طور سے متاثر تھا لیکن یہ احساس ابتک اُسکے شعور پر واضح نہ ہوا تھا۔ شعوری طور پر وہ صرف کٹی کے جسم سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا، اُجرت دیکر اُسکے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ مہندر کہا کرتا تھا کہ اب اُسے عورت سے محبت نہیں ہوسکتی، یہ دل اب پتھر ہوگیا ہے، اسمیں عنفوانِ شباب کی وہ ملائیت نہیں رہی جو محبت کو جنم دیتی ہے۔ یہ محض اُسکی محرومی کا ایک حقیر سا ردِ عمل تھا۔ برسوں سے کسی عورت نے اُس سے محبت نہیں کی تھی۔ ایک عرصے سے وہ خود کسی کے عشق میں مبتلا نہ ہوا تھا اور یہ سمجھنے لگا تھا کہ دل میں محبت کی چنگاری بجھ گئی ہے اور اب کوئی آندھی اُسے روشن نہیں کرسکتی۔ یہ محض ایک بہلاوا تھا، اُسے کسی بھی ایسی قبول صورت لڑکی سے محبت ہوسکتی تھی جو ایکبار اُسکے سامنے پیار سے مسکرائے آج وہ کٹی کے جسم کو اپنانا چاہتا تھا۔ اُسکے سُرخ ہونٹوں کو چُومنا چاہتا تھا۔

جنھیں کرشنی نے اُسکے ہونٹوں سے آشنا نہ ہونے دیا تھا۔ اور اُسکے پاس روپیہ نہ تھا اُسے غصہ آیا، یہ غریبی، یہ مفلسی، یہ بیکاری . . . پھر حسبِ معمول یہ غصہ آہستہ آہستہ اُتر گیا۔ اُس نے سوچا وہ ہری سے روپیہ واپس لے لیگا۔

صرف روپیہ ہی ایک ایسا رشتہ تھا جس نے آشیانے کے دوستوں کو باہم ملا رکھا تھا۔ مہندر کو ہری سے کچھ لینا تھا، ہری کو رندھیر سے کچھ لینا تھا، رندھیر گورکھ کا قرضدار تھا ـــــ اور یونہی قرض ایک تار تھا جس نے آشیانے کے دوستوں کو باہم باندھ رکھا تھا۔ مہندر نے سوچا، وہ ہری سے کچھ روپیہ لے لیگا

صبح جب ہری کی آنکھ کھُلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا اور ناریل کے درختوں میں سے چھن کر آتی ہوئی سورج کی کرن حسبِ معمول دیوار پر موجود تھی۔ کمرے میں سوئے ہوئے دوست بکھرے پڑے تھے۔ ہری کو یاد آیا کہ رات بُوندیں پڑی تھیں اور سبکو اپنا اپنا بستر لیکر نیچے آنا پڑا تھا۔ اور اب وہ بے ترتیبی سے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔ ایک لمحے کیلئے اُسے محسوس ہوا کہ یہ سب لوگ مُردہ ہیں اور وہ مُردوں کے درمیان بیٹھا ہے۔ اُنھیں کمرے میں پڑا دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ ان لوگوں کی روحیں سلب کر لی گئی ہیں اور بے جان جسموں کو بے پروائی سے پھینک دیا گیا ہے لیکن رات جب وہ بُوندوں سے پریشان ہو کر نیچے آئے تھے تو کسقدر زندہ اور اُسی قدر زندگی سے بیزار معلوم ہوتے تھے۔ سب کو ایکدوسرے پر غصہ آرہا تھا اور سب سے زیادہ غصہ خدا پر کیا۔ خالقِ کائنات کا دماغ خراب ہو گیا ہے، وہ خدا کو گالیاں دے رہے تھے، بارش تک کرنے کی تمیز نہیں۔ خدا کو وہ ہمیشہ گالیاں

دیتے تھے، حالانکہ کسی کو خدا پر اعتقاد نہ تھا، سب دہریے تھے لیکن روایتی خدا کے متعلق ہر وقت دل کی بھڑاس نکالتے رہتے تھے۔ رات اوپر سے آنیکے بعد کچھ دیر کیلئے کمرے میں ایک عجیب شور مچگیا تھا جیسے یہ سب لوگ اپنی اپنی زندگی کیلئے محوِ جنگ ہوں۔ پھر کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی تھی۔

ہری بستر پر پڑا رہا۔ اب وہ کل کی بات بھولکر آج کی بات سوچ رہا تھا۔ اُسکی جیب میں روپیہ نہیں ہے۔ کل رندھیر نے کہا تھا کہ اُسے کہیں سے روپیہ ملنے کی اُمید ہے، اور اس اُمید میں کہ رندھیر اُس سے لئے ہوئے روپے ادا کر دیگا۔ اُس نے چند دوستوں کیساتھ اپنی جیب شراب خانے میں خالی کر دی تھی۔ اب وہ مفلس تھا اور رندھیر رات کو گھر نہیں آیا تھا۔ اُسے رندھیر پر غصہ آیا اور اپنے اوپر کہ اُسے اُسوقت کیا ہو گیا تھا جب اُس نے اپنا سرمایہ بانٹ دیا تھا۔ اُسے اُسوقت کیا ہو جاتا ہے یہ اُسکی سمجھ میں نہیں آتا۔ روپیہ اُسکے پاس ہو تو کسی کے مانگنے پر اُسے انکار نہیں کیا جاتا۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ کہدے کہ وہ دے نہیں سکتا یا اُسکے پاس نہیں ہے۔ جیسے وہ اپنے دل کی گہرائی میں وہ سمجھتا ہو کہ یہ روپیہ صرف اُسکی ملکیت نہیں ہے، جیسے اپنی روح کے نہاں خانے میں اُسے اس بات کا شُبہ ہو کہ یہ روپیہ ایک مشترکہ ملکیت ہے لیکن اسوقت وہ مفلس تھا۔ اور اُسے غصہ آرہا تھا کہ رندھیر رات کو گھر کیوں نہیں آیا اور اب وہ کیا کرے اُسے پھر مہندر سے پیسے مانگنے پڑینگے، اُس نے سوچا، اب اُسے مانگنے میں جھجک نہ ہوتی تھی، وہ شرمندگی کا احساس کئے بغیر مانگ سکتا تھا لیکن چند مہینے پہلے ایسا کرتے ہوئے کوئی چیز اُس کا ہاتھ پکڑ لیتی تھی، عزت، خودداری، شرم اُسکی اجازت نہ دیتی تھی، اب نہ وہ شرم رہی تھی

نہ وہ خودداری، نہ وہ اپنی عزت۔ اب وہ جھجکتا نہ تھا۔ اب کوئی چیز ہاتھ نہ پکڑتی تھی۔ اکثر بستر پر جانے کے بعد رات گئے تک وہ آنکھیں بند کئے یہ سوچتا رہتا تھا لیکن وہ کانٹا نکل گیا تھا۔ اُس شرم، عزت اور خودداری کا احساس زائل ہوگیا تھا۔ اُس سے بھی لوگ مانگتے تھے، وہ بھی لوگوں سے مانگ سکتا ہے۔ وہ بھی خود کو اُسکے سیلاب میں بہہ جانے سے روک نہ سکتا تھا۔

چند مہینے پہلے وہ گھر گیا تھا۔ گھر جاکر اُس نے اپنا گھر بیچ دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ بمبئی میں زندگی کا لطف اُٹھانے آیا تھا لیکن روپیہ جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا بہت جلد ختم ہوگیا۔ ان دنوں وہ ایک وقت کھانا کھاتا تھا لیکن اُس نے کسی سے کچھ نہ مانگا۔ اُن دنوں دل میں وہ کانٹا تھا۔ وہ کانٹا جس نے اُسے مانگنے کی بجائے اپنا گھر بیچ دینے پر مجبور کر دیا۔ وہ کانٹا اب کہاں گیا، وہ غیرت کیا ہوئی یہ اُسے معلوم نہیں

مکان بیچکر وہ واپس آیا تو اُسکے پاس تین ہزار روپیہ تھا۔ وہ اسے خرچ کرنا چاہتا تھا، اپنے اوپر لیکن دوستوں نے اُس سے اُدھار مانگا اور وہ انکار نہ کرسکا اور پھر شراب اور طوائفوں کے بستر اور عیاشی ـــــ وہ روپیہ اب خرچ ہوچکا ہے یا دوستوں کے پاس ہے جو واپس کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

اچانک ہری کو خیال آیا کہ مہندر قرض نہیں دیگا۔ وہ پہلے بھی کہہ چکا ہے کہ اُسکی فضول خرچی کیلئے مہندر کے پاس روپیہ نہیں ہے وہ ہری سے کوئی کام کرنے کو کہتا ہے اور ہری کام نہیں کرتا۔ روپے کیساتھ واپس آنے پر مہندر نے اُس سے کہا تھا کہ اس روپے سے وہ مستقبل میں اپنا کیریر بنا سکتا ہے لیکن یہ ہری نے نہیں کیا، جیسے وہ مستقبل کے آنے تک زندہ نہیں رہیگا۔ موت کا ایک موہوم سا

اُسکے تحت الشعور پر تسلّط کئے ہوئے تھا۔ وہ نیند میں دیکھتا کہ کوئی اُسے قتل کر رہا ہے، اُسکے پیچھے بھاگ رہا ہے، وہ بچاؤ کیلئے گڑگڑا رہا ہے۔ وہ پسینوں میں تر بستر پر اُٹھ بیٹھتا اور وہ ڈراؤنے خواب ہفتوں سائے کی طرح اُسکے ساتھ لگے رہتے۔

اپنے دل کی گہرائی میں اُسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ مر رہا ہے۔ مرنے سے پہلے وہ زندگی کی تمام خوشی سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ عورتیں، شراب، ہنگامے اور تضیع یہ ضائع کرنے کی خواہش جو بظاہر خواہش نہیں تھی، اُسکی ہر حرکت پر حاوی ہو۔ وہ استعمال کرنے سے زیادہ ضائع کرتا ہے۔ جیسے تھوڑے سے عرصے میں چیزوں کی زیادہ سے زیادہ مقدار استعمال کر لینا چاہتا ہو۔ مہندر اُسکی اس عادت سے نالاں ہے۔ ہری یہ جانتا ہے بستر پر بیٹھے ہوئے اُسے یقین ہوگیا کہ مہندر روپیہ نہیں دیگا۔ کہدیگا کہ اپنی کوتاہ اندیشی کا خمیازہ بھگتو۔ ہری کو لوگوں کا یہ دُور اندیشی کا فلسفہ بھوکھلا معلوم ہوتا ہے۔ وہ حال میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اُسے مستقبل پر یقین ہی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے چند روز عیش میں جی لینا چند سال ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے بہتر ہے۔ اُسے زندگی میں صرف ایک خواہش رہگئی ہے۔ وہ زندگی میں زندہ لوگوں کیطرح جینا چاہتا ہے لیکن اپنی زندگی میں وہ کبھی بھی تو زندہ نہیں رہا۔ زندہ رہنے کیلئے کبھی اُسکے پاس کافی روپیہ نہ تھا اور روپے کے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہے۔ ایک نیم مفلسی کی حالت میں وہ جوان ہوا تھا، پھر ایک خاندان کا بوجھ اُسکے کندھوں پر آپڑا۔ وہ زندگی میں بڑے بڑے ارادے لیکر آیا تھا لیکن سب دیکھتے دیکھتے ایک خواب کی طرح پریشان ہوگئے۔ اُسکی صحت ایک کھنڈر ہوگئی تھی۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ زندگی کے کنارے پر آگیا ہے اور آگے موت کی سیاہ تاریکی ہے۔ وہ مر جائیگا اور زندگی

ختم ہوجائیگی۔ دل کی دھڑکن رُک جائیگی۔ وہ خود کو موت کے اندھیرے میں کھودے گا اور یہ سب کچھ اسکے زندگی کو دیکھنے سے پہلے ہوجائیگا اُسے یہ نہیں معلوم۔ کہ مسرت اور خوشی اور آرام کیا ہوتا ہے، عورت کے ہونٹوں کا شہد، اُسکے سانس کی خوشبو، اُسکے جسم کی حرارت کیا ہوتی ہے۔ وہ مرجائیگا ان چیزوں کو جانے بغیر۔ اس گھر میں جہاں کوئی کبھی زندگی سے ہم آغوش نہیں ہوسکتا، جہاں موت ایک بھیانک سیل کی طرح اُسکے رگ وپے میں سرایت کرتی جارہی ہے۔ اُس نے یہ گھر چھوڑ دیا۔ اس گھر سے دُور وہ بمبئی آگیا تھا۔ یہاں وہ زندگی کو لُطف اندوز ہونا چاہتا تھا اور آشیانے کے دوست کہتے تھے وہ کوئی کام کیوں نہیں کرتا۔ اکثر تنہائی میں وہ خود سوچتا ہے کہ وہ کام کیوں نہیں کرتا۔ اکثر تنہائی میں بیٹھ کر وہ آئندہ زندگی کیلئے پلان بناتا ہے، سوچتا ہے کہ زندگی کو سنوار کر ٹھیک راہ پر لے آئے، مگر یہ ہوتا نہیں، وہ کام کرنے سے بھاگتا ہے جیسے یہ خیال ہو کہ جب زندگی باقی ہی تھوڑی ہے تو کام سے کیا فائدہ، جیسے اُسے کام کی بے مصرفی کا یقین ہوگیا ہے۔ روپیہ اب اُسکے پاس ختم ہوگیا ہے، یا مقروض دوستوں کے پاس ہے۔ اُسے مانگنے میں شرم نہیں آتی مگر پھر بھی یہ خیال ٹھہر ٹھہر کر چُبھتا ہے کہ یہ سلسلہ کبتک جاری رہیگا۔ اکثر اُسے اس قسم کا احساس ہوتا ہے جیسے اپنی پھانسی کیلئے اُسے خود ہی رسّی بٹنی پڑیگی۔ اکثر بالکنی میں کھڑا ہوا وہ ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا ہے کہ کہیں وہ خود کو نیچے نہ گرادے۔ پچھلے کچھ دنوں سے یہ خیال بار بار اُسے خوفزدہ کرنے لگا ہے کہ وہ خودکشی کرلیگا۔ دل ہی دل میں وہ دوبارہ اُس روح کو قبض کرنے والی کشمکش میں جانے سے کانپتا ہے

جس سے بھاگ کر آیا ہے۔
وہ رندھیر پر کھولتا ہوا بستر پر بیٹھا رہا جو رات کو گھر نہیں آیا تھا۔ اُسے پھر مہندر سے پیسے مانگنے پڑیں گے۔

مہندر کی آنکھ کھل گئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اُسکا پہلا خیال کٹی تھی۔ پھر اُس نے ہری کو دیکھا جو بستر پر بیٹھا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ روپے کیلئے ہری سے استفسار کرے، برابر کے فلیٹ میں رہنے والا پنجابی نوجوان اندر آگیا پھر اور سب بھی جاگ گئے۔ اور صبح کی مجلس شروع ہوگئی۔ صبح کی مجلس رات کی مجلس یا جسوقت بھی یہ لوگ اک جگہ جمع ہوتے تھے مطلب ایکدوسرے کو نیچا دکھانا ہوتا تھا ایکدوسرے پر فقرے کسے جاتے تھے، ایکدوسرے کے نشتر چبھوئے جاتے تھے اور اس میں اُنھیں ایک مخصوص سا اذیت پرستانہ لطف محسوس ہوتا تھا۔ یا پھر گفتگو کا ایک دوسرا پہلو ہوتا تھا جسمیں پارسی لڑکیوں کی پنڈلیاں مراہٹی عورتوں کی چھاتیاں اور ایکدوسرے کی شکل وصورت پر حملے ہوتے تھے جسے مذاق کہا جاتا تھا۔ مذاق کی یہ قسم مہندر سے شروع ہوتی تھی۔ وہ خود خوش شکل تھا اور دوسروں کے کم خوبصورت چہروں کو مسخ کرنے میں اُسے ایک طفلانہ خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اکثر اپنی اس خوشی پر وہ رازدارانہ طور پر شرمندہ ہوجاتا ہے لیکن مذاق کی یہ قسم جو چل نکلی تھی ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔

سامنے کے فلیٹ میں رہنے والے پنجابی نوجوان کو اُنکی چٹک دیکھنے میں مزہ آتا تھا۔ دفتر جانے سے پہلے اپنا وقت وہ آشیانے میں گذارتا ہے۔ صرف

چیٹرجی ایک ایسا شخص ہے جو اس ہنگامے میں ایک خاموش تماشائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کسی سے کچھ نہ کہتا تھا۔ کوئی باریک سا نشتر چبھ جائے تو مسکرا کر چپ ہو جاتا ہے۔ اس مسکراہٹ میں غم کی ایک گہری لکیر ہوتی ہے جو اکثر دیر تک دل پر کھنچی رہتی ہے۔ نشتروں کا سب سے بڑا نشانہ گورمکھ ہوتا ہے۔ گورمکھ سردار ہے اور اپنے بال کٹوا چکا ہے۔ وہ اب خود کو سردار کہلانا نہیں چاہتا مگر سب زبردستی اسے سردار کہتے ہیں۔ آشیانے کے دوستوں کو سردار کی جو بات سب سے زیادہ ناگوار ہے وہ اس کی خود غرضی ہے، اور اس کا حقارت آمیز رویہ۔

مہندر نے دیکھا کہ ہری آج معمول سے زیادہ خاموش ہے۔ اسے شبہ ہوا اور یہ ڈر کہ شاید آج اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس نے ہری کو اکثر اسی وقت اداس دیکھا تھا جب اس کی جیب خالی ہوتی تھی۔ آج وہ خاموش تھا۔ مہندر کو ڈر سا ہو گیا۔ اسے ہری سے پیسے لینے تھے۔

سردار نے کہا "میں تنگ آ گیا ہوں۔ تم لوگ اس آشیانے میں جانوروں کی طرح رہتے ہو"

"تو نکل جاؤ یہاں سے بھیڑ کم ہو جائیگی" ہری نے جل کر کہا

"کہاں جائے بیچارہ سڑک پر سوئے کیا" مہندر نے لقمہ دیا۔ سردار کو جلانے میں اسے خاص مزہ آتا تھا۔

"جہاں جی چاہے سوئے" ہری نے کہا "پہلے بھی تو گوردوارے میں سوتا تھا"

نشتر سردار کے دل میں اتر گیا لیکن مہندر نے دیکھا کہ ہری آج خلافِ معمول اپنی فتح پر مسکرایا نہیں۔ ضرور وہ اس وقت مفلس ہے۔ مہندر نے سوچا ہری کہہ رہا تھا "نالی میں رہکر امیرزادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ جیسے ہمیشہ محلوں میں ہی

رہے ہو۔" اُسکی تلخی میں آج مذاق کا شائبہ بھی نہ تھا، سردار سنکر چُپ نہیں ہوا، وہ کبھی چُپ نہیں ہوتا تھا۔ بولے گیا لیکن بات ختم ہو چکی تھی، زہر اثر کر چکا تھا۔ باقی دوستوں کو ایک پُر لطف تسکین کا مزہ آیا تھا۔ دنیا سے پائی ہوئی ساری ناکامی ساری شکست ساری مایوسی کا وہ اسطرح ایکدوسرے کو مطعون کر کے انتقام لیتے تھے، جیسے دوسرے کی دہکتی آگ پر ہاتھ رکھ کر وہ یہ باور کرانا چاہتے ہوں کہ صرف ہم ہی دُکھی نہیں ہیں ہم ہی زخمی نہیں ہیں، تم بھی اسی کشتی میں سوار ہو۔

دیر تک یہ چشمک یونہی جاری رہی۔ مہندر نے کل کی داستان سُنائی اور کسی کو یقین نہیں آیا۔ جیسے ایک لڑکی کا مہندر سے ملنا ناممکن ہو، ایک معجزہ ہو اور یہ معجزوں پر یقین کرنے کا زمانہ نہیں ہے۔ اتنے عرصے بلکہ ہمیشہ عورت سے محروم رہنے کے بعد انھیں غیر شعوری طور پر یقین ہو گیا تھا کہ ایک عورت کا ملنا ناممکن ہے۔ انھیں مہندر کی داستان قابلِ یقین معلوم نہ ہوئی۔ جب انھیں یقین آیا تو سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ وہ طوائف ہو گی۔ مہندر کے چہرے پر ایک مُسکراہٹ آئی جسے کوئی نہیں دیکھ سکا جسے وہ خود بھی نہیں دیکھ سکا۔ پنجابی نوجوان کے دفتر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ اُٹھکر چلا گیا۔ پھر محفل برخاست ہو گئی اور بستروں پر بیٹھی ہوئی لاشیں اپنی ضروریات سے فارغ ہونے میں مصروف ہو گئیں۔

مہندر کو اتنی دیر میں یقین ہو گیا تھا کہ ہری کے پاس روپیہ نہیں ہے لیکن کسی دوسرے سے مانگنے سے پہلے وہ ہری سے پوچھنا چاہتا تھا۔ ہری اس کا مقروض تھا۔ "کتنے روپے ہیں تمھارے پاس؟" اُس نے پوچھا۔

"ایک بھی نہیں"۔ ہری نے جواب دیا۔ "رندھیر نے کہا تھا وہ دیگا مگر وہ

آیا ہی نہیں رات کو۔ تم دو روپے دے دو مجھے"۔

"میں تم سے مانگ رہا ہوں، مجھے شام کو کٹی سے ملنا ہے"۔

"رندھیر نے آج لادیئے تو تم مجھ سے لے لینا" ہری نے کہا۔

مہندر جانتا تھا کہ اگر اُسے مل گئے تو ہری ضرور دیدے گا۔ اُس نے خود کو اُمید دلائی کہ رندھیر روپے لے آئیگا لیکن پھر بھی روپے رات سے پہلے نہیں ملیں گے۔ رندھیر رات سے پہلے نہیں آئیگا۔ اور اُس نے کٹی سے شام کو ملنے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ شام کو کٹی سے مل سکے گا مگر اُسکی جیب میں روپے نہ ہونگے۔ اور روپے کے بغیر کٹی سے ملنا بے معنی ہے۔

اور اگر وہ کٹی سے شام کو نہ ملے، کہ اسکے علاوہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تو یہ بھی ممکن ہے کہ کٹی آکر لوٹ جائے اور اسکے بعد پھر اس سے کبھی ملاقات نہ ہو۔ پھر اُس سے کبھی ملاقات نہ ہو یا اُسوقت ہو جب وہ اُسے بھول چکی ہو۔ اُس شام کی یاد اُس کے ذہن سے چھوٹ چکی ہو۔

مہندر نے سوچا وہ شام کو کٹی سے ملیگا۔ اتنا کہنے کیلئے کہ آج وہ بہت مصروف ہے اور شام اُسکے ساتھ نہیں گذار سکتا۔ وہ کٹی سے ملنے کو کہیگا۔ رندھیر رات کو روپیہ لے آئیگا۔ کل وہ کٹی پر خرچ کر سکیگا۔

مہندر نے یہ فیصلہ کر لیا لیکن اُسکے ساتھ ہی ایک عجیب سی یاس و افسردگی اُسکے دل و دماغ میں پھیل گئی۔ روپیہ جو نہیں ہے، روپیہ جو چاہیئے روپیہ جسکے بغیر ہر کام بند ہے۔ روپیہ جو دوستوں کے درمیان تنہا رشتہ رہگیا ہے دراصل کٹی کے نہ ملنے سے زیادہ اسوقت اسکے دل میں اس یاس و افسردگی

کی وجہ یہی تھی، ابھی چند لمحے پہلے ہری سے روپیہ نہ ملنے پر دفعتاً اُسے محسوس ہوا تھا کہ اُسکے دل میں سے دوستی اور برادری کا جذبۂ تفریق ہو گیا ہے اور ناپسندیدگی اور نفرت رہ گئی ہے۔ اپنے دل میں وہ خود کو قصوروار سمجھ رہا تھا۔ اور وہ شام کو کٹی سے نہیں مل سکے گا۔

وہ شام کو کٹی سے نہیں مل سکا۔

مہندر انتظار کر کے لوٹ آیا۔ کٹی نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تھا۔ وہ ملنے نہ آئی تھی۔ آشیانے کے دوستوں کو رازدارانہ طور پر ایک خوشی سی ہوئی لیکن انکی یہ خوشی مہندر کیلئے راز نہ رہ سکی۔ وہ اس خوشی کو جو انسان کے ادنیٰ ترین جذبات سے پھوٹتی ہے چھپا نہ سکے۔ اُنھوں نے مہندر کے ہتھیار اسی پر استعمال کئے۔ مہندر کا مذاق اُڑایا گیا اور مہندر چُپ رہا۔ وہ ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو اس کی شکست پر مسرور تھے۔ اگر یہ اُسکی اپنی شکست نہ ہوتی تو اسے ان لوگوں پر رحم آتا۔ لیکن یہ اُسکی اپنی شکست تھی اور اسے ان لوگوں پر غصہ آیا۔ وہ غصے کو مذاق میں ٹال گیا۔ اور اُسے ایکبار پھر خیال آیا کہ یہ سب لوگ کمینے ہیں۔ یہ خیال اسے پہلے بھی کئی مرتبہ آیا تھا لیکن ہر بار وہ اس بات پر تحمل کر کے درگذر کر جاتا تھا کہ یہ لوگ حالات کے شکار ہیں، کہ محرومیت انسان کو ذلیل، حاسد اور کمینہ بنا دیتی ہے، یہ حسد کا جذبہ اسمیں بھی ہے یہ کمینہ پن وہ خود بھی کرتا ہے۔ اُسے بھی جاہل لوگوں کو کاروں میں عیش کرتے دیکھ کر آگ لگ جاتی ہے، وہ بھی ایک بدصورت امیر کے پہلو میں ایک حسین لڑکی کو دیکھ کر جل جاتا ہے۔ اگر یہ حسد ہے تو قدرتی ہے، اگر یہ

کمینہ پن ہے تو ٹھیک ہے لیکن آج ان لوگوں کو اپنی ناکامی پر خوش دیکھ کر وہ جذباتی علیحدگی سے فیصلہ نہ کر سکا۔ یہ لوگ کمینے ہیں۔

کمینے آج چھت پر نہیں گئے تھے یہیں کمرے میں بستر بچھا لئے گئے تھے آج پھر شام سے ابر ہو گیا تھا۔ باہر ناریل کے درختوں اور اُن سے پرے نظر آتے ہوئے گرجا گھر پر بادل چھائے ہوئے تھے ممکن ہے کٹی بارش کے ڈر سے نہ آئی ہو۔ مہندر نے سوچا، مگر شام کو ابر اتنا زیادہ تو نہ تھا۔ یا ممکن ہے اُسے کوئی اور مل گیا ہو کسی اور کار کا مالک۔ آج اُسکی کمر کے گرد کسی اور کا بازو ہوگا، آج کسی اور کے کان میں جُھک کر وہ کہہ رہی ہوگی کہ مجھے تم سے عشق ہے۔ یہ عشق اُسکے دل میں کہاں ہوگا۔ اس جذبے کو تو پیدا ہوتے ہی موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا یہ جذبہ تو اُسی دن اپنی تاریک قبر میں دفن ہو گیا جب اُس نے پہلی بار روپیہ قبول کیا ہوگا، وہ — یہ محض تصور ہے، اُس نے سوچا، طوائف کے بھی دل ہوتا ہے۔ طوائف بھی محبت کر سکتی ہے، — یہ محض دل خوش کُن سوچ ہے اُس نے تردید کی لیکن وہ اس خیال کو ملتوی نہ کر سکا اور طوائف کی محبت ایک بیوی کی محبت سے بہتر ہے۔ اُس نے سوچا، طوائف روپے کیلئے محبت نہیں کرتی، وہ جب محبت کرتی ہے تو بدلے میں روپیہ نہیں چاہتی، ایک بیوی کی محبت کی ہمیشہ قیمت ہوتی ہے۔ مہندر کو طوائفوں سے ہمدردی تھی، اُتنی ہی جتنی اُسے طوائفیت سے نفرت تھی، اور کٹی سے جس نے آج اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تھا، اُسے عشق ہو گیا تھا۔ کل وہ اس سے واقف نہ تھا لیکن آج کٹی کے نہ ملنے کے بعد اُسے محسوس ہوا کہ چنگاری جو بجھ گئی تھی روشن ہو اٹھی ہے۔ وہ اب بھی کٹی کے لبوں پر لب رکھنا

چاہتا تھا، اُسکے جسم کو اپنے جسم میں جذب کرنا چاہتا تھا، اپنے جسم کو اُسکے جسم میں کھونا چاہتا تھا لیکن آج اس خواہش کا رنگ نیا تھا۔ آج کٹی کے جسم کی غیر حاضری اُسکے لئے ایک روحانی عذاب بن گئی تھی کٹی کے جسم کا قُرب اُسکے لئے ایک روحانی راحت بن جائیگا، وہ پھر جی اُٹھیگا۔

اُس نے یہ بات آشیانے کے دوستوں میں نہیں کہی ورنہ اُنھیں مذاق اور نشتر اندازی کا ایک اور موقعہ مل جاتا۔ یہ لوگ ایکدوسرے کے جذبات کو دکھانے میں پوری بے دردی کا ثبوت دیتے تھے مُنھ سے ایکبار کوئی بات نکلجائے تو مُنھ چُھپانا مشکل ہوجاتا تھا۔ زہر کے ڈنک ہمیشہ تیار رہتے اور پھر مہندر اُنکے سامنے جذباتی اعتبار سے ننگا ہونا نہ چاہتا تھا۔ وہ چُپ رہا۔

"اب ٹھنڈا سانس بھر کر سوجاؤ" ہری نے بستر پر جاتے ہوئے کہا۔ "یُونہی مرجاؤ گے تم، اور کوئی لڑکی نہیں ملے گی"۔

"کیوں خواہ مخواہ اُمید لگائے بیٹھے ہو" گورمکھ بولا۔

چیٹرجی ہمیشہ کیطرح خاموش تھا۔ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا لیکن مہندر خاموش نہیں رہ سکا۔ اندر سے جل کر اور باہر سے مُسکراتے ہوئے "جب تم جیسے کھُٹ بڑھئی کی شکل کے آدمی اُمید کرسکتے ہیں تو میں کیوں نہ کروں"۔

سردار کچھ جواب دینا چاہتا تھا لیکن زینے پر سے عیسائی کے کُتّے کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی اور ــــ زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں ــــ، رندھیر گاتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔

زندگی چاند ــــ اُسے زینے پر ٹھوکر لگی اور، یہ عیسائی کا کُتا مجھے آتے جاتے کیوں بھونکتا ہے، اُس نے کہا۔ کُتا اب بھی بھونک رہا تھا۔ رندھیر سیڑھیاں چڑھتا رہا، وہ نشے میں تھا۔ رم کے پانچ پیگ اُسکے خون میں گھل چکے تھے اور زندگی چاند سی عورت کے سوا کچھ نہیں تھی۔ دو آور بار سے وہ ناکام ایکٹروں کیلئے شراب پیکر آیا تھا آج اُس نے بل خود ادا کیا تھا۔ چُپ رہو عیسائی کے کُتے"۔ اُس نے سرگوشی میں کہا "سونے والے جاگ جائینگے"۔ اُسنے دروازہ کھولدیا سونے والے جاگے ہوئے تھے۔

"روپے لائے سالے؟" ہری نے داخل ہوتے ہی سوال کیا۔

"زندگی چاند سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں"۔ رندھیر نے جوابدیا۔ وہ اتنا نشے میں نہیں تھا جتنا بن رہا تھا۔

"تمہارے چچا نے بھی دیکھی ہے کبھی چاند سی عورت"۔ گوردھن بستر پر اُٹھ بیٹھا تھا چیٹرجی جو بیٹھا تھا تھک کر لیٹنے لگا تھا۔ مہندر گالیاں دے رہا تھا۔ سب رندھیر کی اس عادت سے نالاں تھے۔ وہ اکثر رات کو کہیں نہ کہیں سے شراب پی کر آتا تھا، پھر آکر سب کو جگا دیتا تھا، اتنے زور زور سے سرگوشیوں میں بات کرتا تھا کہ برابر کے فلیٹ میں پنجابی نوجوان کی بیوی اپنے شوہر سے شکایت کرتی تھی صبح رندھیر معافی مانگ لیتا تھا، اگلی رات کو پھر یہی ہوتا تھا۔ اُس نے گوردھن کی بات نہیں سُنی، نہ مہندر کی گالیاں۔ وہ گنگناتا ہوا کپڑے اُتار رہا تھا۔ زندگی چاند سی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کپڑے اُتار اُتار کر اُس نے کمرے کے چاروں طرف پھینک دیئے، جیسے وہ انھیں پھر نہیں پہنے گا، اور بالکل ننگا ہو کر بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ یوں بھی گھر میں انڈرویئر کے علاوہ اور کچھ پہننا پسند نہیں کرتا تھا اور

شراب پینے کے بعد تو اُسے کپڑے اُتار دینے کا خبط تھا۔ کپڑے اُتار کر وہ سارے گھر میں پھرتا تھا اور گاتا تھا، زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

روپے جو اُسے کل ملے تھے۔ اب اُسکے پاس نہ تھے، شام شرابخانے میں ختم ہوگئے تھے۔

صبح اُس نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے ہری کو بتایا کہ وہ روپے خرچ ہوگئے کل شام اُسے اپنے بچپن کا ایک دوست مل گیا تھا، وہ شملہ کی خوبصورت پہاڑیوں پر ساتھ کھیلے تھے، مدتوں کے بعد آج وہ اُسے بمبئی میں ملا تھا، اُسکی خاطر کرنی تھی۔ اور وہ روپے ہوٹل کے بل اور شراب میں ختم ہوگئے تھے۔ ہری نے رندھیر کو گالیاں دیں کہ میں بھوکا مر رہا ہوں اور تم لوگوں کو شرابیں پلاتے پھرتے ہو تمھیں شرم نہیں آتی۔ اُس نے اپنے اوپر قرض کے بوجھ کو سنجیدگی سے محسوس کرنا چھوڑ دیا ہے قرض اُسکے لئے ایک معمول سا ہوگیا ہے۔ اچھی طرح سوچکر وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ شرم کو پامال نہیں کرسکتا۔ وہ اپنے ہر ایک واقف کار کا قرضدار تھا جس کے سامنے شرم کرے۔ شروع شروع میں وہ شرمندہ ہوتا تھا، شرم آتی تھی کہ وہ انکا قرضدار ہے لیکن پھر بھی وہ اس احساس سے باغی ہوگیا تھا۔ یہ اُس کی زندگی اور موت کا سوال تھا، وہ قرض کے بغیر فاقوں سے مرجائیگا۔ یہ شرم بھی اُسے زندہ نہیں رہنے دیگی اور اُس نے قرض لیکر اُسے بھول جانا شروع کردیا تھا۔ وہ قرض ادا کرنا چاہتا تو تھا لیکن لاچار تھا، روپیہ اُسکے ہاتھ میں آتے ہی خرچ ہوجاتا تھا، جیسے وہ ڈرتا ہو کہ روپیہ اگر اُسکے پاس رہا تو کوئی مانگ لیگا۔ اور اُسے دینا پڑیگا۔ خود خرچ کرنے کی اپنی عمیق ترین خواہش کے سامنے وہ بے بس تھا

وہ اب صرف خوبصورتی سے اپنی زندگی گذارنا چاہتا تھا، مگر وقت کے اصول جہنم میں جائیں۔ وہ زندگی میں بہت شرافت برت چکا، اس شرافت نے کبھی اُسے فائدہ نہیں پہنچایا، اُسے ٹھوکریں کھلائی ہیں، ذلت کا احساس کرایا ہے، وہ کیا کرے اِس شرافت کو لیکر۔ اُسے اس شرافت سے نفرت ہوگئی تھی، اب وہ نفرت بھی نہیں رہی اب وہ صرف بے پرواہے۔

رندھیر بمبئی کے فلمی شہر میں ہیرو بننے کیلئے آیا تھا۔ وہ اپنا سارا وقت بمبئی کے نگار خانوں میں گذارتا تھا۔ اُس نے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر پروڈیوسروں کی خوشامد کی تھی اپنی رُوح کو ذبح کر کے ڈائرکٹروں کے آگے دستِ سوال پھیلایا تھا کہ زندگی کو ایک شاہراہ مل جائے۔ وہ بہت اچھا ایکٹر تھا لیکن کسی نے اُسے موقعہ نہیں دیا۔ لوگوں نے اُس سے وعدے کئے اور اپنے وعدے وفا نہ کئے کسی نے کہا اسکا قد چھوٹا ہے کسی نے کہا اسکی ناک لمبی ہے، یہ سب جھوٹ تھا، یہ سب بہانے تھے۔ وہ گوہر لال کے گنجے سر سے اچھا تھا، وہ الیاس کے ساہوکاری جسم سے بہتر تھا۔ وہ مدھوک کپور کے چوبی چہرے سے خوبصورت تھا لیکن یہ بزدل لوگ جنمیں سے ہر ایک احساس کمتری کا شکار تھا۔ ایک نئے آدمی کو موقعہ دینا نہ چاہتے تھے۔ رندھیر ایکٹر نہ بن سکا کسی نے اُس سے کہا تم گیت لکھ سکتے ہو، رندھیر نے کہا میں شاعر ہوں کسی نے کہا تم مکالمے لکھ سکتے ہو، رندھیر نے کہا میں ڈرامے لکھتا رہا ہوں۔ اب کبھی کوئی اُسے ایک گیت لکھنے کو دیدیتا ہے کبھی وہ کسی فلم کے مکالمے لکھنے میں مدد کرتا ہے لیکن کوئی اُس سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ رندھیر نے اٹھارہ برس کی عمر میں گھر چھوڑ دیا

تھا، اُس نے سٹیج کی خاک چھانی تھی، ریڈیو پر ٹھوکریں کھائی تھیں لیکن کسی نے اسکے خواب کو نہیں پہچانا تھا! انسان کی صحیح قدر کب پہچانی جائیگی، وہ سوچتا ہے یہ کب ہوگا، کیسے ہوگا، کہ اُسے اپنی تکمیل کا موقعہ ملیگا۔ یہ رات کب ختم ہوگی، کب اُفق پر صبح کی سُرخی نمودار ہوگی۔

لیکن رندھیر اب بھی نا اُمید نہیں ہے ابھی تک اُسکی نظر کے اُفق پر وہ ستارہ روشن ہے جسکے سہارے وہ ابتک جیتا رہا ہے لیکن ان ٹھوکروں نے ان پے در پے مایوسیوں نے اُسے پست خیال کر دیا ہے۔ اب وہ لوگوں کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ خوش کر کے اُن سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ ایک ایکٹر سے وہ ایک مسخرا بن گیا ہے۔ شروع شروع میں لوگوں کو اسمیں لطف آتا تھا رندھیر ایسی حرکات کرتا تھا جن سے خواہ مخواہ ہنسی آئے۔ رندھیر شرابی کا پارٹ ادا کر رہا ہے، رندھیر چارلی چپلن کی نقل کر رہا ہے، رندھیر بس میں بیٹھی ہوئی کسی لڑکی سے اپنے ناکام معاشقے کا مزاحیہ انداز میں ذکر کر رہا ہے اور ہا ہا ہا ہی ہی ہی، لوگ خوش ہوتے تھے اور کسی کو اس تماشے کے عقب میں اُس ٹریجڈی کی جھلک نظر نہ آتی تھی لیکن اب لوگوں نے اُسکے اس تماشے سے بھی محظوظ ہونا چھوڑ دیا ہے۔ رندھیر کا جوکروں والا رویہ اُنکے اعصاب پر سوار ہونے لگتا ہے۔

رندھیر نے یہ محسوس کر لیا ہے۔ اب وہ لوگوں سے کم ملتا ہے۔ آج کل اپنے وقت کا بیشتر حصہ وہ شوبھنا بوس کیتھی گذارتا ہے شاردا گھوش ایک مشہور فلم اسٹار ہے اور ہندوستانی نامی رقاصہ۔ رندھیر نے پہلی بار اُسکے بیلے کیتھا

کام کیا تھا۔ اُسکے بعد سے اُس نے خود کو مسز بوس کیلئے وقف کر دیا ہے۔ اب وہ بمبئی کے نگار خانوں میں کم چکر لگاتا ہے۔ اور ایک پروانے کیطرح شاردا گھوش کے گرد رہتا ہے جو اب اُسے اپنی انجمن کی آخری شمع سمجھتی ہے۔ شاردا گھوش سے رندھیر کا کیا رشتہ ہے۔ یہ سب قیاس کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے رندھیر عیش کرتا ہے۔ کوئی کہتا ہے مسز بوس سے رندھیر کا وہی رشتہ ہے جو "آرمی" فلم میں ہوٹل والے لڑکے کا طوائف ہیروئن سے تھا۔ رندھیر خود کچھ نہیں کہتا، کوئی اُس سے پوچھے تو وہ مسخرا بنجاتا ہے اور ہا ہا ہا، ہی ہی ہی، خی خی خی، کمینے، جاہل، ذلیل۔

شاردا گھوش رندھیر کیلئے ایک محبوبہ ہے، ایک ماں ہے، ایک سرپرست ہے، رندھیر اُسکے لئے ایک پروانہ ہے، ایک سکریٹری ہے، ایک خادم لڑکا ہے۔ وہ شاردا گھوش کی بوتل سے شراب پیتا ہے، جب گھر نہیں آتا تو ڈرائنگ روم میں اُسکے صوفے پر سو جاتا ہے ٹیلیفون پر پیغام وصول کرتا ہے اور شاردا گھوش کی میز پر کھانا کھاتا ہے کبھی اُسمیں اُسے ایک فخر محسوس ہوتا ہے کبھی ذلت تحقیر، شرمساری لیکن وہ شاردا گھوش کے آنچل کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اُسے شاردا گھوش سے عشق ہے، اُسے شاردا سے اُمید ہے، شاردا نے اُسے مایوسی کے عمیق تاریک غار میں گرنے سے بچالیا ہے۔

شاردا کی سفارش سے اُس نے کسی فلم میں ایک گیت لکھا تھا اُس گیت کا کل اسے معاوضہ ملا تھا۔ وہ روپیہ کل ہی شرابخانے میں ختم ہوگیا۔ گھر آتے ہوئے اُسکی جیب میں ایکروپیہ چار آنے تھے، روپیہ اُسنے صبح ہری کو دیدیا، اُسے معلوم تھا کہ چار آنے میں وہ دن بھر گذارہ نہیں کرسکیگا لیکن اپنے دل کے اندر اُسے خود

قصوروار ہونے کا احساس تھا۔ روپیہ اُس نے ہری کو دیدیا، وہ خوشی اور سے مانگ لیگا۔ مہندر سے مانگنا بیکار ہے، اُس نے سوچا، اُسے غصہ آرہا ہے اُسکے پاس ہوئے بھی تو نہیں دیگا۔

مہندر کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ہوتے بھی تو وہ اسوقت رندھیر کو نہیں دیتا۔ اُسکا جی چاہ رہا تھا کہ رندھیر کو جی بھر کر گالیاں دے۔ اس سے پہلے بھی وہ رندھیر کو اکثر گالیاں دے چکا تھا لیکن رندھیر نے ہمیشہ ہنسکر ٹال دیا تھا۔ یہ ہنسی ہنسی نہ تھی، مہندر کو احساس ہوتا تھا، جب احساس عزت مرجاتا ہے، خودداری مٹ جاتی ہے، ضمیر مُردہ ہوجاتا ہے تو اُسکے بدن سے یہ ہنسی پھوٹتی ہے، یہ ہنسی جو ہنسی نہیں ہوتی، موت ہوتی ہے۔ اس ہنسی کو دیکھ کر مہندر ہمیشہ خاموش ہوجاتا تھا، آج بھی وہ خاموش ہوکر رہ گیا لیکن خلافِ معمول آج بعد میں بھی ایک غصہ اُسکے دل میں کھولتا رہا۔ اگر رندھیر روپے ضائع نہ کرتا تو آج وہ کٹی سے مل سکتا تھا۔ وہ کل نہیں آئی تھی ممکن ہے آج آئے۔ شاید وہ آج آئیگی اور آج اُسکے پاس پھر روپیہ نہیں ہے۔ روپیہ اور کہیں سے نہیں مل سکتا چیٹرجی خود ایک وقت کھانا کھاتا ہے، اُس سے مانگنا بیجا ہے۔ سردار شاید دے سکتا ہے مگر وہ سردار سے مانگنا نہیں چاہتا۔ اُسے سردار سے نفرت ہے گورمکھ کے متعلق اُسکے دل میں ایک ناپسندیدگی کا جذبہ جڑ پکڑ گیا ہے کئی بار اس جذبے کے زیرِ تحت اُسنے گورمکھ کی تھاز یادتی بھی کی تھی، اپنی ان زیادتیوں پر وہ بعد میں شرمندہ بھی ہوا تھا، لیکن گورمکھ سے نفرت اسیطرح موجود تھی۔ وہ گورمکھ کا ممنون ہونا نہ چاہتا تھا لیکن اور کوئی ذریعہ نہیں ہے، اُس نے سوچا، اُس سے مانگ کر دیکھوں، شاید دیدے، مگر

جن جذبات کے ساتھ میں اُس سے مانگ رہا ہوں۔ یکمینہ پن ہوگا اُسے خیال آیا لیکن خود کو کمینے کے سپرد کر دیا۔ گورکھ کو چند ہی روز ہوئے تنخواہ ملی ہے۔

گورکھ کو چند ہی روز پہلے تنخواہ ملی تھی لیکن اُس نے مہندر کو قرض دینے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ اُسکے پاس دوسروں کو عیاشی کرانے کیلئے فالتو روپیہ نہیں ہے۔ اُس نے سوچا تھا اور کہدیا تھا روپے کی ضرورت ہوتی ہے تو مجھسے مانگتے ہیں، اُس نے دفتر جاتے ہوئے زینے پر سے اُترتے ہوئے سوچا، جیسے ہمیشہ میرے اوپر احسان ہی کرتے رہے ہیں۔ گورکھ لوگوں کی مہربانیوں کو بھولکر اُنکی زیادتیوں کو یاد رکھتا ہے۔ اُسے لوگوں کی مہربانی اور ہمدردی سے نفرت ہے اور اُنکی مہربانیاں اُسکے دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ اُسے اچھی طرح یاد ہے کہ پچھلے دنوں جب وہ خسرہ میں مبتلا تھا تو کوئی اُسکے پاس نہ آتا تھا کسی نے اُس سے یہ تک نہ پوچھا تھا کہ تم اُٹھ کر پانی پی سکتے ہو یا نہیں۔ خود مہندر نے جو انسانیت چلاّتا تھا اُسکے ماتھے پر ہاتھ رکھکر یہ نہ پوچھا تھا کہ بخار کتنا ہے۔ اُسے مہندر سے نفرت ہے، اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ مہندر کو اُس سے نفرت ہے اور اُسے قرض دینے سے انکار کر کے گورکھ دفتر چلا آیا تھا مہندر نے اُسکے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا، یہ محض اُسکے دل میں ایک بہانہ تھا، دراصل وہ کسی کی مدد کرنا نہیں چاہتا جسد نے اُسکے تمام جذبات کو مفلوج کر لیا ہے۔ وہ خوش نہیں ہے اور دوسروں کو خوش دیکھکر جل اُٹھتا ہے، وہ کسی کی خوشی حاصل کرنے میں مدد نہیں کر سکتا۔ وہ ابتک اپنی کوشش میں ناکام رہا ہے اور نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا کامیاب ہو۔

گورکھ لاہور سے ناکام ہو کر بمبئی آیا تھا۔ لاہور سے بی اے پاس کرنے کے بعد

اُس نے کوشش کی تھی کہ کوئی اچھی نوکری ملجائے اُسکی زندگی میں عظیم الشان تمنائیں نہیں بس ایک خوبصورت سا گھر ہو، ایک خوبصورت بیوی ہو اور اطمینان ہو لیکن لاہور میں اُسے یہ نہ مل سکے۔ دو سال کوشش کرنیکے بعد اُسے محسوس ہوا تھا کہ لاہور میں اچھی نوکریاں زمیندار فرقے کو ملتی ہیں۔ گورمکھ کے پاس زمین نہ تھی۔ زمین کب اُسکے بزرگوں سے چھن گئی تھی یہ اُسے معلوم نہیں پشتوں سے وہ کرائے کی زمین پر رہے تھے اور پنجاب میں اچھی نوکریاں زمینداروں کو ملتی ہیں۔ گورمکھ نے کئی سال کوشش کی تھی لیکن ہمیشہ ناکامی نے اُسکے چہرے پر طمانچے مارے تھے۔ لاہور سے مایوس ہوکر وہ بمبئی آیا تھا کہ یہاں اُسے کوئی اچھا موقعہ ملجائے لیکن یہاں بھی وہ ناکام رہا بمبئی میں سرکاری نوکریاں بمبئی والوں کو ملتی ہیں۔ گورمکھ بمبئی والا نہ تھا۔ وہ پنجاب میں زمیندار نہ تھا بمبئی میں بمبئی کا باشندہ نہ تھا۔ اُسے غصہ آتا تھا کہ بمبئی اور پنجاب کی بیہودہ تمیز کیوں ہے، زمیندار اور بے گھر کی غیر منصفانہ تفریق کیوں ہے، وہ کہاں جائے، وہ کیا کرے؟۔

شکست کھاکر وہ یہاں ایک آرڈیننس ڈپو میں نوکر ہوگیا تھا یہاں وہ صبح آٹھ بجے گھر سے جاتا ہے، شام کو چھ بجے واپس آتا ہے، اور تین روپے روز اُسے معاوضہ ملتا ہے۔ وہ خوبصورت مکان جو اُس نے اپنے سینے میں بنایا تھا گر گیا، وہ حسین لڑکی جو اُسکے خوابوں میں آتی تھی مرگئی ہے اور گورمکھ سب کا دشمن ہوگیا ہے۔

شام کو دفتر سے آنے پر وہ صرف کھانا کھانے تک کیلئے ہوٹل جاتا ہے اور پھر واپس آجاتا ہے۔ اُسکی زندگی صرف ڈپو اور آشیانے میں بٹ گئی ہے۔ آشیانے کے دوستوں کو تعجب ہوتا ہے کہ گورمکھ زندہ کسطرح رہتا ہے، اُسے نہ سینما کا شوق ہے نہ سیر کا، اُسے کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہی ہے وہ یا تو گھر میں اکیلا اپنے بستر پر لیٹا رہتا ہے یا ڈپو میں

کام کرتا ہے۔ گورمکھ نے خود کو تفریح سے انتقاماً علیحدہ کر لیا ہے۔ جو شے اُسے مکمل طور پر نہیں ملی۔ اُسکے ایک حصّہ سے فائدہ نہ اُٹھا کر اپنے اوپر تکلیف اُنڈیل کر وہ دنیا سے انتقام لیتا ہے آشیانے کے دوست اُسکی اس خود غرضی سے تنگ ہیں کہ وہ کسی کے کام نہیں آتا جب وہ آسانی سے مدد کر سکتا ہے تب بھی نہیں کرتا اسی لئے مہندر اُس سے نفرت کرتا ہے، اسی لئے وہ اور سب کو ناپسند ہے۔ گورمکھ کے پاس بھی اب صرف نفرت رہگئی ہے اور تلخی۔ وہ بھی سب سے جلتا ہے اور مہندر کو قرض دینے سے انکار کر کے چلا آیا ہے۔

"اُس سے اُمید ہی یہ تھی، وہ کیوں مہندر نے سوچا، پھر اُسے جھنجھلاہٹ ہوئی کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہیں دیگا۔ اُس نے گورمکھ سے کیوں مانگا تھا وہ کیوں اتنا گر گیا تھا کہ اپنے دل میں دوستی کے کسی جذبے کو محسوس کئے بغیر اُس نے گورمکھ سے فائدہ اُٹھانا چاہا تھا۔ یہ خیال گورمکھ کے انکار کرنیکے بعد اب چُبھ رہا تھا۔ پہلے اُسنے اُسے ایکطرف ہٹا دیا تھا لیکن اب وہ اسکے لئے ندامت محسوس کر رہا تھا، اچانک اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اُسکے جذبات پر ایک ادراکی ملمع ہے اور اسکے نیچے وہ بھی کمینہ ہے اور اُسے خود پر غصّہ آرہا تھا۔ یہ بات اُسکے ضمیر میں کھٹک رہی تھی اُس نے خود کو تسلّی دی کہ ابھی ضمیر مُردہ نہیں ہوا ہے، اتنے عرصے سے وہ اسے بچاتا رہا ہے لیکن آخر یہ ضمیر مردہ ہو جائیگا۔ اور یہ قدرتی بات ہوگی، وہ حسب معمول سوچنے لگا خیالات کی یہ رو اُسکی ذاتی صفائی میں آئی تھی، انسان خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیتا ہے، کہ کمینہ پن، ذلت اور دنائیت بنیادی طور پر انسان کی فطرت میں نہیں ہیں۔ اور اگر حالات سنور جائیں تو انسان کی فطرت ان سے مبرّا ہو جائیگی

وہ یہ سوچتا رہا اور اپنے قصور کا احساس اُسکے ذہن سے دور ہوتا گیا۔ یہ نظام بدلجائے تو ابھی انسان کیلئے اُمید ہے انسان پھر ایماندار، نیک اور امن پسند ہو سکتا ہے دنیا پر ہر آن لرزتا ہوا۔ یہ جنگ کا خطرہ دور ہو سکتا ہے طوائفیں پھر عورتیں بن سکتی ہیں اور کٹی ——؟

لیکن ابھی یہ نظام یونہی ہے ابھی کٹی کی محبت سکوں سے خریدی جائیگی اُسے کٹی سے محبت ہے، چاہے وہ سکوں کے ہی دیدے کیوں نہ ہو، وہ اُسے اپنانا چاہتا ہے اور وہ کٹی کو اپنا نہیں سکتا۔ شاید وہ شام کو آئے، مگر وہ شام کو نہیں جا سکتا۔

وہ شام کو نہیں جا سکا، اب شام گزر چکی تھی۔ کمرے میں روشنی کم ہو رہی تھی اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ آشیانے کے دوست باہر گئے ہوئے تھے، مہندر کو ایک ہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس شکست کی حالت میں اُسمیں ہمت نہ تھی کہ اُنکے نشتروں کو برداشت کر سکے آج اسکا جی چاہ رہا تھا کہ آشیانے کو چھوڑ کر چلا جائے، بمبئی کو چھوڑ دے۔ یہ خیال نیا نہ تھا، پہلے بھی بار ہا آیا تھا، ناکام ہو کر کئی مرتبہ دل میں فرار کا جذبہ پیدا ہوا تھا ہمیشہ وہ اسے ایک بزدلانہ قسم کی جذباتیت پر محمول کر کے مسکرا دیا تھا لیکن آج وہ مسکراہٹ ناپید تھی آج وہ اس جگہ کو چھوڑنا چاہتا تھا اور دراصل یہاں سے جانا نہ چاہتا تھا ایک زیر نفسی صدمے نے اُسے بیزار کر دیا تھا۔ وہ نیم تاریک کمرے میں بستر پر نیم دراز پڑا رہا۔ "مجھے تم سے عشق ہے"۔ ممکن ہے یہ سچ ہو مگر وہ خالی جیب اُسکے پاس نہیں جا سکتا۔ شاید اُس حالت میں وہ کٹی کی نظر میں ایک بھکاری بنجائے ایک عاشق نہ رہے

وہ بیٹھا رہا اور وقت گزرتا گیا۔ پھر کسی نے دروازہ کھولا، چیٹرجی اندر آگیا۔

"ابھی سے کیسے آگئے؟" مہندر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

چیٹرجی نے اُسکے ہاتھ میں دس دس روپے کے دو نوٹ تھما دیئے۔
"یہ کیا ہے؟" مہندر سمجھ نہ سکا چیٹرجی ایک وقت کھانا کھاتا تھا۔
"تمھیں روپے کی ضرورت ہے نا"۔
"مگر یہ ـــــ تمھارے پاس روپے تھے؟"۔
"نہیں ـــــ میں نے اپنی انگوٹھی گروی کر دی ہے"۔ چیٹرجی نے مُسکرا کر کہا اُسکی مُسکراہٹ میں غم کی وہ پہلی لکیر تھی جو دیر تک مہندر کے دل پر کھنچی رہی۔
"وہ انگوٹھی تمھاری ماں کی یادگار تھی، میرے لئے تمنے اُسے گروی رکھدیا"
"ـــ نہیں"۔ ایک لمحے کے بعد چیٹرجی نے جواب دیا۔ "وہ انگوٹھی میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا، مجھے ہوٹل والے کا بل دینا تھا"۔
وہ دونوں نوٹ ابتک مہندر کے ہاتھ میں لرز رہے تھے۔ اچانک مہندر کو محسوس ہوا کہ یہ نوٹ دو موتی ہیں، دو آنسو ہیں، خون کے دو قطرے ہیں۔ اُسنے نوٹ واپس چیٹرجی کے ہاتھ میں دیدیئے۔ اُس نے چاہا کہ چیٹرجی کو سینے سے لگائے مگر ایک عجیب سے حجاب کا احساس کر کے وہ یہ کر نہ سکا۔ اُسنے صرف چیٹرجی کے کندھے پر ہاتھ رکھدیا
"مجھے اب اُنکی ضرورت نہیں ہے"۔ اُس نے مُسکرانے کی کوشش میں کہا ـــ
"انھیں تم اپنے پاس رکھو تمھیں ضرورت ہوگی"۔ اور چیٹرجی کو چھوڑ کر وہ بالکنی میں جا کھڑا ہوا ابتک وہ چیٹرجی پر صرف رحم کرتا رہا تھا۔ آج اُسکے لئے مہندر کے دل میں آنسوؤں سے ڈھلی ہوئی محبت پیدا ہوگئی وہ جانتا ہے کہ چیٹرجی ہمیشہ زندگی کے درد میں شریک رہا ہے اُس نے خوشی کبھی نہیں دیکھی، کبھی راحت نہ اُٹھائی۔ چیٹرجی کو اُسکے بھائی نے فوٹو گرافی کا کام سکھایا تھا بنگال کے ایک چھوٹے سے قصبے میں اُسکی دکان تھی چیٹرجی

اُس قصبے کی دکان پر کام کرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ زندگی میں عزت آرام اور خوشی چاہتا تھا۔ وہ عزت، وہ آرام، وہ خوشی اُسے ابتک نہ ملی پانچ سال پہلے وہ اپنے بھائی کو چھوڑ کر بمبئی آیا تھا یہاں وہ فلمی کیمرہ مین ہونا چاہتا تھا بمبئی کے ایک نگار خانے میں وہ کئی سال کام سیکھتا رہا اور کسی نے اُسے کام نہیں سکھایا وہ بنگالی تھا۔ یہاں گجراتی بنگالیوں سے نفرت کرتے تھے، مراہٹی گجراتیوں سے نفرت کرتے تھے پنجابیوں سے نفرت کرتے تھے۔ یہ نفرت کی دنیا تھی، یہاں انسانی محبت نابود تھی چیٹرجی کو لیبوریٹری کی بالٹیاں منجھوائی جاتی تھیں، اُس سے فلمیوں کیطرح کام لیا جاتا تھا اور کوئی اُسے کچھ نہ بتاتا نہ تھا لیکن چیٹرجی نے ایک کُتے کیطرح صبر سے کام لیا ایک جونک کی طرح غلاظت سے چمٹا رہا۔

لیکن اب کام سیکھنے کے بعد ابھی اُسے کوئی کام نہیں دیتا۔ کوئی اُسکے کپڑے دیکھ کر بھوئیں چڑھا لیتا ہے، کوئی اُسے بنگالی ہونے کی وجہ سے پاس نہیں آنے دیتا چیٹرجی نے ٹھوکریں سہنا سیکھ لیا ہے وہ ہر ذلت، ہر توہین، ہر ظلم برداشت کر لیتا ہے۔ وہ ایک وقت کھانا کھاتا ہے اور ہر ہفتے اُسکا وزن کم ہو جاتا ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود اُسکے دل میں جیون کیسے رہ گیا۔ مہندر سوچ رہا تھا کیسے اُس نے اپنے دل میں اس انسانیت کو بچا لیا۔ اُسکا فیعل ہر اُس شئی کا حامل تھا جو انسان میں خوبصورت ہے لیکن وہ چیٹرجی کے روپے نہ لے سکتا تھا۔ وہ کبھی پر روپے صرف کرنا چاہتا تھا لیکن ان روپوں کو کبھی پر صرف کر کے وہ ہمیشہ خود کو مجرم سمجھتا رہیگا۔ یہ نہیں ہوگا اور اُسکے پاس اپنا روپیہ نہیں ہے، وہ کبھی سے نہیں ملیگا اور اُسکے دل میں یہ محبت آہستہ آہستہ مُردہ ہو جائیگی۔ یہ شمع جو اُسکے سینے میں جل اُٹھی تھی

بُجھ جائے گی اور دل میں پھر وہی غیر محدود گہرا اندھیرا چھا جائیگا۔

بالکنی میں کھڑا ہوا وہ سوچتا رہا۔ باہر اندھیرا ہو گیا تھا اور بُوندیں پڑ رہی تھیں۔ لیمپ پوسٹ کی دھیمی روشنی میں گلی بے رونق پڑی تھی اور بارش کی بوندیں متواتر گیلی زمین پر پڑ رہی تھیں۔ کیچڑ کی چھینٹیں اُڑاتی ہوئی مالک مکان کی کار گلی میں داخل ہوئی اور آشیانے کے آگے رُک گئی۔ آج ہفتے کی رات تھی۔ مالک مکان کار سے اُترا پھر اُس نے عورت کو ہاتھ پکڑ کر نیچے اُتارا۔ یہ کیٹی تھی!

ایک لمحے کیلئے مہندر کو یقین نہیں آیا۔ یہ عورت جو مالک مکان کا ہاتھ پکڑ کر کار سے اُتری تھی؟ پھر اُسے یقین آ گیا۔

کیٹی مالک مکان کے ساتھ اندر چلی گئی۔ مہندر بالکنی میں کھڑا رہا۔ کار سڑک پر کھڑی رہی۔ ایک پیہم تسلسل سے بارش کی بوندیں نیلی کار پر پڑ رہی تھیں، جیسے آنسو برس رہے ہوں۔

زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں

مہندر ناتھ

صفحات :- ۳۲

اُس نے نیا سُوٹ پہنا، اور قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ سر کے بال کچھ بکھرے ہوئے تھے۔ اُس نے بُرش سے بالوں کو اپنی جگہ پر جمایا اور سر کو جھٹک کر پھر آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُسے اپنی ناک کچھ لمبی سی دکھائی دی۔ کاش اُسکی ناک اتنی لمبی نہ ہوتی تو اُسکی زندگی زیادہ خوشگوار ہو جاتی۔ سر پر ہیٹ رکھکر اُس نے ایک شعر گنگُنانا شروع کیا۔ بیگ میں کچھ کاغذ رکھے۔ اور نوکر کو چند ہدایات دینے کے بعد سیڑھیاں اُترنے لگا۔ آج وہ خوش تھا۔ اُسکے نوکر نے نہایت ہی لذیذ کھانا پکایا تھا اور اُس نے پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ وہ جلدی سیڑھیاں اُتر گیا اور اپنی پُرانی کار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گو کار پرانی تھی لیکن آجکل کار سستے داموں میں کہاں ملتی ہے۔ بڑی کوششوں کے بعد اُسے یہ کار ملی تھی۔ کار خریدنے کے بعد لوگوں میں اُسکی عزت اور توقیر بڑھ گئی تھی۔ کہاں تو دوست یار اُسے انشورنس ایجنٹ کہکر

ذلیل کرتے تھے۔ کہاں اب وہی دوست اُس سے ملنا اپنی عزت سمجھتے ہیں اور اُس نے کار کا دروازہ کھولا اور ہینڈل کو رومال سے صاف کرنے لگا۔ اُس نے سوچا کہ وہ کدھر جائے۔ یونہی اسے خیال آیا کہ پہلے کار میں بیٹھ جائے۔ پھر سوچے گا کہ اُسے کدھر جانا ہے۔ کار میں بیٹھے ہوئے اُسے چند سیکنڈ ہی گذرے تھے، کہ گرمی سے اُسے پسینہ آنے لگا۔ اُس نے ہینڈل گھمایا۔ اور کار کو اسٹارٹ کر دیا ایک چھچھلتی ہوئی نگاہ سامنے والے مکان پر ڈالی جہاں اُسکا دوست سرنیدر رہتا تھا۔ کیوں نہ اُسے بلالے اور دونوں سیر کرنے چلیں کمبخت سو رہا ہوگا یا کوئی کتاب پڑھ رہا ہوگا یا کوئی بیہودہ سی کہانی لکھ رہا ہوگا۔ کہتا ہے میں افسانہ نگار ہوں، ایسے افسانہ نگار بہت دیکھے ہیں اُسکی زندگی ہی فلیٹ میں گذر جائیگی کسی سے ملتا بھی تو نہیں تمیز کیسے کریگا۔ لعنت بھیجو اسپر۔ مرنے دو کمبخت کو۔ اُسے اپنی اقتصادی حالت کو دوسروں سے بہتر دیکھکر خوشی محسوس ہوئی۔ ہینڈل کو گھماتے ہوئے وہ کار کو آگے لے گیا۔ اب کار آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ اور وہ سگریٹ کا دھواں کار میں بکھیر رہا تھا۔ آج وہ خوش تھا بیحد خوش تھا۔ زندگی گذر رہی تھی اچھی گذر رہی تھی۔ جب انسان کا پیٹ بھرا ہوا ہو اور بٹوے میں چاندی کے سکے ہوں، اور کار بھی ہو، اور وہ دیکھ رہا ہو کہ اُسکے بھائی پیدل چل رہے ہیں اور اُسکی کار خراماں خراماں آگے آگے بڑھ رہی ہے تو اُسکی خوشی کی کیا انتہا ہو سکتی ہے۔ اُس نے سوچا کہ وہ ان سے کئی درجے بہتر ہے احساس برتری سے اُس نے گردن کو اکڑا لیا۔ اور سگریٹ کے دھوئیں کو زور سے چھوڑتے ہوئے کار کی رفتار کو تیز کر دیا۔ ہوا خوشی سے گاتی ہوئی اُسکے قریب سے گذر گئی۔ اب دادر قریب آ رہا تھا۔ اب خداداد سرکل آ گیا تھا۔ ایک لمحہ کیلئے اُس نے بائیں طرف دیکھا

دو خوبصورت آنکھیں اُسے دیکھ کر مُسکرا رہی تھیں۔ "مجھے" اُس نے سوچا۔ جیسے اُسے اُن آنکھوں پر یقین نہ آیا ہو۔ اور وہ کار کو گھما کر آگے بڑھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا اور کار آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ کیا کرے کیا واپس مُڑ کر لڑکی کے قریب سے گذرے۔ شاید وہ پھر مُسکرائے لیکن اُسے خیال آیا۔ کہ اُسکی ناک لمبی ہے۔ کوئی لڑکی اُسے دیکھ کر مُسکرا نہیں سکتی کئی بار وہ اسی کار میں بیٹھکر اسی سرکل کے قریب سے گذرا ہے لیکن کسی لڑکی نے اُسکی طرف مُسکرا کر نہیں دیکھا تھا لیکن اسوقت اسکا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ میاں چلو ایکبار پھر اُسی لڑکی کے قریب سے گذرو۔ اُس نے ہینڈل کو گھمایا۔ اور کار پھر واپس چلی۔ اب کے لڑکی پھر مُسکرائی، اُس نے کار روک لی، اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولدیا۔ اُسکی پریشانی کی حد نہ رہی۔ جب معلوم ہوا ایک کی بجائے دو لڑکیاں پچھلی سیٹ پر آگئی تھیں اُسکا دل دھک دھک کر رہا تھا، اُس نے نہایت پھرتی سے کار کا دروازہ بند کیا اور لڑکیوں پر اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے، کار سٹارٹ کردی، لڑکیاں پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں، اور وہ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا کار کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا، ایک مرد اور دو عورتیں۔ یہ ایک خطرناک مثلث تھی، وہ تو صرف ایک لڑکی چاہتا تھا۔ دو کسطرح اور کیوں آگئیں۔ وہ اُن سے کیا کہے، بڑے سوچ بچار کے بعد اُس نے "ہیلو" کہا اور اُسکی پیشانی پر پسینہ آگیا، اُس نے مُڑکر دیکھا۔ دونوں لڑکیاں پھر مُسکرا رہی تھیں یا وہ کچھ گھبرا سا گیا ہینڈل ایک طرف کو مُڑ گیا، اور ساتھ ہی ایک چیخ سُنائی دی، اُس نے فوراً بریک لگادی، ایک اینگلو انڈین لڑکی کار کے نیچے آتے آتے بچگئی تھی اینگلو انڈین لڑکی نے قہر آلود نگاہوں سے اُسکی طرف دیکھا اور کہا۔

"یو فول"۔

"آئی۔ ایم۔ ساری"۔ اُس نے کہا! اور کار کو پوری رفتار سے چھوڑ دیا۔ دونوں لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں لیکن اُنکی باتیں اُسکی سمجھ سے باہر تھیں، اُس نے کن انکھیوں سے لڑکیوں کیطرف دیکھا۔ اسکے اُسکے ہاتھوں نے بڑی مضبوطی سے ہینڈل کو پکڑا ہوا تھا۔ لڑکیاں اُسکی طرف دیکھ رہی تھیں مُسکرا رہی تھیں! ایک لڑکی نے آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے کہا" ہیلو" یہ سُنتے ہی وہ خوش ہوگیا۔ اور اُسے محسوس ہوا کہ آج اُسکی ناک چھوٹی ہوگئی ہے۔ بہت ہی چھوٹی ہوگئی ہے! اور اگر لڑکیاں اسی طرح اس پر مہربان ہوتی گئیں۔ تو ایکدن اُسکی ناک بالکل غائب ہو جائیگی لیکن اس خطرناک مثلث کا کیا علاج ہوگا۔ ایک مرد اور دو عورتیں، وہ اُن سے اکیلا کیا بات کرے۔ دونوں لڑکیاں پارسنیں تھیں، دونوں خوش شکل تھیں، خوبصورت تھیں دونوں مُسکرا رہی تھیں، دونوں کے بال کٹے ہوئے تھے اور دونوں نے Skirts پہنی ہوئی تھیں دونوں کی ٹانگیں ننگی تھیں، سپید تھیں، آنکھوں میں شوخی تھی، شرارت تھی، لبوں پر لپ سٹک تھی، اور سیاہ بالوں میں جوانی کی چمک تھی، آجتک کسی خوبصورت عورت نے اُس سے بات تک نہ کی تھی، یوں تو وہ فارس روڈ پر کئی بار چکر لگا چکا تھا لیکن وہ پڑھی لکھی لڑکیوں، خوش پوش پارسنوں، اور خوبصورت لڑکیوں کی صحبت سے بالکل بیگانہ تھا اگر ایک لڑکی ہوتی، تو وہ اُسے اپنے پاس بٹھا لیتا۔ یہ سوچتے سوچتے وہ اپنے گھر کے قریب آگیا، اور کار کو روک لیا۔

اپنی سیٹ سے اُتر کر وہ لڑکیوں کے قریب گیا۔ دونوں مُسکرا رہی تھیں۔

"تمہارا نام"

"کٹی"۔ لڑکی نے جواب دیا۔

"اور تمھارا"۔

"لمٹی"۔

"کٹی اور لمٹی لمٹی اور کٹی" وہ بڑبڑایا کٹی لمٹی سے زیادہ خوبصورت تھی زیادہ چالاک تھی، اُسکی آنکھوں سے شرارت جھلکتی تھی، اُس نے زبان کو لبوں پر پھیرتے ہوئے کہا "آؤ چلیں"!

"کہاں؟"

"بس یونہی سیر کرنے"۔

"لیکن میں اکیلا ہوں، اُس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

"تمھارا اور کوئی دوست نہیں" کٹی نے چمک کر کہا۔

اور اُسکی جان میں جان آئی، اُس نے سریندر کو آواز دی۔ سریندر آواز سنکر پہچان گیا۔ کہ سالا ایجنٹ ہوگا۔ سریندر کو ایجنٹ سے نفرت تھی لیکن وہ ایجنٹ کی کار سے محبت کرتا تھا، وہ انڈرویر پہنکر فرش پر لیٹا ہوا تھا، جلدی سے اُٹھکر اُس نے بالکونی سے نیچے دیکھا، گوپال اُسکی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا، اُس نے وہیں کھڑے ہو کر کرخت لہجے میں پوچھا:

"کیا بات ہے؟"۔

ایک لڑکی نے سر نکالا، اور اُسکی طرف دیکھا،

گوپال نے آنکھ ماری اور رعب دار لہجے میں کہا، "کپڑے پہنکر فوراً آؤ"۔

سریندر نے ایک نئی ہیٹ نکالی، بالوں میں تیل لگایا۔ مانگ نکالی اور سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔

گوپال نے کٹی اور لمٹی سے تعارف کرایا۔ سریندر نے لڑکیوں کو دیکھا۔ اور اُسے محسوس ہوا کہ ان لڑکیوں کو اُس نے ضرور کہیں دیکھا ہے، شاید دادر سرکل کے قریب یہ آنکھیں ایکبار مُسکرائی تھیں، اُس نے ان لڑکیوں کا ایکبار تعاقب کیا تھا، لیکن وہ لڑکیوں سے بات نہ کر سکا تھا، دونوں لڑکیاں اسے پسند تھیں لیکن کٹی اُسے زیادہ پسند تھی۔

کٹی اُٹھکر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اور وہ لمٹی کے ساتھ بیٹھ گیا، سریندر خوش شکل تھا، شاید اسی لئے لڑکیاں اُسکی طرف جلدی مخاطب ہوئیں لڑکیاں باتیں کم کرتی تھیں، مسکراتی زیادہ تھیں، اُس نے اپنی فیلٹ لمٹی کے سر پر رکھدی۔

لمٹی نے کہا۔ "تھینک یو" اور اُسکی طرف دیکھ کر مُسکرانے لگی، اور زبان لبوں پر پھیرنے لگی، کٹی نے گوپال کو ہلکی سی چپت لگائی اور کار کو سٹارٹ کرنے کیلئے کہا۔ گوپال نے سریندر کو دیکھا۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہو، کدھر چلیں۔

"آپ کچھ کھائیں گی"

دونوں نے سر ہلایا۔ اور سریندر نے گوپال کو کسی نزدیک کے ایرانی ہوٹل میں چلنے کیلئے کہا۔ گوپال نے کار سٹارٹ کر دی، اور چند منٹوں میں وہ ایک ایرانی کے ہوٹل میں داخل ہو کر ایک فیملی روم میں بہرے کو بلا کر چائے اور آملیٹ کیلئے آرڈر دیا۔ اب کے سریندر لمٹی کے قریب بیٹھ گیا۔ اور گوپال کٹی کے قریب چاروں ایکدوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے، اب چاروں خاموش تھے، چُپ چاپ تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

یہ خاموشی عجیب سی خاموشی تھی، سریندر نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے

لمٹی سے کہا۔

"آپ کے ہاتھ بہت ہی خوبصورت ہیں"۔

"آپ مجھ سے ایسی باتیں نہ کیجئے"۔ لمٹی نے جل کر کہا۔

گوپال کٹی کے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ یکایک اُسکا ہاتھ کٹی کے گالوں سے چھو گیا۔

"Learn manners" کٹی نے گھورتے ہوئے گوپال سے کہا

گوپال کچھ کھسیانہ سا ہو گیا۔ اتنے میں بیرے نے چائے اور آملیٹ میز پر رکھدیئے۔ اور وہ سب کھانے لگے۔

سریندر کا ہاتھ یکایک لمٹی کی سفید ٹانگوں سے جا لگا۔ اور لمٹی نے سریندر کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔ اور پھر آملیٹ کھانے لگی۔ گوپال نے اپنی کرسی کٹی کے اور نزدیک کر لی لیکن کٹی نے اپنی کرسی اور دور کر لی، اور پھر مسکرانے لگی، گوپال نے کرسی نزدیک کر کے کٹی کی کمر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی، کٹی نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔ اس جھٹکے سے آملیٹ کی پلیٹ نیچے گر گئی۔ دونوں کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

کٹی نے قہر آلود نگاہوں سے گوپال اور سریندر کی طرف دیکھا اور کہنے لگی "میں سمجھتی تھی کہ آپ لوگ شریف ہونگے، لیکن آپ تو بہت ہی بدتمیز ہیں"

گوپال اور سریندر خاموش رہے۔

"اگر آپ ہمیں اسی طرح تنگ کرینگے۔ تو ہم ابھی چلی جائینگی" اور وہ دونوں اُٹھ کھڑی ہوئیں، سریندر نے دونوں کی منت سماجت کی کہ اب دوبارہ کسی قسم

کی حماقت نہ ہوگی، خدارا تم دونوں بیٹھ جاؤ، اس منت سماجت کا اثر ضرور ہوا! اور وہ دونوں پھر چائے پینے لگیں۔ چائے پینے کے بعد وہ ریسٹورنٹ سے باہر نکلے۔

دونوں اپنے کئے پر نادم تھے، لیکن جب چاروں سڑک پر آگئے تو لوگ انھیں گھور گھور کر دیکھنے لگے، گوپال اور سریندر کو ایسا محسوس ہوا۔ کہ سبھی لوگ انھیں خوش قسمت سمجھتے ہیں، کہ اُنکے ساتھ دو پارسی لڑکیاں ہیں؛ اور وہ بھی کتنی خوبصورت! اس احساس سے اُنکے دلوں میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی، اور وہ گذری ہوئی باتوں کو بھول کر کار میں بیٹھ گئے،

اس بار لٹی گوپال کے بجائے بیٹھی اور کٹی سریندر کے تھا، دراصل سریندر خود کٹی کے ساتھ بیٹھنا چاہتا تھا، کٹی کو وہ پسند کرتا تھا، وہ لٹی سے زیادہ باتیں کرتی تھی لٹی سے زیادہ چالاک تھی، اسکی مسکراہٹ میں ایک جاذبیت تھی، اور جس انداز سے وہ دو ٹوٹے ہوئے دانتوں کے بیچ سے زبان نکالتی تھی وہ اُسے بیحد پسند تھا، دونوں کی شکلیں ایکدوسرے سے بہت ملتی جلتی تھیں، دونوں کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ابھی نوعمر ہیں، اُنکی شرارتیں ہنسی، دبی دبی مسکراہٹ! اور کن انکھیوں سے دیکھنا۔ اکثر اُنکی حرکتوں کو زیادہ جاذب نظر بناتا تھا۔ گوپال نے کار کو پوری رفتار سے چھوڑ دیا۔ اور سریندر کٹی کے قریب سرک گیا۔ اُسکی ٹانگیں کٹی کی برہنہ ٹانگوں سے چھو رہی تھیں۔ وہ ایک حسین، خوبصورت لڑکی کی موجودگی کے احساس سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اور وہ لڑکی بھی اُسکی جمالیاتی حس پر پوری اُترتی تھی ہوا فراٹے بھرتی ہوئی گذر رہی تھی، اور کٹی کے سیاہ بال ہوا میں لہرا رہے تھے، گوپال لٹی سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا، اور وہ ہنس ہنس کے باتیں کیوں نہ کرتا، اُسکی زندگی

میں یہ پہلا موقع تھا جب اُسے ایک خوبصورت لڑکی کا قرب حاصل ہوا تھا۔ اور یہ لڑکیاں بھی کتنی فراخدل تھیں، اُنکے ساتھ ریسٹورنٹ میں گئی تھیں، اُنھوں نے خود سیر پر جانے کیلئے کہا تھا گو وہ خود شہر کے شور وغل سے دور جانا چاہتے تھے اب وہ شہر سے دور جا رہے تھے، مکانات پیچھے چھوٹ گئے تھے، اور اب ایک سُرمئی سڑک نظر آرہی تھی، جسکے ساتھ سمندر کا نیلا پانی ٹکرا رہا تھا۔ سڑک بالکل ویران دکھائی دیتی تھی، گوپال نے کار کی رفتار کو کم کر دیا۔ اب ایک چھوٹا سا میدان آگیا جہاں پر ناریل کے درخت استادہ تھے، گوپال نے کار کو ناریل کے درختوں کے قریب پارک کر دیا۔

قریب ہی جھونپڑی سے دو عورتیں نکلیں اور اُنکی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگیں، جیسے کہہ رہی ہوں "تم کتنے خوش قسمت ہو تمھارے پاس ایک کار بھی ہے تمھارے چہروں سے صاف عیاں ہے کہ تم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا ہے، اور ادھر ہم ہیں کہ صرف ناریل کا پانی پیتے ہیں، اور اَن گنت سمندر کی لہروں کو دیکھتے ہیں، اور زندگی بے جان اور بے کیف ہوتی جا رہی ہے اور تم لوگ ہماری بالکل پروا نہیں کرتے۔"

گوپال اور سریندر نے ان عورتوں کو نظر انداز کر دیا کیونکہ انکے پہلو میں اتنی جاذبِ نظر چیزیں تھیں، کہ وہ دوسری طرف دیکھنا گناہ سمجھتے تھے، سریندر نے کٹی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور کہنے لگا "تمھاری قسمت بتاؤں"۔

"ہاں بتاؤ"۔

"تم زندگی میں کبھی شادی نہ کروگی"۔

کٹی نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور کہنے لگی "بس اور کچھ نہیں"۔
"اور ہاں تمھارے دل کی لکیر یہ صاف بتاتی ہے۔ کہ تم نہایت ہی اچھی لڑکی ہو لیکن "
"لیکن کیا ؟"
"حالات کچھ ایسے ہیں، کہ تمھیں اس قسم کی شرارتیں کرنی پڑتی ہیں"۔
"اچھا یہ بتاؤ۔ کہ میرے کتنے بچے ہونگے" کٹی نے دانتوں کے درمیان زبان ہلاتے ہوئے کہا۔
"ایک بھی نہیں"۔
"ہوں"
"جی"
"اور پھر تم ایک شخص سے محبت کروگی۔ جو تم سے انتہائی محبت کرے گا"۔
کٹی نے ایک ہلکی سی چپت اُسکے مُنھ پر لگائی۔ اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔
اب سریندر نے لمٹی کا ہاتھ دیکھنا شروع کیا۔ "دیکھو تمھارے ہاتھ سے صاف ظاہر ہے کہ تم باتیں کم کرتی ہو، اور مُسکراتی زیادہ ہو، اور جو کچھ تمھارا دل کہتا ہے وہ تم نہیں کرتیں بلکہ جو کچھ کٹی کہتی ہے وہ کرتی ہو۔ تم زندگی میں تین شادیاں کروگی اور تمھارے گیارہ بچے ہونگے"۔
یہ سُنکر لمٹی ہنس پڑی۔ اور کہنے لگی "شٹ اَپ"۔
گوپال نے لمٹی کو ستانا شروع کیا لیکن لمٹی نے اُسے صاف کہدیا۔ کہ وہ اس قسم کی حرکتیں نہ کرے چند لمحوں تک ناریل کے درختوں کے قریب ٹہلتے رہے،

سورج، دور سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ اور اس کی خونیں کرنیں سمندر کو سُرخ کر رہی تھیں، ناریل کے درخت آکاش کی طرف دیکھ رہے تھے، اور ہوا خوشی سے جھومتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، اور سریندر کٹی کے قریب سے اپنے آپکو محظوظ کر رہا تھا۔ زندگی کتنی دلکش ہے۔ اس نے سوچا۔ اگر ایک حسین عورت پہلو میں ہو، تو جی چاہتا ہے، کہ زندگی اُسکے پہلو میں بیٹھکر گذار دی جائے۔ کچھ عرصے کے بعد کٹی اُسکے قریب سے اُٹھ کر گوپال کے پاس چلی گئی۔ سریندر سوچنے لگا۔ کہ زندگی اتنی یاس انگیز نہیں زندگی اتنی مصنوعی نہیں، اتنی بے کیف نہیں، اور وہ لمٹی کی طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ لمٹی کی آنکھوں میں معصومیت کی جھلک تھی، اُسکے لبوں کے کونوں پر ایک دلفریب مُسکراہٹ ناچ رہی تھی، بالکل اُسی طرح جسطرح سورج کی الوداعی کرنیں سمندر کی سطح پر ناچ رہی تھیں،

اتنے میں گوپال نے سریندر سے پوچھا۔

"تمھارے پاس کچھ روپے ہیں؟"

"کون مانگتا ہے؟"

"کٹی"

"کتنے روپے؟"

"صرف دس روپے۔ وہ کہتی ہے، کل واپس کر دوں گی"

سریندر نے دس روپے دیدیئے، اُسکے پاس کُل پندرہ روپے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں، اُس نے سوچا۔ ابھی تک اُسکی جیب میں پانچ روپے ہیں، اُس کی نگاہوں میں لمحہ بھر کیلئے مایوسی چھا گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے موسم بہار میں

کٹی نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور کہنے لگی "بس اور کچھ نہیں"۔

"اور ہاں تمھارے دل کی لکیر یہ صاف بتاتی ہے۔ کہ تم نہایت ہی اچھی لڑکی ہو لیکن "

"لیکن کیا ؟"

"حالات کچھ ایسے ہیں، کہ تمھیں اس قسم کی شرارتیں کرنی پڑتی ہیں"۔

"اچھا یہ بتاؤ۔ کہ میرے کتنے بچے ہونگے"۔ کٹی نے دانتوں کے درمیان زبان ہلاتے ہوئے کہا۔

"ایک بھی نہیں"۔

"ہوں"

"جی"

"اور پھر تم ایک شخص سے محبت کروگی۔ جو تم سے انتہائی محبت کرے گا"۔

کٹی نے ایک ہلکی سی چپت اُسکے مُنھ پر لگائی۔ اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

اب سریندر نے لمٹی کا ہاتھ دیکھنا شروع کیا۔ "دیکھو۔ تمھارے ہاتھ سے صاف ظاہر ہے کہ تم باتیں کم کرتی ہو، اور مُسکراتی زیادہ ہو، اور جو کچھ تمھارا دل کہتا ہے وہ تم نہیں کرتیں بلکہ جو کچھ کٹی کہتی ہے وہ کرتی ہو۔ تم زندگی میں تین شادیاں کروگی اور تمھارے گیارہ بچے ہونگے"۔

یہ سُنکر لمٹی ہنس پڑی۔ اور کہنے لگی "شٹ اَپ"۔

گوپال نے لمٹی کو ستانا شروع کیا لیکن لمٹی نے اُسے صاف کہدیا۔ کہ وہ اس قسم کی حرکتیں نہ کرے چند لمحوں تک ناریل کے درختوں کے قریب ٹہلتے رہے،

سورج، دور سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ اور اس کی خونیں کرنیں سمندر کو سُرخ کر رہی تھیں، ناریل کے درخت آکاش کی طرف دیکھ رہے تھے، اور ہوا، خوشی سے جھومتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، اور سریندر کٹی کے قرب سے اپنے آپکو محظوظ کر رہا تھا۔ زندگی کتنی دلکش ہے۔ اس نے سوچا۔ اگر ایک حسین عورت پہلو میں ہو، تو جی چاہتا ہے کہ زندگی اُسکے پہلو میں بیٹھکر گذار دی جائے۔ کچھ عرصے کے بعد کٹی اُسکے قریب سے اُٹھکر گوپال کے پاس چلی گئی۔ سریندر سوچنے لگا۔ کہ زندگی اتنی یاس انگیز نہیں زندگی اتنی مصنوعی نہیں، اتنی بے کیف نہیں، اور وہ لمٹی کی طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ لمٹی کی آنکھوں میں معصومیت کی جھلک تھی، اُسکے لبوں کے کونوں پر ایک دلفریب مُسکراہٹ ناچ رہی تھی، بالکل اُسی طرح جسطرح سورج کی الوداعی کرنیں سمندر کی سطح پر ناچ رہی تھیں،

اتنے میں گوپال نے سریندر سے پوچھا۔

"تمھارے پاس کچھ روپے ہیں؟"

"کون مانگتا ہے؟"

"کٹی"

"کتنے روپے؟"

"صرف دس روپے۔ وہ کہتی ہے، کل واپس کردوں گی"

سریندر نے دس روپے دیدیئے، اُسکے پاس کُل پندرہ روپے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں، اُس نے سوچا۔ ابھی تک اُسکی جیب میں پانچ روپے ہیں۔ اُس کی نگاہوں میں لمحہ بھر کیلئے مایوسی چھا گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے موسم بہار میں

خزاں کا جھونکا آیا ہو لیکن دوسرے لمحے میں کٹی اُسکے قریب کھڑی ہوگئی اور اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر دیکھنے لگی۔

"کمبخت لڑکی کتنی حسین ہے"۔ اُس نے سوچا۔

"دیکھو جی، اب دیر ہو رہی ہے، ڈیڈی میرا انتظار کر رہا ہوگا آج ماما ضرور پٹے گی" دونوں ایکدوسرے کی طرف دیکھکر مُسکرانے لگیں اور چپکے سے کار میں بیٹھ گئیں کٹی نے سریندر کی فیلٹ لے لی، اور اپنے سر پر رکھ لی، اور کہنے لگی "میں کیسی دکھائی دیتی ہوں؟"

"بہت ہی خوبصورت" سریندر نے مُسکرا کر کہا۔

اور وہ خوشی سے جھومنے لگی۔ اور گوپال نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ سریندر نے اپنا ہاتھ کٹی کے زانو پر رکھا۔ ایک لمحہ ہاتھ وہاں رہا۔ دوسرے لمحے میں کٹی نے اُسکا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور اُسکی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگی، وہ گھبرا کر ایکطرف سرک گیا

اب اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ سڑک پر بجلی کے قمقمے روشن ہو چکے تھے ہوا میں نمی اور ٹھنڈک زیادہ ہوتی جا رہی تھی، اور فیکٹریوں کا دھواں گرد و پیش چھایا ہوا تھا، وہ حیران تھا، کہ کیا کرے، کیا کہے، نہ وہ آگے جا سکتا تھا، نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا

"یہ عجیب سی لڑکی ہے"۔ اُس نے سوچا ہنستی ہے مُسکراتی ہے، دوسروں کے ساتھ اکیلی سیر کرنے جاتی ہے، ہوٹل میں کھانا کھاتی ہے لیکن جسم کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتی، اُسکی نگاہوں میں شرارت ہے، آنکھوں میں خمار ہے، چال میں نزاکت ہے، بالوں میں شباب کی خوشبو ہے کتنی پیاری ہے یہ لڑکی، کتنا دلفریب ہے اُسکا حُسن کتنی تازگی اور لذت ہے، اُسکی آواز میں کتنی بیباکانہ ہیں، اُسکی باتیں، اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کار ایک

جگہ پر آکر رُک گئی۔
دونوں لڑکیاں کار سے اُتریں۔
"اب کب ملوگی؟"
"جب کہو" کٹی نے فوراً جواب دیا۔
"کل تین بجے کوئی فلم دیکھیں گے اسی جگہ پر آنا"۔
دونوں نے سر ہلایا اور نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔

(۲)

اُس رات سریندر بالکل سو نہ سکا۔ وہ سونے کی کوشش کرتا مگر کٹی کی لکدش تصویر اُسکی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتی، کٹی کی ہنسی اُسکی مُسکراہٹ، اُسکی باتیں بار بار اُسکے کانوں سے ٹکراتیں، کٹی کے ملائم جسم کا لمس بار بار اُسکے ذہن میں تھرکتا، وہ اکیلا سو رہا تھا، چاروں طرف اندھیرا تھا لیکن اس اندھیرے میں . . . زندگی تھی۔ شباب تھا، ایک عجیب قسم کی خوشی کا احساس تھا۔ ایک لڑکی کے قرب نے اُس کی سوئی ہوئی زندگی میں، حرکت پیدا کر دی تھی، لڑکی حسین نہ ہوتی، تو شاید سریندر چپکے سے سو جاتا، لیکن لڑکی کی جسمانی دلکشی، اور اسکا شوخ حُسن، اُسے رہ رہ کر یاد آتا۔ کٹی کی شرارتیں اُسکی مُسکراہٹ اُسکی باتیں، اُسکا مذاق اُسکی ہر حرکت اُسکی آنکھوں کے سامنے بار بار آرہی تھی، اور وہ بستر پر اکیلا تھا، چاروں طرف اندھیرا تھا، اور وہ سوچ رہا تھا، اگر وہ لڑکی، اُسکے پاس ہوتی، تو آج وہ کتنا خوش ہوتا۔ اس سے زیادہ خوش ہوتا، وہ خوشی، وہ لذت، وہ انبساط، وہ راحت جس سے وہ آجتک محروم تھا، اُسے ضرور ملتی، وہ اس لڑکی کو کبھی نہیں بھول سکتا، یہ لڑکی اب اُسکی ہو کر رہیگی، یہ لڑکی اب

شی اور کی نہیں ہوسکتی، اور اُسکے ذہن میں بار بار یہ الفاظ گونجنے لگے "یہ لڑکی میری ہے"
اگر دن بھر کی واردات میں اُسے کسی بات کا افسوس تھا۔ تو صرف دس روپوں کا۔
اگر وہ امیر ہوتا، تو دس روپے کیا، سو روپے تک دیدیتا۔ لیکن سریندر کی آمدنی بہت
قلیل تھی، وہ جتنے روپے کماتا تھا، اُس سے صرف اُسکے کھانے پینے یا مکان کے
کرایے کا انتظام ہوسکتا تھا اکثر مہینے کے آخر میں اُسے قرض لینا پڑتا تھا۔ یہ روپے
جو اُسکے پاس تھے اُسے ہوٹل والے کو دینے تھے۔ اور ہاں، کٹی تو اس سے دس
روپے مانگ کر لے گئی ہے، وہ ضرور دس روپے واپس کردیگی، خیر، اگر وہ واپس
نہ بھی کرے، تب بھی کوئی بات نہیں۔ دس روپوں کی حقیقت کیا ہے، وہ آج سے
جی لگا کر محنت کریگا، خوب روپے کمائے گا، اور اگر کٹی نے اُس سے روپے مانگے
تو ضرور اُسے اور روپے دیگا۔ وہ کٹی کو کسی حالت میں بھی چھوڑ نہیں سکتا،
نہیں چھوڑ سکتا، یہ سوچتے سوچتے اُسے نیند آگئی،

جب صبح ہوئی، تو اُس نے نئے بلیڈ سے حجامت کی، ایک نیا سوٹ
نکالا، اور پہنکر گوپال کے گھر گیا، گوپال اُسکا انتظار کر رہا تھا۔

"کیوں رات کیسے کٹی؟" گوپال نے پوچھا۔

"بالکل نیند نہیں آئی"۔

"اور تم؟"

"سونے کی بہت کوشش کی لیکن سو نہ سکا، لڑکیاں شریف گھرانے
کی دکھائی دیتی ہیں"۔

"میرا بھی یہی خیال ہے"۔

"اب زندگی اچھی کٹ جائے گی۔"

"میاں لطف آجائیگا، لیکن یہ تو بتاؤ، کہ کل کتنا خرچ ہوا۔"

"کل تیس روپے خرچ ہوئے۔"

"وہ کیسے؟"

"دس روپے کٹی کو دیئے، دس روپے ہوٹل والے کو، اور دس روپے کا پٹرول خرچ ہوا لیکن سرسندر مال خوب ہے، خدا کی قسم، اس سے بہتر لڑکی ساری بمبئی میں نہیں مل سکتی، دیکھ لو، جب خدا دیتا ہے، تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے، کٹی تمھاری ہے اور لیٹی میری، ٹھیک ہے نا؟"

"سولہ آنے درست۔"

"اور آج کا پروگرام؟"

"فلم دیکھیں گے۔"

سرسندر نے سر ہلا دیا۔

"اور ہاں، روپوں کا انتظام کر لینا۔"

"کتنے روپوں کا انتظام کروں؟"

"فلم دیکھینگے، ہوٹل میں کھانا کھائینگے، خود ہی حساب لگا لو۔"

"دیکھو جی، آپس میں شرم کی کوئی بات نہیں، آدھے روپے تمھارے اور آدھے میرے۔"

"اب تو ایسا ہی کرنا پڑیگا۔"

"اچھا میں نہالوں۔"

اور اسی طرح دوپہر ہوگئی، گوپال اور سرسندر نے ہوٹل میں کھانا کھایا،

اور دادر سرکل پہنچ گئے۔

دونوں لڑکیاں وقت مقررہ پر پہنچ گئی تھیں آج کٹی نے آسمانی رنگ کا فراک پہنا ہوا تھا، اور کمبخت لمٹی نے سیاہ رنگ کا فراک، سیاہ رنگ کا فراک اُسکے سفید جسم پر خوب سجتا تھا کٹی نے سرینڈر کو دیکھا۔ سرینڈر نے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا، دونوں چپکے سے کار میں بیٹھ گئیں۔

"کہاں چلیں"؟

"جہاں تمھاری مرضی"۔ کٹی نے کہا۔

"پکچر دیکھوگی؟"

کٹی نے مُسکرا کر سر ہلا دیا۔

اور وہ سب ایک پکچر ہاؤس میں پہنچ گئے۔ چار ٹکٹ خرید لئے گئے، پکچر شروع ہونے سے پہلے وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"کوئی دیکھ نہ لے" کٹی نے کہا

"کیا دیکھ لیگا؟" سرینڈر نے کرخت لہجے میں کہا۔

"ارے یہ پارسی"

"تو پھر کیا ہوگا؟"

"اگر انھوں نے ہمیں تمھارے ساتھ باتیں کرتے یا ہنستے ہنساتے دیکھ لیا تو ہمارا سوشل بائیکاٹ کر دینگے، ہمیں اجازت نہیں ہے کہ ہم کسی غیر پارسی کے ساتھ گلچھرّے اُڑائیں"۔

یہ سنتے ہی سرینڈر کچھ خاموش سا ہوگیا، جیسے چھاتی پر ایک سل رکھدی گئی ہو

یہ ہندو مسلم کی تفریق، یہ پارسی اور غیر پارسی کی تفریق، یہ ہندو اور ہریجن کی تفریق یہ کالے اور گورے کی تفریق، یہ یہودی اور غیر یہودی کی تفریق، کسطرح انسانیت کا خاتمہ کر رہی ہے، ہر نسل میں ایک زہر بھر رہی ہے، اور انسانوں کی زندگیوں کو تلخ سے تلخ تر بنا رہی ہے، وہ یہ سوچ ہی رہا تھا، کہ کچھ شروع ہو گئی۔ در اصل وہ پھر دیکھنے نہ آیا تھا۔ وہ صرف کٹی سے باتیں کرنا چاہتا تھا، اُسکی مسکراہٹ سے محظوظ ہونا چاہتا تھا، اُسکی شرارتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ کٹی کو اپنی باہوں میں بھینچ لے۔ اُسکے جسم کو سر سے لیکر پاؤں تک چُومے، اُسکی سپید سپید رانوں پر ہاتھ پھیرے۔ وقت گذر رہا تھا، اور وہ سوچ رہا تھا۔ وہ ہچکچا رہا تھا۔ کہ کیا کرے، کسطرح کٹی سے کہے، کہ وہ اُسے چھُونے کیلئے بیقرار ہو رہا ہے، اُس نے چُپکے سے اپنا ہاتھ اُسکی ننگی ران پر رکھدیا۔

کٹی نے اُسکا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ ڈر گیا کہیں کٹی اُس سے ناراض نہ ہو جائے پھر وہ اُس سے باتیں بھی نہ کر سکے گا۔

وہ خاموش ہو گیا، صرف ایک لمحے کیلئے، ہاتھ پھر بڑھا۔

کٹی نے اب کے ہاتھ پھر زور سے جھٹک دیا۔

وہ پھر خاموش ہو گیا۔

وقت گذر رہا تھا، کچھ جلد ہی ختم ہو جائیگی۔ یہ اندھیرا کتنک رہیگا، یہ اندھیرا کتنک رہیگا، یہ میٹھا، یہ گداز اندھیرا، وہ کیا کرے، وہ کسطرح اپنی سسکتی ہوئی روح کو تسکین دے، وہ کسطرح اس اندھی خواہش کی تکمیل کرے وہ کس طرح اس جنونی کیفیت کو ٹھنڈا کرے، وہ سوچ رہا تھا لیکن اُسکے ذہن میں کچھ نہ آتا تھا

یکایک اُسے شرارت سُوجھی۔

"کٹی؟"

کٹی نے اُسکی طرف دیکھا۔

"ذرا ادھر جُھکو"

وہ ذرا جُھکی

"ذرا اور۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"

کٹی نے اپنا سر اُسکے قریب اور جُھکا دیا۔ اب کٹی کا چہرہ بالکل اُسکے قریب تھا، اُس نے چُپکے سے اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ اُسکے گالوں پر رکھدئے کٹی فوراً سرک گئی۔ اور زور کی چپت اُسکے مُنہ پر ماری۔

سرنید رشرم سے پانی پانی ہوگیا۔ اُسے اپنی اس بیہودہ حرکت پر بہت غصہ آیا کٹی کوئی طوائف نہ تھی، اُس نے اس قسم کی حرکت کیوں کی، وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی، وہ صرف اُسے ایک دوست سمجھ کر ساتھ آئی تھی، واقعی اُسے بات کرنے کی تمیز نہ تھی، یہ کہاں کی شرافت ہے، یہ کہاں کی تہذیب ہے کہ ایک لڑکی کیساتھ آپ سینما دیکھنے آئیں، اور اُسکی مرضی کے بغیر اُسکا مُنہ چُوم لیں یہ واقعی بیہودہ حرکت ہے، اُسے اس قسم کی حرکت نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ وہ رنجیدہ سا ہوگیا اور ایک طرف کو سرک گیا۔

کٹی نے اُسکی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔

"ناراض ہوگئے؟"

وہ پھر خاموش ہوگیا۔

"اچھا، اپنا چہرہ ادھر کرو۔"
اُس نے دائیں گال اُسکی طرف کر دیا۔
"ذرا اور . . . ."
وہ ذرا اور جُھکا . . .
اب کٹی کے گال اُسکے قریب تھے، کٹی کا گرم سانس اُسکے لبوں کو چوم رہا تھا
اُسنے زور سے ایک پھونک ماری اور سکراپڑی اور کہنے لگی۔
"I love you"
"کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟"۔
اور سریندر نے سر ہلا دیا۔
"تب تم مجھے چُوم سکتے ہو"
اور سریندر نے اپنے تپتے ہوئے ہونٹ کٹی کے نرم اور گرم گالوں پر رکھ دیئے
اس بوسے نے اُسکے جسم میں ارتعاش پیدا کر دیا، اُسکے جسم میں خوشی کی ایک لہر
دوڑ گئی، یکایک اُس نے محسوس کیا، کہ کٹی کتنی اچھی لڑکی ہے، وہ اُس سے محبت
کرتی ہے، وہ واقعی اُس سے محبت کرتی ہے، سریندر ہر شخص کو یہ بتانا چاہتا تھا
کہ یہ لڑکی اُس سے محبت کرتی ہے، کٹی واقعی اچھی لڑکی ہے، وہ اس سے پیار
کرتی ہے۔ اب وہ دونوں اکٹھے رہینگے، اگر اکٹھے نہ رہینگے تو کم از کم ہر روز ملا
کرینگے، کٹی صرف اچھی ہی نہیں، اچھی تو بہت سی لڑکیاں ہوتی ہیں، وہ خوبصورت
بھی ہے حسین بھی ہے، وہ باتیں کر سکتی ہے، اور جب وہ دو ٹوٹے ہوئے دانتوں کے
بیچ سے زبان کی نوک نکالتی ہے، تو اُسوقت کتنی شوخ اور بیباک دکھائی دیتی ہے

آج وہ خوش تھا، بیحد خوش تھا، اگر اُسکے بس کی بات ہوتی، تو وہ کٹی کو ملکہ بنا دیتا، لیکن وہ خود قلاش تھا، اور صرف محنت کر کے اپنا پیٹ پال سکتا تھا، یہی سوچتے سوچتے دو گھنٹے گذر گئے لیکن اس دوران میں سرسیندر یکچر نہ دیکھ سکا، اُسکی نگاہیں کٹی کی طرف تھیں، اُسکے ہاتھ کٹی کیطرف بار بار جاتے، وہ کٹی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا، اور دبانے لگتا، کبھی وہ کٹی کے بالوں کو چھیڑنے لگتا، کبھی وہ کٹی کی رانوں پر ہاتھ رکھتا، کبھی وہ کٹی کے کانوں کو پیار سے کھینچتا، اور اسی نوک جھونک میں فلم ختم ہوگئی۔ وہ کار میں بیٹھکر ایک ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ گوپال کچھ رنجیدہ خاطر نظر آتا تھا، ایسا دکھائی پڑتا تھا، کہ لمٹی کا رویہ اُسکے ساتھ اچھا نہیں رہا۔ کار میں بیٹھ کر گوپال نے سرسیندر کو بتایا، کہ لمٹی نے اُسے ہاتھ تک نہیں لگانے دیا، ایکبار گوپال نے لمٹی کو چومنے کی کوشش کی لیکن لمٹی نے گوپال کی اس حرکت پر بہت بُرا بھلا کہا۔ "سمجھتی ہیں کچھ نہیں آتا یہ لڑکیاں کس قسم کی ہیں، اور کیا چاہتی ہیں، کمبخت ہاتھ تک تو لگانے نہیں دیتیں" اور سرسیندر نے دھیرے سے کہا "میاں صبر کرو صبر کرو"۔

اور پھر چاروں نے ہوٹل میں چائے پی، ٹوسٹ کھائے، کٹی نے نہایت پیار سے سرسیندر کو ٹوسٹ کھلائے، وہ اُسکی طرف دیکھ کر مُسکراتی رہی کبھی کبھی اپنی چھوٹی سی پتلی زبان لبوں سے نکالکر سرسیندر کو چڑاتی کبھی چائے کا پیالہ چھین کر اُسے چائے پلانے لگتی، اور کبھی کبھی یونہی ہنسنے لگتی لمٹی اکثر خاموش رہتی، وہ کم باتیں کرتی، دراصل لمٹی پر کٹی کی شخصیت کا بہت اثر تھا لمٹی کو معلوم تھا۔ کہ وہ کٹی سے زیادہ حسین نہیں ہے زیادہ چالاک نہیں ہے، اگر لوگ لمٹی کو گوارہ کرتے تھے، تو محض کٹی کی وجہ سے لیکن

گوپال لمٹی کو پاکر بھی خوش تھا لمٹی اُسکی طرف دیکھ کر مُسکراتی ہنستی لیکن اس ہنسی خوشی میں ایک طنز تھا جیسے وہ گوپال کو بدصورت سمجھتی ہے، اور یہ بات گوپال کیلئے ناقابل برداشت تھی، زندگی میں بہت سی ایسی باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، جو انسان برداشت کرنا نہیں چاہتا لیکن وقت کی ضرورت ان باتوں کو سہنے پر مجبور کرتی ہے، چائے پینے کے بعد وہ سب کار میں بیٹھ گئے، آج ہوٹل کا بل ضرورت سے زیادہ تھا، سرینیدر کی رہی سہی پونجی ہوٹل کی نذر ہوگئی۔ اور اُسکی جیب بالکل خالی ہوگئی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کچھ اُداس سا ہوگیا۔

کٹی نے اُسکے مُنھ پر ہلکی سی چپت لگائی، اور کہنے لگی "تم کچھ اُداس نظر آتے ہو"

"نہیں تو"

"اب کدھر کا ارادہ ہے؟"

"تم کہاں جانا چاہتی ہو؟"

"ہم تو گھر جانا چاہتے ہیں، ڈیڈی اور ماما انتظار کر رہے ہونگے"۔

ڈیڈی اور ماما، سرینیدر نے یہ دو الفاظ پھر دوہرائے، ڈیڈی اور ماما، یہ دونوں عجیب ڈیڈی اور ماما ہیں اُنکی لڑکیاں سر بازار غیروں کیساتھ پھرتی ہیں، گلچھرّے اُڑاتی ہیں، سیر کرتی ہیں لیکن انکی اماں اُن سے کچھ نہیں کہتی، یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں، خیر اسے ان باتوں سے کیا تعلق؟

اتنے میں گوپال اُسکے قریب آیا۔ اور کہنے لگا "کٹی روپے مانگتی ہے"

"روپے کیسے؟"

"وہ مانگ رہی ہے"

"لیکن کس بات کے ؟"

"مجھے کیا معلوم"۔

"میرے پاس تو ایک چھوٹی کوڑی بھی نہیں جتنے روپے تھے ہوٹل والے کو دیدیئے"

"اور جو میرے پاس تھے، وہ سینما میں خرچ ہو گئے کمبخت عجیب لڑکی ہے، مجھے تو لٹی نے ہاتھ تک نہیں لگانے دیا اور اسی چکر میں تقریباً ۷۰ — ۸۰ روپے خرچ ہو گئے، مجھے تو کچھ ایسی ویسی لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں"۔

کٹی پھر قریب آئی، اور مسکرا کر گوپال سے روپے مانگنے لگی۔

"روپے نہیں ہیں" سریندر نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں ہیں" کٹی نے غصے میں آکر کہا۔

"اسوقت روپے نہیں ہیں، نہیں ہیں، کل ضرور دینگے"۔

"مجھے آج ہی ضرورت ہے اسیوقت، اگر خالی ہاتھ واپس جاؤنگی تو ڈیڈی کیا کہیگی، ماما کیا کہے گی"

"اگر جیب میں روپے نہ ہوں، تو کہاں سے لاکر دوں ؟"

"تو پھر تم ہمیں یہاں کیوں لائے تھے ؟"

"تم اپنی مرضی سے آئی تھیں، ہم زبردستی پکڑ کر نہیں لائے تھے"۔

"زبردستی" کٹی نے شرر بار نگاہوں سے سریندر کیطرف دیکھا، اُسکے چہرے کے نقوش خلط ملط ہو گئے تھے، اُسکے خوبصورت ہونٹ بالکل سُکڑ گئے، چہرے کی ملائمیت جاتی رہی، آنکھوں کی شوخی شرارت بالکل مفقود ہو گئی اب وہ بالکل فارس روڈ کی رنڈی دکھائی دیتی تھی۔

"اگر روپے نہیں دوگے، تو میں شور مچاؤنگی میں ان لوگوں کو بتاؤنگی، کہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ بُرا کام کیا۔ اور اب یہ لوگ ہمیں روپے نہیں دیتے"

"روپے نہیں ہیں" سریندر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تمھیں دینے پڑیں گے" کٹی نے چیخکر کہا۔

"کس بات کے روپے" آخر کوئی وجہ بھی ہو۔

"تمنے آج کا دن ضائع کیا ہمیں کیا معلوم تھا کہ تم غنڈے ہو" کٹی نے چمک کر کہا

غنڈے کا لفظ سنتے ہی، سریندر کا ہونٹ دانتوں کے نیچے اکر کٹ گیا۔

یکایک سریندر کے دماغ میں خیال آیا، کہ اگر اس لڑکی نے ایک لفظ اور نکالا، تو وہ اُسکو جان سے مار دیگا۔ جرأت کہیں کی۔۔۔۔ "اس لڑکی میں کتنا زہر ہے، ناگن کی طرح ڈنگ مارتی ہے"

سریندر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، کٹی موقع کی نزاکت کو بھانپ گئی اور گالیاں بکتی ہوئی آگے نکل گئی۔

کٹی کے چلے جانیکے بعد سریندر کو احساس ہوا، کہ اُسکے ہرے بھرے کھیت میں آگ لگ گئی۔ بنا بنایا کھیل آن واحد میں گڑبڑ ہوگیا لیکن سریندر کا خون کھول رہا تھا وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا لیکن اُسکی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، وہ کٹی کے روپے کا جواز چاہتا تھا کٹی نے اسطرح کیوں behave کیا، وہ کٹی کی اس شخصیت سے بالکل بیخبر تھا وہ کبھی خیال بھی نہ کرسکتا تھا، کہ لڑکی اتنی بے غیرت ہوسکتی ہے، گلاب کی کلی میں اتنا زہر ہوسکتا ہے! وہ ابتک صرف اُس کٹی کو جانتا تھا، جو ہنستی تھی، مسکراتی تھی، جو خوبصورت تھی،

جسکے ریشمی بال تھے، جسکا جسم متناسب تھا جسکی آنکھوں میں شرارت تھی جسکی چال میں شباب تھا جسکی آواز میں شہد کی سی مٹھاس تھی لیکن آج کی کٹی بالکل مختلف تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ ایک فارس روڈ کی رنڈی ہے اُسکی باتوں میں زہر تھا، پھیکا ڈنک تھا آنکھوں سے وحشت ٹپکتی تھی، اُسکے لب اکڑ گئے تھے، چہرے پر کرختگی کے آثار تھے، اس شہد میں کتنی کڑواہٹ تھی، اس حسن میں کتنی گندگی تھی، اس آواز میں کتنی تلخی تھی اس جسم میں کتنی بُو تھی، یہ سب کچھ کیوں ہوا، وہ کیوں آن واحد میں بدل گئی، اور اس سے پہلے کٹی نے جو کچھ کہا تھا کیا وہ غلط تھا، کیا وہ جھوٹ تھا، فریب تھا، وہ محض دل لگی تھی، دکھلاوا تھا لیکن اس دکھلاوے میں ایک Tact تھا، ایک سلیقہ تھا، ایک ترتیب تھی، ایک تسلسل تھا، اتنے میں کار گھر کے قریب رُکی۔

"بہت ہی چالاک تھیں یہ لڑکیاں" گوپال نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔

"مجھے تو اس قسم کے سلوک کی ہرگز توقع نہ تھی" سریندر نے سر کو نیچا کر کے کہا۔

"بھائی سچ بات تو یہ ہے، کہ میں تو اُن سے ملنے سے رہا۔ ایک تو روپے ضائع کرو اور پھر گالیاں کھاؤ۔ آج سے میں اُنکے ساتھ گھومنے نہیں جاؤنگا۔ اچھا خدا حافظ" سریندر نے ہیٹ اُٹھایا اور چلدیا۔

سریندر رات بھر نہ سو سکا۔ اُسے رہ رہکر اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ دوبارہ ان سے کبھی نہ ملے، واقعی اُسے اُن لڑکیوں سے کبھی نہیں ملنا چاہیئے ان لڑکیوں نے اُسکی بے عزتی کی ہے، اُسکے مُنہ پر تھوکا ہے۔ اُسے اُلو بنانے کی کوشش کی ہے، بلکہ اُلو بنایا ہے اُسے اُن لڑکیوں سے کبھی نہیں ملنا چاہیئے لیکن دل کے دوسرے گوشے سے ایک

اور ہی آواز آرہی تھی، ایک اور ہی تصویر اُبھر رہی تھی، اُسکے نقوش سریندر کے دل کی سطح پر بہت گہرے پڑ گئے تھے، وہ نقش تھے، کٹی کے جو اُسکی طرف دیکھ کر مُسکرائی تھی جس نے اُسکے گالوں پر ہلکی سی چپت لگائی تھی جس نے سینما ہال میں بیٹھکر کہا تھا I love you جو اکثر چھوٹی سی پتلی زبان دانتوں کے درمیان سے نکالکر اُسے چڑاتی تھی، یہ تصویر رہ رہ کر اُسے یاد دلاتی تھی، سریندر جذباتی تھا، گوپال سے زیادہ ذہین اور حساس تھا، شاید اُسے عورت کے قرب کی زیادہ ضرورت تھی، شاید اُسے کٹی سے عشق سا ہو گیا تھا ــــ، عشق ــــ وہ ہنسنے لگا، جی ہاں، کتنا فرسودہ لفظ ہے، اب تو بالکل بے جان ہو کر رہ گیا ہے، اس مشینی دور میں عشق کرنا اپنا مذاق اُڑانا ہے نہیں بھائی عشق نہیں تھا، بلکہ وہ لڑکی کا جسم چاہتا تھا عجیب سی بات ہے، نہایت صاف سی بات ہے جی ہاں، سریندر کو کٹی سے عشق ہو گیا تھا، وہ چاہتا تھا کہ وہ کٹی کے قریب رہے، اُس سے باتیں کرے، اُس سے ہنسے، مذاق کرے، اور وہ مذاق کرتی رہے، اور کہتی رہے

نہیں، وہ کٹی کو نہیں جانے دیگا

وہ اُسے اوجھل نہیں ہونے دیگا، کٹی اسکی رُوح ہے، اُسکی جان ہے، اُسکی آبرو ہے، اُسکی عزت ہے، اُسکی راحت ہے، اُسکی خوشی ہے، وہ کٹی کو پکڑ سکتا ہے، اُسے اپنے پاس رکھ سکتا ہے لیکن کس طرح، اُس نے سوچنا چاہا۔ اور بار بار یہی جواب ملا۔ کہ وہ قلاش ہے، غریب ہے، وہ ہر روز ۲۰ یا ۳۰ روپے کٹی پر صرف نہیں کر سکتا لیکن وہ کٹی کو چاہتا ہے، وہ روپے ضرور حاصل کریگا، وہ لوگوں سے مانگیگا، دوستوں کے آگے ہاتھ پھیلائیگا، وہ دن رات کام کریگا، وہ ہر مالدار شخص کے آگے اپنی ناک رگڑیگا، اور اگر وہ کہیں سے روپے نہ کما سکا، تو وہ چوری کریگا، ڈاکہ ڈالیگا، لیکن کٹی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیگا

جب وہ صبح اُٹھا، تو دل کا غبار کچھ ہلکا پڑ گیا تھا۔ عشق کی جگہ خودداری نے لے لی تھی، اور اُسکے دل میں یہ خیال آرہا تھا، کہ اُسے دوبارہ کٹی سے نہیں ملنا چاہیئے، اور وہ مل بھی نہیں سکتا، اُسکے روپے نہیں، وہ چوری نہیں کریگا، لیکن وہ دوستوں سے روپے ضرور مانگیگا، وہ زیادہ کام کر سکتا ہے، اور اسطرح سے وہ کافی روپے کما سکیگا لیکن اب کٹی اُس سے بات نہ کریگی، بھلا وہ کیوں اس سے ملیگی، وہ اس سے بالکل ناراض ہوگئی ہے یہ سوچتے سوچتے وہ خداداد سرکل کی طرف روانہ ہوگیا۔

اُسدن وہ خداداد سرکل میں نہ آئیں، وہ ہر روز اس سرکل کے قریب جاتا، لیکن مایوس واپس لوٹتا، کمرے میں بیٹھ کر وہ اپنے آپکو کوسنے لگتا۔ اور خاصکر اس ماحول کو جسمیں وہ رہتا تھا، کاش اُسکے پاس روپے ہوتے، یا کوئی ایسا کام کر سکتا۔ جس سے اُسکی جیب میں سَو سَو کے نوٹ ہوتے، وہ نوٹ لیکر کٹی کے پاس جاتا، اور اُسکے مُنہ پر مارتا، اور کہتا "یہ لو۔ نوٹ، اگر تمھیں ان سے محبت ہے، تو یہ لو، ایک نہیں دس نوٹ، دس نہیں سَو سَو کے نوٹ، انکو لیجاؤ، اپنی ڈیڈی اور ممی کو دو، اور اسکے بعد کبھی مجھ سے نہ ملنا۔" یہ سوچتے سوچتے اُسے اپنے آپ پر غصہ آجاتا۔ اس سسٹم پر غصہ آجاتا۔ اس زندگی پر غصہ آجاتا، ان نامراد لڑکیوں پر غصہ آتا۔ اس طرح وہ اپنی زندگی میں زہر بھرتا رہا۔ آخر وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا کبھی کبھی اپنے آپکو گالی بھی دینے لگتا، ارے کمبخت، تو کٹی کو دس روپے نہ دے سکا۔ شاید اُسکی ڈیڈی یا ماما کو ضرورت ہو، اگر وہ کسی دوست سے مانگ کر اُسے روپے دیتا۔ تو کٹی اس سے کبھی ناراض نہ ہوتی، خیر کوئی بات نہیں، وہ ضرور اُسے منائیگا۔ وہ اُسے روپے دیگا۔ اور بہت سے روپے دیگا۔

ایکدن کٹی اُسے خداداد سرکل میں مل گئی۔

کٹی نے اُسکی طرف دیکھا۔
سریندر نے کٹی کو دیکھا۔
کٹی مُسکرا پڑی ـــ اور اُس نے اپنی زبان دو ٹوٹے ہوئے دانتوں کے درمیان سے نکالی۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"ہیلو"
"ہیلو"
کٹی لمٹی۔ اور وہ ایک ہوٹل میں چلے گئے ـــ اس دوران میں وہ گذری ہوئی باتیں بھول گئے، اب زندگی پھر خوشگوار ہو رہی تھی، اب پھر اُسکی زندگی میں آگ تھی، لبوں پر پھر مُسکراہٹ تھی، وہ تینوں گرم چائے پی رہے تھے اور زندگی خوشگوار ہوتی جا رہی تھی لمٹی نے گوپال کے متعلق پوچھا۔ اور سریندر نے کیہکر ٹال دیا، کہ وہ کئی دنوں سے گوپال سے ملا نہیں۔
سریندر نے ہوٹل کا بل ادا کیا، اور لمٹی نے اُسے پکچر دکھانے کیلئے کہا۔ اور وہ مان گیا۔ پکچر شروع ہو گئی۔
کٹی اُس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، وہی کٹی جس کی تلاش میں راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی، جس کی یاد میں وہ اکثر رو چکا تھا۔ جس کو پانے کے لئے وہ چوری تک کرنے کو تیار تھا، جس کو حاصل کرنے کیلئے وہ دوستوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے لئے تیار تھا، جس کے لئے وہ مالدار آدمیوں کے سامنے اپنا ذہن تک بیچنے کے لئے تیار تھا۔ وہ آج اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی، کٹی نے فراک پہنا ہوا تھا، کٹی اس طرح ہنس رہی تھی کھیل رہی تھی مُسکرا رہی

تھی اُسکے ہاتھ کو دبا رہی تھی، اُسکا گرم سانس اُسکے گالوں سے مس ہو رہا تھا۔ وہ خوش تھا، آج وہ بیحد خوش تھا، ایک عرصے کے بعد کٹی اُسے ملی تھی، وہ کٹی کو پالیگا۔ وہ کٹی سے شادی کریگا، وہ کٹی کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا، کٹی صرف اُسکی ہے۔ صرف اُسکی ہے، وہ کٹی کو بہت رُپے دیگا، وہ دن رات محنت کرے گا۔ کٹی خوبصورت ہے، بہت ہی خوبصورت ہے، کٹی جوان ہے، بہت ہی جوان ہے۔ وہ کٹی کو راہ راست پر لے آئیگا اگر کٹی میں کچھ خامیاں ہیں تو وہ انھیں دور کرنے میں کٹی کی مدد کریگا۔ کٹی کو آج تک کوئی اچھا انسان نہیں ملا، اُسے شریفوں کی محفل میں بیٹھنے کا موقعہ نہیں ملا، اس لئے اُس کی شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی ہے، اسی لئے اُس کی تصویر کے دو رُخ ہیں، اگر ایک رُخ اچھا ہے تو دوسرا بہت ہی بُرا، اگر ایک سے پیار ہے، تو دوسرے سے نفرت، وہ اچھے رُخ کو اُبھارے گا۔ وہ کٹی کی زندگی کو بہتر بنائے گا، وہ کٹی کو بتائے گا، کہ تمھاری ایک اچھی شخصیت بھی ہے۔ اس شخصیت سے کٹی بیگانہ ہے، اسے اس شخصیت کا کچھ علم نہیں خیر اُسے اس وقت کچھ نہیں سوچنا چاہیئے، آہستہ آہستہ کٹی کا ہاتھ اُس کے سینے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ کیا چاہتی ہے،

کٹی کا ہاتھ سریندر کے کوٹ کی اندرونی جیب میں چلا گیا۔

کٹی نے اس کا بٹوا نکال لیا۔

وہ خاموش رہا

کٹی نے بٹوے میں سے روپے نکال لئے۔

وہ اور خاموش ہوگیا۔
کٹی نے سب نوٹ اپنی جیب میں رکھ لئے،
وہ بالکل خاموش ہوگیا،
کٹی نے change بھی اپنی جیب میں رکھ لیا؛
وہ خاموش بیٹھا رہا۔
کٹی نے خالی بٹوہ اُسکی جیب میں رکھ دیا،
اور وہ خاموش بیٹھا رہا، اُس نے کچھ نہیں کہا، کیچر ختم ہوگئی؛ اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے، کٹی نے اجازت مانگی، اور اُس نے سر ہلا دیا، اور وہ دونوں اُسکی نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں،

اُس کے بٹوے میں صرف تین روپے اور کچھ آنے تھے، وہ سب کٹی نے نکال لئے، اُس کے پاس بس کے لئے کرایہ بھی نہ تھا۔ اور وہ سڑک پر پیدل چلتا رہا، اُسکے قریب سے لوگ گذر رہے تھے، لیکن اُسے کسی کی موجودگی کا احساس نہ تھا، وہ صرف آج کے حادثے پر غور کر رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا، کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، وہ سوچ رہا تھا کہ اچھی بھلی لڑکیاں آن واحد میں کس طرح طوائف کا روپ دھارن کر لیتی ہے، وہ سوچ رہا تھا، اور لوگ چلے جا رہے تھے، آگے بڑھ رہے تھے، پیچھے ہٹ رہے تھے، وہ سوچ رہا تھا، لیکن زندگی افسردہ اور بے کیف ہوتی جا رہی تھی؛ وہ سوچ رہا تھا، اور کٹی دُور جا چکی تھی، بہت دور جا چکی تھی، وہ سوچ رہا تھا

کہ یکایک اُسے محسوس ہُوا، کہ وہ کٹی جس سے اُسے محبت تھی، مر چکی ہے، صرف ایک طوائف اُس کے سامنے ہاتھ پھیلائے، اپنے جسم کی قیمت مانگ رہی ہے، اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور وہ آگے بڑھتا گیا۔

عذرا آپا

عادل رشید

صفحات :- ۲۸

نہ معلوم کیوں مجھے عذرا آپا سے جتنی محبت تھی امّی کو ان بیچاری سے اتنی ہی نفرت بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی رہی ہوگی۔ وہ عذرا آپا کا ہنسنا بولنا کھانا پینا ایک آنکھ نہ دیکھ سکتیں۔ اور تو اور وہ عذرا آپا بیچاری کے اُٹھنے بیٹھنے بولنے بات کرنے تک میں کیڑے نکالتیں نہ معلوم کیا بات تھی۔ کہ امّی کو ان بیچاری میں سدا کیڑے ہی دکھائی دیتے۔ جہاں کوئی بات بُری لگی یا کوئی کام مرضی کے خلاف ہوا بس عذرا آپا کا نام لیا جانے لگا۔ اس کام کا اُن سے تعلق ہو یا نہ ہو گن گن کر اُنھیں صلواتیں سُنائی جانے لگیں۔ بدتمیز۔ پھوہڑ۔ زبان دراز نکمّی۔ کام چور۔ مُردار جیسے شائستہ، مہذب اور گراں بہا خطابات سے اُنھیں نوازا جانے لگا اور وہ بیچاری ہیں کہ چُپ۔ اگر غلطی نہیں ہے تب بھی اُسے مانے لے رہی ہیں۔ تھوڑی تھوڑی ہوئی جا رہی ہے شرمندگی ظاہر کر رہی ہیں۔ اور

چُپ چاپ جلدی جلدی ہر کام کے لئے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھر رہی ہیں۔ دوڑ رہی ہیں۔ البتہ جب کبھی اس قسم کے مواقع آتے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ امّی کی مہربانی سے دن و رات میں جب کئی کئی مرتبہ اس قسم کی ڈانٹ پھٹکار ان پر پڑتی تو وہ بیحد افسردہ ہو جاتیں۔ ان کی دلی کیفیات کا عالم اُن کے سنجیدہ اور معصوم چہرے سے صاف نمایاں ہوتا۔ اُن کے سُرخ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹ مُرتعش ہو جاتے۔ آنکھوں میں پانی بھر آتا جیسے وہ ہمیشہ پی جانے کی کوشش کیا کرتیں۔ اُنھیں آنسوؤں کے پینے میں کمال حاصل تھا وہ شاید پانی بھی اتنی جلدی نہ پی سکتی تھیں جتنی جلدی کہ وہ اُمڈے ہوئے آنسوؤں کے سیلاب کو پی جانے کی عادی سی ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ بیچاری اُن کی بات کا کبھی بھولے سے بھی اُلٹ کر جواب نہ دیتیں۔ اُنھوں نے خاموشی کو گویائی پر ترجیح دی۔ وہ ہمیشہ گھر کا سارا کام خود سے کرتیں۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کا ہر طریقہ پر خیال رکھتیں۔ بھائی جان۔ بھائی صاحب اور بھائی میاں کے ہمیشہ آگے پیچھے پھرا کرتیں۔ ہم لوگوں کا سارا حکم گویا اُن کے سر آنکھوں پر تھا۔ اور وہ سب تھے کہ اُن پر بالکل اپنی خاص الخاص خادمہ جیسا رعب جمائے بات بات میں چڑیل۔ بدتمیز۔ بے ہودہ۔ نالائق کہہ دینا اُن کے نزدیک کوئی بڑی بات ہی نہ تھی۔ اور تو اور اُن سے چھوٹے عمر کے بچے بھی اوروں کی دیکھا دیکھی انھیں جھڑکتے انھیں گھُرکیاں دیتے لیکن وہ چُپ رہتیں اس لئے کہ اگر کہیں بھولے سے بھی اُن بچّوں کو محض اس لئے ڈانٹ دیں کہ یہ ان کی بدتمیزی ہے تو اُنکے رونے یا اُن کی جھوٹی سچی شکایتوں پر امّی چیل کی طرح جھپٹ کر آتیں اور

زبان میں لاکھوں صلواتیں بیچاری کو بلا کچھ پوچھے گچھے سُنا کے رکھ دیتیں۔ اور اس طرح امّی کی شہ پر یہ باشتئے اور بھی گستاخ اور شیر بن جاتے۔

عذرا آپا ہماری حقیقی بہن نہیں تھیں۔ بلکہ وہ ہماری مرحومہ خالہ صاحبہ کی واحد یادگار تھیں جنھیں خالہ مرحومہ نے مرتے وقت اپنی محبت کرنے والی چہیتی بہن یعنی ہماری والدہ محترمہ کے یہ کہکر سپرد کر دیا تھا کہ دیکھئے باجی یہ میری معصوم بچّی آپ کے سپرد ہے۔ اب اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ماں نہ باپ۔ اگر اسے ذرہ بھر بھی تکلیف ہوئی تو میری روح کو سکون نصیب نہ ہوگا میں حشر کے دن آپ کی دامنگیر ہوں گی۔ اور امّی نے مرنے والی بہن سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کے جیتے جی کوئی عذرا کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اور اس کے بعد بیچاری خالہ اماں سکون کے ساتھ مرسکی تھیں۔ ان بیچاری کو کیا معلوم تھا کہ اُنکی بہن صاحبہ اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی ان کی آٹھ سالہ بچّی کو اپنے گھر بھر کی خدمتگزاری پر مامور فرمادینگی۔ اس سے خادماؤں۔ اناؤں اور چھوکریوں جیسا کام لینا شروع کردیں گی۔ بیچاری عذرا آپا نے اس جہنم میں اپنی زندگی کے آٹھ سال اسی طرح جلتے بھنتے اور کُڑھتے گذار دیئے تھے۔ اب ماشاء اللہ وہ جوان تھیں۔ ایک سولہ برس کی دوشیزہ۔ خوبصورت حسین۔ انتہائی حسین۔ اتنی خوبصورت جنھیں دیکھ کر اللہ میاں کے حُسن پسندانہ طبیعت کے معیار کی داد دل سے دینی پڑتی۔

ثروت بھیّا ہمارے چچازاد بھائی تھے۔ بے حد ہنس مکھ اور زندہ دل، بات بات میں کھُلے جاتے جب کبھی چھٹیوں میں علی گڑھ سے آتے تو بس گھر کا گھر لوٹ کبوتر بنا پھرتا۔ دن عید اور رات شبرات کی صحیح تمثیل اگر مل سکتی تھی تو وہ

ہمارا گھر تھا جس کا دل چاہے ثروت بھیا کے زمانے میں آکر دیکھ لے۔ ثروت بھیا کی چھٹیاں کچھ اتنی جلدی ختم ہو جاتیں کہ کچھ پتہ ہی نہ چلتا کہ وہ کب آئے تھے اور کب گئے بس ایسا معلوم ہوتا کہ انھیں آئے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی گنتی کے تین ہی چار دن تو ہوئے ہونگے۔ حالانکہ انھیں آئے ہوئے پندرہ بیس دن ہو چکے ہوتے۔ اور وہ مجبوراً ہم سے جُدا ہو جاتے۔ ہماری دلچسپیاں نیم مُردہ ہو کر رہ جاتیں ختم ہو جاتیں مر جاتیں۔ اس وقت تک کے لئے جب تک کہ وہ پھر دوبارہ آکر انھیں زندہ نہ کریں۔ وہ ہماری دلچسپیوں کے مسیحا تھے شاعری وائری کی دنیا کے خیالی مسیحا نہیں۔ بلکہ اسی مادی دنیا کے سیکڑوں دفعہ کے آزمائے ہوئے مسیحا۔

ثروت بھیا کو عذرا آپا سے بیحد دلچسپی تھی۔ وہ ان کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ وہ جب علیگڈھ سے آتے تو اُن کے لاکھ چھپانے پر بھی اُن کی کسی نہ کسی حرکت بیساختہ سے یہ ظاہر ہو ہی جاتا کہ وہ محض ہم لوگوں کی خاطر نہیں بلکہ بطور خاص عذرا آپا کو لئے اتنا لمبا سفر طے کر کے موقع ملتے ہی علیگڈھ سے بھاگ آتے ہیں وہ جتنے دن یہاں رہتے اُن کی انتہائی کوشش یہ ہوتی کہ جسطرح بھی ممکن ہو وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ عذرا آپا کی معیت میں گذار دیں۔ اگر اُن کی قربت نہ نصیب ہو تو نہ سہی تنہائی میسر ہو یا نہ ہو وہ چاہتے کسی نہ کسی طرح اُن کے آس پاس ہی وہ منڈلاتے رہیں۔ اُن کی خواہش ہوتی، دلی خواہش کہ اُن کی باتوں کا ایک ایک فقرہ اور ایک ایک لفظ عذرا آپا کے کانوں تک پہونچے اور ضرور پہونچے! اور اسی لئے وہ گھر کے سارے بچوں کو اکٹھا کر کے خواہ مخواہ کے لئے اس جگہ یا اُس کے

آس پاس موقع ڈھونڈھ کر بیٹھ جاتے جہاں عذرا آپا بیٹھی ہوں یا کام کاج کر رہی ہوں۔ اور اب بس شروع ہو گئیں باتیں۔ ہم لوگوں کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کے لئے باتیں تو گویا بچوں سے کی جا رہی ہیں انھیں کے مطلب کی۔ مگر در اصل یہ آپ رانی چڑیا چڑے بچو ڑا کو یا ظالم لٹیروں کی بے سر و پا کہانیوں کے در پردہ عذرا آپا سے اپنے مطلب کی بات کہہ رہے ہیں۔ ان کے ہلتے ہوئے لب اور لفظوں کی اُلٹ پھیر۔ اور لطیف تشبیہ و استعاروں کی آڑ لیکر اپنے مقصد کی بات اُن کے کانوں تک پہنچانے کی پوری جد و جہد کر رہے ہیں۔ اور اُن کی دُزدیدہ نظریں چوری چوری بار بار اس طرف اس لئے اُٹھ رہی ہیں کہ میرا پیام پہنچا بھی یا نہیں پہنچا اور اگر لفظوں کی اُلٹ پھیر کے ساتھ تشبیہ اور استعاروں کی معرفت یہ پیام ہنوز گوش گذار نہیں کیا جا سکا تو موقع ملتے ہی آنکھوں آنکھوں میں یہ پیام پہنچا دیا جائے۔

ثروت بھیا عذرا آپا سے براہِ راست اپنے مطلب کی بات بہت کم کرتے وہ ہمیشہ اپنی بات کے لئے بہانہ تلاش کرتے ہمیشہ دوسروں کو سُنا کر کسی اور کو درمیان میں لا کر وہ عذرا آپا سے بات کرنے کے گویا عادی ہو چکے تھے۔ مثلاً اگر اُنھیں عذرا آپا سے یہ کہنا ہے کہ تم اس وقت میرے ساتھ سینما یا سیر کو چلو تو وہ اس طرح کہیں گے کہ بھئی کون ہے جو میرے ساتھ اس وقت سینما چلے۔ اگر میرے ساتھ کوئی سینما نہ گیا تو مجھے بیحد رنج ہوگا۔ یا یہ کہ کون ہے جو اس وقت مجھے چنے کا گرم گرم حلوا بنا کر کھلائے۔ کون ہے جو میرے ساتھ تاش کھیلے۔ میں بڑا خوش ہوں گا۔ جو اس وقت ہری ساٹن کی شلوار پہنکر مجھے دکھائے۔ وغیرہ وغیرہ اور عذرا آپا ہمیشہ ان کی اس قسم کی باتوں پر وہی کرتیں جو وہ چاہتے تھے

مثلاً اُنھوں نے یہ حکم دیا کہ تم اس وقت اپنا سُرخ سوٹ پہن لو تو عذرا آپا کسی نہ کسی طرح لاکھ بہانے کر کے امّی کی خفگیوں ان کی جھڑکیوں اور تیوریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان کی خوشی پوری کر رہی ہیں۔ یا اُن کی خواہش پر اُن کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ گئی ہیں۔ پھر خواہ انھیں ثروت بھیّا کی اس خوشنودی کی قیمت کتنی ہی مہنگی کیوں نہ ادا کرنی پڑے وہ فکر نہ کرتیں امّی کی لاکھوں گھُرکیاں اور صلواتیں سُن کر بھی وہ اپنے دل میں اس خیال سے بیحد خوش ہوتیں کہ اُنھوں نے ثروت بھیّا کا کہنا کر دیا ہے۔ اُن کی خواہش پوری کر دی ہے۔ اُنکی بات نہیں ٹالی

ایک دن صبح حسبِ عادت عذرا آپا نے جو نماز کے لئے اُٹھنے کی کوشش کی تو باوجود انتہائی کوشش کے وہ نہ اُٹھ سکیں۔ اُنھیں بہت تیز بخار چڑھا ہوا تھا سر میں درد تھا اور تمام جسم بھی بُری طرح دُکھ رہا تھا۔ مگر اُنھوں نے نماز کی خاطر اپنی بیماری کی کوئی پرواہ نہ کی جس طرح بھی ہو سکا بدقت تمام اُٹھ گئیں۔ اور ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے نماز کے لئے کھڑی ہو گئیں۔ خیر نماز تو اُنھوں نے جیوں تیوں کر کے پڑھ لی۔ مگر اس کے بعد جو اُنھیں بخار چڑھا ہے تو بس اللہ ہی یاد آگیا۔ تمام جسم بھٹی کی طرح سُلگ رہا تھا پہلے تو امّی یہی کہتی رہیں کہ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ یونہی معمولی سا بخار ہے۔ ابھی اُتر جائیگا۔ مگر جب تمام گھر والوں نے اس معاملے میں اُنھیں قائل کیا۔ اور ابا نے اُنھیں بگڑ کر ایک زوردار ڈانٹ بھی پلائی تو ان کا دماغ ذرا ٹھکانے پر آیا اور وہ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے میں جا کر گھُس گئیں اور پھر اس وقت تک وہاں سے نہ نکلیں جب تک کہ نوکروں کو خوب اچھی طرح جھاڑ نہ پلالی اُنھوں نے اور اپنے کھسیانے پن کا ثبوت چند ایک چینی کے

برتنوں کو توڑ کر نہ دیا۔

ڈاکٹر نے عذرا آپا کو دیکھتے ہی ڈبل نمونیہ کا سارٹیفکٹ یہ کہتے ہوئے عنایت فرما دیا کہ اگر اُن کی اچھی طرح دیکھ بھال نہ کی گئی تو جان کا خطرہ ہے۔ گھر کے تمام ممبر پریشان ہو گئے۔ ثروت بھیا کا تو مارے پریشانی اور گھبراہٹ کے بُرا حال تھا۔ اُن کے چہرے کا رنگ یکسر سفید ہو گیا، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ خود مہینوں کے مریض ہوں گھر بھر میں وہ سب سے زیادہ پریشان تھے۔ اور امّی اُن کی اس حالت سے انگاروں پر لوٹ رہی تھیں جلی جا رہی تھیں انھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہ عذرا آپا کی یہ اچانک بیماری اور تمام گھر کی اُن سے ہمدردی اُن کی کھلی ہوئی توہین ہے اُن کے ساتھ ظلم ہے۔ عذرا آپا کی طرف سے اُن کے نام چیلنج ہے کہ دیکھا آخر میں کسی نہ کسی قدر ہمارا بھی خیال کرنے والے۔ تم لاکھ چاہو کہ گھر بھر کو مجھ سے متنفر کر دو تو اس سے کیا ہوتا ہے کبھی نہ کبھی دنیا مظلوم کا ساتھ دے ہی دیتی ہے کبھی نہ کبھی ایسا موقع بھی آجاتا ہے کہ اس کے سچا بھی ہونے کی جانے لگے۔ مارے رنج اور غصے کے امّی کا سر تمتمارہا تھا بھی بخار چڑھ آیا ہو۔

رات کے گیارہ بجے تھے۔ ابا ثروت اُن کی تیمارداری کر رہے تھے امّی کے لاکھ پر بھی کہ عذرا آپا کو کچھ نہیں ہوا وہ صبح تک باہ ان کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ عذرا آپا پر ہنوز نیم بیہوش تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ابا بھی امّی

سے مجبور ہو کر یہ کہتے ہوئے اُٹھ کر چلے گئے "اچھا بھئی تم لوگ بیٹھو میں اب جاتا ہوں۔ انشاء اللہ صبح تک یہ اچھی ہو جائیگی"۔

ابّا کے جاتے ہی خدا جانے ثروت بھیّا کو کیا ہوا کہ وہ یکدم سسکیوں سے رونے لگے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی بہت بڑے سیلاب کو اب تک آہنی بند کے ذریعہ روک رکھا تھا اور اب وہ بند کے اُٹھتے ہی زور و شور کے ساتھ بہہ نکلا اور عذرا آپا کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر ہو گیا "ارے!" عذرا آپا کو جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو، جیسے وہ کوئی بہت بڑا ڈراؤنا خواب دیکھ کر چونک پڑی ہوں "آپ رو رہے ہیں"۔ اُن کے مُنہ سے نکلا اور میں نے دیکھا کہ اُن کی اُداس آنکھوں میں مسرتوں کی دنیا ناچنے لگی۔ اُن کی مایوس نظروں میں محبّت، ایثار، تشکّر اور فخر کی ملی جُلی بے شمار کرنیں تڑپ اُٹھیں — "آپ — ؟ مجھ بدنصیب کی خاطر — ؟" ثروت بھیّا عالمِ بے اختیاری میں بلا میری موجودگی کا احساس کئے ہوئے عذرا آپا کے پیروں سے لپٹ گئے۔ "ارے خدا کے لئے" عذرا آپا نے گھبرا کر اُن کا "مجھے گنہگار نہ بنائیے میں اب بالکل اچھی ہوں۔ اچھا چلئے آپ سے نہ پڑوں گی"۔

صبح باوجود کمزوری، حرارت اور اعضاء شکنی کے
ہی تمام قوتِ برداشت کو بروئے کار لا کر محض
ن نہ ہوں بہنی خوشی کی کامیاب کوشش کے
روف ہیں۔ اور امّی اُنھیں اس طرح کام کاج کرتا
کہہ رہی ہیں کہ دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ یونہی معمولی سا

بخار ہے۔ صبح تک بالکل ٹھیک ہو جائیگا۔

عذرا آپا کی تعلیم برائے نام ہی سی تھی اس لئے کہ امّی اور ابّا نے اُن کے پڑھانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی تھی یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ دقیانوسی خیالات رکھتے تھے یا تعلیم نسواں کی ضرورت کا اندازہ اُنھیں نہیں تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھے کیوں پڑھاتے۔ میری تعلیم کی اُنھیں اسقدر کیوں فکر پڑتی۔ اور تو اور فرزاد اور خصّا تک کی تعلیم کا وہ ابھی سے بطور خاص خیال رکھتے۔ ایک چھوڑ دو اُستانیاں مقرر تھیں جو اُنھیں اُردو سکھاتیں اور شام کو ایک ماسٹر صاحب بھی ان دونوں کو انگریزی پڑھانے کے لئے روزانہ پابندیٔ وقت کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ ابّا کا خیال تھا کہ چھ ماہ تک اُنھیں گھر پر اسی انہماک کے ساتھ تعلیم دی جائے، اور اس کے بعد میری طرح اُنھیں بھی گرلز اسکول کی پانچویں جماعت میں داخل کرایا جائے۔ ابّا شروع ہی سے اسکول بھیجکر تھرڈ کلاس میں داخل کرانا گویا خواہ مخواہ کے لئے دو سال کی بربادی سمجھتے تھے اور یہ بات تھی بھی سو فیصدی درست، بھلا یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ تیسری جماعت سے بچے کو ریں ریں کرایا جائے۔

لہٰذا یہ بات صاف طور پر روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ وہ تعلیم نسواں کے خلاف نہ تھے۔ ہاں البتہ وہ عذرا آپا کی تعلیم کی ضرورت یقینی طور پر نہ سمجھتے تھے جس کی وجہ صرف دو ہی ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کون غیر کی لڑکی کے لئے اتنی دردسری اور زیر باری مول لے۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ اسکول جانے لگتیں پڑھنے لکھنے میں دھیان بٹاتیں تو پھر گھر کا کام کاج کون کرتا۔ بلا تنخواہ بلا ناغہ بھوں پڑھائے رات و دن امّی کی گھُڑکیاں کون سُنتا۔ اُن کے آگے پیچھے ناچتا کون پھرتا

واہ رے انسان اور تیری خود غرضی کیا تُو اپنے اِن ناروا سلوک کے بعد بھی انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ کیا تو اس قابل نہیں ہے کہ تجھے گولی ماردی جائے۔ تجھے نیست و نابود کرادیا جائے۔ مٹادیا جائے تجھے صفحۂ ہستی سے۔

ثروت بھیّا کو عذرا آپا کی تعلیم کی بے حد فکر تھی۔ اور وہ بیچاری خود بھی اپنے میں یہ سب سے بڑی کمی محسوس کرتی تھیں۔ وہ دن رات صرف اسی ایک فکر میں گھُٹا کرتیں۔ کاش اُنھیں لکھنے پڑھنے کا موقع مل سکے۔ نہ سہی۔ سارا دن صرف گھڑی دو گھڑی ہی کے لئے اتنا وقت نکال لیں کہ کچھ پڑھ لکھ لیا کریں۔ اپنی اس تعلیمی کمی کے باعث ان میں احساس کمتری کا مادہ روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ ایک یہی ایسی پریشان کُن چیز تھی جس کے لئے وہ کبھی کبھی جی کڑا کرکے امّی سے اس بات کی درخواست کرتیں کہ اُنھیں تھوڑا بہت پڑھ لکھ لینے دیا جائے۔ وہ تھوڑا بہت تو علم حاصل کرلیں۔ اور وہ امّی کو اس بات کا یقین بھی دلاتیں کہ اُنکے اس تعلیمی مشاغل کے باعث گھر کے کام کاج میں ذرّہ بھر بھی فرق پیدا نہ ہوگا۔ اور وہ اپنے تعلیمی مشاغل کے ساتھ ہی ساتھ اپنی زندگی کے اُن لازمی مشاغل کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں گی۔ مگر امّی نے اس عرضداشت کو کبھی اہمیت نہ دی۔ وہ صرف یہ کہکر اس بات کو ٹال جاتیں کہ میں کہاں منع کرتی ہوں کہ تم لکھا پڑھا نہ کرو اور پھر گھر کا کام کاج ہی تم ایسا کونسا بہت کرتی ہو جس کا مجھے فکر ہے۔ کیا نوکر چاکر مرگئے ہیں سارے جو مجھے تمھاری ضرورت ہو۔ مگر ہاں میں یہ ضرور کہوں گی کہ جوان لڑکیوں کو اپنا قیمتی وقت ان فضول کاموں میں نہ صرف کرنا چاہئیے۔ آخر تمھیں پرائے گھر جانا ہے کل کے دن سُسرال والے

میرا ہی نام رکھیں گے کہ بیٹی کو کچھ نہ سکھایا۔ امور خانہ داری سے بالکل ہی ناواقف ہے اور امّی کے استدلال پر میں جل اُٹھتی۔ شرم نہیں آتی انھیں ایسی فضول کی باتیں بناتے ہوئے اگر عذرا آپا کے نہ پڑھانے لکھانے کی وجہ حقیقتاً یہی ہے تو وہ اپنی لڑکیوں کے ساتھ یہ ظلم کیوں روا رکھ رہی ہیں کہ اُنھیں امور خانہ داری کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتیں۔ کیا کل سسرال والے ان کی لڑکیوں کے معاملے میں ان کا نام نہ رکھیں گے؟ یا وہ خون کے آنسو نہ بہائیں گی۔ وہاں جاکر کہ اُنھیں خدمت گذاری بالکل نہیں آتی۔ وہ غلامی نہیں کرسکتیں دوسروں کی۔

عذرا آپا بیچاری دن بھر کی جھک جھک کے بعد رات کو فرصت ملنے پر گیارہ بجے کے بعد بجائے آرام کرنے کے لکھنے پڑھنے بیٹھیں اور وہ رات کے تقریباً دو تین بجے تک لیمپ کی روشنی میں اپنا سر کھپایا کرتیں۔ یہ ان کا روز کا مشغلہ تھا اور یہ بات یقینی طور پر ان کے لئے باعثِ صد مسرت تھی۔ کہ خدا نے ان کی اس محنت کا اُنھیں اچھا پھل دیا۔ وہ ذہین تھیں اور حد درجہ پڑھنے لکھنے کی شوقین لہٰذا وہ بہت جلد اس قابل ہوگئیں کہ اُنھیں اوسط درجے کے پڑھے لکھوں میں شمار کرلیا جائے۔ وہ اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی تھیں۔

"بھئی ہم اُس سے نہیں بولتے جسے انگریزی نہ آتی ہو"۔ ایکدن عذرا آپا کو سُنا کر ثروت بھیا نے کہا اور عذرا آپا نے اُسکے دوسرے ہی دن سے کنگ ریڈر منگا کر مجھ سے پڑھنی شروع کردی۔ اور اس میں اس قدر دلچسپی لی۔ اتنا انہماک دکھایا کہ چند ہی دنوں میں اُنھیں کنگ ریڈر ختم کرکے دوسری کتاب منگانی پڑی۔ میں بھی ان کے پڑھانے میں دل وجان سے کام لیتی اور وہ بھی

خوب محنت سے پڑھتیں نتیجہ یہ نکلا کہ ثروت بھیا کی علی گڈھ سے دوبارہ آمد سے پہلے ہی وہ اچھی خاصی انگریزی لکھ اور پڑھ لیتی تھیں اب میں انھیں چھوٹی موٹی کہانیوں کی کتابیں اپنے اسکول سے لاکر دیتی جسے وہ پڑھا کرتیں۔ وہ بڑے بڑے مشکل پیراگراف کو انگریزی سے اُردو میں منتقل کر دیتیں اور انھیں زیادہ دقت نہ ہوتی — بخدا میں تو عذرا آپا کے اس ذہن کی قائل ہو کر رہ گئی تھی میں سوچتی کاش عذرا آپا جیسا ذہن خدا نے مجھے بھی بخشا ہوتا۔ اور میں اس انٹرنس کے گورکھ دھندوں سے جلد سے جلد نکل کر آگے بڑھ جاتی۔ یہ کمبخت انٹرنس بڑا مشکل ہوتا ہے۔

ہماری ماموں زاد بہن شہناز باجی بمبئی میں اپنے ابا کے پاس رہتی تھیں۔ وہاں اُن کے ابا کسی بہت بڑی فلم کمپنی میں ڈائرکٹر تھے۔ وہ کچھ دنوں کے لئے ہمارے یہاں آئیں۔ انھیں بنارس دیکھنے کا بڑا شوق تھا بمبئی سے شہناز باجی تنہا بنارس آئی تھیں۔ انھیں سفر میں ڈر ور بالکل نہیں لگتا تھا اور پھر وہ ڈرتی بھی کیوں، پڑھی لکھی تھیں بڑی اپٹوڈیٹ، اور پھر بمبئی جیسے شہر میں رہتی تھیں۔ وہ وہاں کسی کالج میں بی اے میں تعلیم پاتی تھیں۔

شہناز باجی کو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا۔ اس سے پہلے میں نے انھیں اپنے ہوش میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ خوبصورت تھیں مگر انکی خوبصورتی کا بڑا حصہ مصنوعیت کا رہینِ منت تھا۔ لپ اسٹک، پاؤڈر۔ غازہ سُرخی روج انکی زندگی کے اہم عناصر تھے اور وہ انھیں دل وجان سے چاہتی تھیں اُن کے بکس میں ساڑھیوں کی افراط تھی۔ بڑی قیمتی قیمتی ساڑھیاں تھیں۔

ان کے پاس فیشن اور ہر رنگ کی اور اسی مناسبت سے ان کے بلاؤ مردہی موزے سینڈل اور قیمتی زیورات تھے — وہ Machine کی بڑی خوش دلدادہ تھیں کیا مجال جو اُن کی Machine میں ذرہ بھر کا بھی فرق پیدا ہو جائے۔ وہ آئیں تو گھر بھر کی تمام دلچسپیاں ان کے گرد جمع ہو گئیں۔ انکے آنے سے ہمارا سارا گھر بیحد خوش تھا۔ ہم سب کے لئے بہت سے قیمتی تحائف لیکر آئی تھیں۔ وہ ہر چیز کو دکھاتے ہوئے اُس کی پوری تاریخ ہم سب کو بتائیں یہ چیز میں نے وائٹ اولے لیڈلا کے ہاں سے خریدی ہے۔ اور یہ اس سنہ میں وہاں آئی ہو گی۔ فلاں جگہ بنتی ہے۔ ہندوستان میں تو بس عنقا سمجھئے اسے اور بھئی یہ گھڑی میں نے بطور خاص پھوپھی اماں آپ کے لئے لی ہے۔ پورے سات سو میں ملی ہے فیر لوبا کے یہاں سے وہ کمبخت اس سے کم ہی نہ کرتا تھا اور یہ سگریٹ کیس میں نے خاص طور پر پھوپھا میاں کے لئے بڑی تلاش کے بعد اسکوتھ اینڈ لارڈ کے یہاں سے لیا ہے۔ اور جب انھوں نے صندل کے اس سگریٹ کیس کو کھولا تو اُس میں پیانو بجنے لگا۔ ٹن ٹن ٹناٹن اور ہمارا سارا کُنبا (سوا میرے اور عذرا آپا کے) جو ایک دائرے کی شکل میں اُنھیں گویا مداری سمجھ کر تماشائیوں کی طرح گھیرے ہوئے تھا کھِلکھِلا کر ہنس پڑا! باقی باچھیں کھِل گئیں۔ اور پیانو کی آواز کے ساتھ ساتھ اُن کی گردن رقص فرمانے لگی — آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔ اور اب ہر شخص ہے کہ اس سگریٹ کیس کو چھین رہا ہے۔ ذرا ہم دیکھیں۔ ہم دیکھیں۔ ابھی دے دیں گے۔ توڑیں گے نہیں۔ غرضکہ شہناز باجی نے اپنے تحائف کی خود ہی تعریف فرماتے ہوئے ہم سب کو

خوب سے زیادہ مرعوب کرنے کی کوشش کی اور انھوں نے وجہ تسمیہ کے طور پر بمبئی
کی تمام سڑکوں، عمارتوں اور دکانوں کے نام جو مشہور مشہور تھے ہمیں گنا دیئے۔
شہناز باجی نے ایک دن امی سے پوچھا "کیوں پھوپھی یہ تصویر کس
کی ہے؟"
"ثروت کی" امی بولیں۔
"کون ثروت؟" انھوں نے تعارف چاہا اور عذرا آپا کے کان کھڑے
ہو گئے۔
"تمھارے پھوپھا میاں کے بھائی کا لڑکا۔ علی گڈھ یونیورسٹی میں ایم۔ اے
میں پڑھتا ہے۔
"رہتے کہاں ہیں یہ" وہ بولیں۔ "کیا یہاں کبھی نہیں آتے؟" عذرا آپا
کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔
"وہ یہیں رہتا ہے" امی نے وثوق کے ساتھ کہا۔ "اس کے ماں باپ
دیہات میں رہتے ہیں، بیچارے غریب ہیں۔ لہٰذا اس کی تعلیم و تربیت سب
ہمارے ہی ذمہ ہے۔ اور وہ بھی اسی گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہے۔ البتہ سال میں کبھی
کبھار دو چار دن کے لئے اپنے ماں باپ کے پاس بھی ہو آتا ہے۔ دل نہیں لگتا
اس کا وہاں۔ اس کی چھٹیاں ہمیشہ یہیں گذرتی ہیں۔"
"ہوں" انھوں نے تصویر میز پر سے اٹھا کر اپنے سنہری فریم کے
نازک چشمہ کو درست کرتے ہوئے غور سے دیکھا۔ "خوبصورت آدمی ہیں" اور
ادھر عذرا آپا کے ہاتھ سے شیشے کا وہ نازک قلم دان گر کر چور چور ہو گیا۔ جو ابا کو

بیحد عزیز تھا اور جس کی شکل بالکل دل سے مشابہ تھی عذرا آپا میز صاف کر رہی تھیں۔ سُرخ روشنائی تمام فرش پر پھیل گئی۔ جیسے کسی کی آرزوؤں کا تازہ خون۔

"ایک ہفتہ بعد آنے والا ہے۔" امّی بولیں۔

"اچھا!" شہناز باجی نے گویا اظہارِ مسرت فرمایا۔ "میں تو ابھی گویا پندرہ دن تک ہوں ہی ملاقات ہو جائے گی حضرت سے۔"

عذرا آپا شیشے کے ٹکڑوں کو جوڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

"اب کیا جوڑ رہی ہو ان ٹکڑوں کو۔" امّی نے عذرا آپا کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ "کہیں ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بھی جُڑے ہیں آج تک۔"

"جی ــــ!" عذرا آپا نے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں نے دیکھا کہ اشکوں کے سیلاب میں اُن کی آرزوئیں ڈوبی جا رہی تھیں۔ دل نما ٹوٹے ہوئے قلمدان کا ایک بیضاوی ٹکڑا اُن کی ہتھیلی پر لرز رہا تھا۔

"ختم بھی کرو اب یہ قصہ۔" امّی پھر گرجیں اور اُن کی ہتھیلی پر سے وہ ٹکڑا سرک گیا۔ اور پکّے فرش پر گرتے ہی اُس کے چار پانچ ٹکڑے اور ہو گئے۔

عذرا آپا چونک پڑیں جس طرح معصوم بچہ سوتے سوتے چونک پڑتا ہے۔

ایک ہفتے بعد ثروت بھیا آ گئے۔ عذرا آپا کی عجیب حالت تھی وہ خدا معلوم کس ذہنی کش مکش کا شکار تھیں۔ ان کا چہرہ کبھی ایک شگفتہ پھول کی طرح کھلا ہوا معلوم ہوتا اور کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے اس شگفتہ پھول کو مسل کر رکھ دیا ہے۔ ان کے چہرے سے ذہنی اذیت کے آثار صاف طور پر نمایاں ہونے لگتے جنھیں وہ چھپانے کی ناکام کوشش کے بعد اور بھی

نمایاں بناتیں۔

دوپہر کے کھانے پر میز کے گرد ہم سب بیٹھ گئے۔ نوکروں نے کھانا لاکر چُن دیا۔ عذرا آپا ابھی تک باورچی خانے ہی میں تھیں۔

"عذرا آپا" میں نے آواز دی۔ "چلئے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے"۔ ثروت بھیا کے کان بھی اسی طرف لگ گئے۔ گویا وہ بھی عذرا آپا کے جواب کے منتظر تھے شہناز باجی نے ثروت بھیا کی اس حالت کو بنظرِ غائر دیکھا۔

"میں ابھی آئی" کہتی ہوئی عذرا آپا بھی آگئیں۔ وہ میرے پاس ثروت بھیا سے دوسرے نمبر پر کونے میں تھیں۔ شہناز باجی اور وہ آمنے سامنے تھیں بالکل متوازی لائن میں اور ثروت بھیا گویا اس متوازی لائن کے بالکل درمیان میں سامنے تھے۔ گویا یہ تینوں ایک مثلث کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"یہ میرے بھائی کی بڑی لڑکی ہیں"۔ امی نے ثروت بھیا کی طرف دیکھ کر شہناز باجی کی طرف اشارہ کیا۔

"جی" انھوں نے ایک نگاہِ غلط گویا رسماً ان پر ڈالی۔ "بہت خوب"۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" شہناز باجی بولیں۔

"اور مجھے بھی" ثروت بھیا نے رسماً جواب دیا — اور عذرا آپا کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر طشتری میں جا گرا۔ میز پوش خراب ہو گیا۔ اور اُن کے آگے کا دوپٹہ بھی، شوربے کی کچھ چھینٹیں ثروت بھیا اور شہناز باجی پر بھی پڑیں۔

"ارے!" ان کے مُنھ سے نکلا اور اُنھوں نے خشمگیں نظروں سے سبکو دیکھتے ہوئے معذرت کی۔ معاف کیجئے گا میں ابھی آتی ہوں۔

اُن کے چلے جانے کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میز پر سے شمع اُٹھا دی گئی ہو۔ ثروت بھیّا کے ہاتھ خود بخود رُکنے لگے اور باجی شہناز کی پیشانی پر کئی شکنیں پڑ گئیں۔

عذرا آپا اور ثروت بھیّا کی زندگی میں شہناز باجی ایک کانٹا بن گئیں وہ ان دونوں کی زندگیوں میں ایک حدِ فاصل کھینچ دینا چاہتی تھیں۔ وہ عذرا آپا کی تمام خوشیوں کو ان سے چھین لیں۔ اس بات کا اُنھوں نے تہیہ کر لیا تھا وہ چاہنے لگی تھیں کہ جس طرح بھی ہو عذرا آپا کی "زندگی" کی جائز حقدار وہ خود بن جائیں۔ انھیں ثروت بھیّا پسند آ گئے تھے وہ اُنھیں چاہنے لگی تھیں۔ خدا معلوم دل سے یا محض عذرا آپا کی ضد میں۔ مجھے شہناز باجی کی صورت دیکھ کر اُبکائی آنے لگی۔

بڑی آئیں وہاں سے عذرا آپا کی سوکن بن کر منحوس صورت۔

شہناز باجی کو ہمارے ہاں آئے ہوئے دس دن ہو چکے تھے۔ ایک دن وہ امّی سے کہنے لگیں کہ وہ ثروت بھیّا سے کہیں کہ اُنھیں بنارس گھما دیں۔ اور امّی نے جب ثروت بھیّا سے اس کا ذکر کیا تو وہ صاف مُکر گئے اُنھوں نے کہا۔ وہ اپنے ساتھ عورتوں کو لئے پھرنا اپنی سب سے بڑی سُبکی سمجھتے ہیں۔ ذلّت خیال کرتے ہیں۔ مگر وہ شہناز باجی بھلا کب باز آنے والی تھیں۔ اُنھیں تو مزہ آتا تھا اس قسم کی باتوں میں۔ لہٰذا اُنھوں نے خود جبیں سائی شروع کی۔

"مجھے بنارس نہ گھمائیں گے آپ؟" شہناز باجی نے ثروت بھیّا سے انگریزی میں کہا مگر وہ چُپ رہے۔

"وہ پھر بولیں "کیا آپ بہرے ہیں؟"۔

"جی ہاں" اُنھوں نے اُردو میں جواب دیا "میں آپکی طرف سے بہرا، گونگا، اندھا سبھی کچھ بنجانا چاہتا ہوں"۔

"آخر کیوں" وہ بدستور حماقت فرماتی رہیں۔

"اس لئے کہ ـــــ" ثروت بھیا کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ امی نے اُنھیں روکدیا اور ذرا تُرش رُوئی سے بولیں:

"تم بھی بس غضب کرتے ہو۔ ثروت مہمانوں کے ساتھ کہیں ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ جاؤ انھیں گھُما لاؤ"۔ ان کا آخری جملہ تحکّمانہ تھا۔ لہٰذا ثروت بھیا چُپ ہو گئے اور انھیں بادلِ ناخواستہ امی کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی اُنھوں نے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ شہناز باجی سے کہا:

"تشریف لے چلئے"۔

"میں بھی چلوں گی ثروت بھیا۔" میں نے عذرا آپا کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ضرور" وہ خوش ہو کر بولے۔ جیسے میں نے اُن کے دل کی بات کہہ دی ہو۔

"اور آپ بھی چلئے نا عذرا آپا؟" میں نے گویا عذرا آپا سے خوشامدانہ کہا

"وہ کہاں جائیں گی" امی بیچ میں بول پڑیں۔

"کیوں؟" ثروت بھیا نے تُرش روئی سے کہا۔ "آج تو نئی مامی بھی آگئی ہے"۔ امی جل کر کباب ہو گئیں اور میرا دل مارے خوشی کے ناچنے لگا

دل چاہا کہ ثروت بھیّا سے دوڑ کر لپٹ جاؤں ان کی اس بہادری پر سچ مچ کبھی کبھی دبی چیونٹی بھی کاٹ لیا کرتی ہے۔

"یقیناً عذرا کو بھی جانا چاہیئے۔" ابّا نے پُرزور تائید کی اور امّی اُسے اپنی مکمّل شکست سمجھتے ہوئے روسی دیں۔ جذبز ہو کر بولیں۔

"میں کب روکتی ہوں۔" اُن کے لہجہ میں بیزاری تھی۔

کار کی پچھلی نشست پر عذرا آپا، میں، فرزانہ۔ رخصانہ اور عشرت بیٹھ گئے شہناز باجی اگلی نشست پر پہلے ہی سے جم گئی تھیں۔

"آپ پیچھے تشریف لے جائیے۔" ثروت بھیّا نے دروازہ کھولتے ہوئے باہر کھڑے ہی کھڑے حکم دیا۔

"مگر وہاں جگہ نہیں ہے۔" شہناز باجی نے ڈھٹائی سے کہا۔

"میں ابھی انتظام کئے دیتا ہوں۔" اُنھوں نے مجھے اور فرزانہ کو آگے بیٹھنے کو کہا۔ اور پھر شہناز باجی کو مجبوراً پیچھے بیٹھنا پڑا۔ میں ثروت بھیّا کی اس جھاڑ پر بیحد خوش ہوئی اور عذرا آپا نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔

ثروت بھیّا نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اپنے سائڈ کے آئینے کو اس طرح پر گھمایا کہ اس میں عذرا آپا کا عکس صاف دکھائی دینے لگا، اور اُنکی اِس حرکت کو ہم سب نے دیکھ لیا۔ عذرا آپا جھینپ کر اپنی چوڑیوں کو اپنی خوبصورت نازک کلائیوں میں پھرانے لگیں۔ میں مُسکرا دی اور شہناز باجی جل کر کوئلہ ہوگئیں۔ اُنھوں نے اپنے ہونٹ چبا ڈالے۔ تازی تازی لپ اسٹک نے اُن کے مُنھ کا مزہ کڑوا کر دیا تھا۔

ہم لوگ دو تین گھنٹے تک اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ بنیا باغ، گنگا گھاٹ، اورنگ زیب عالمگیر کی بنائی ہوئی گیان باپی کی مسجد جس سے ملا ہوا خوبصورت مندر گویا ہندو مسلم اتحاد کا پیغام پہنچا رہا تھا۔ ہندو یونیورسٹی۔ چوک، راجہ کا محل۔ غرضکہ اسی قسم کی بہت سی چیزیں دیکھیں اور پھر جب ہماری کار گھر کی طرف تیزی سے بھاگ رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ شہناز باجی بار بار اپنا منھ بگاڑ رہی تھیں۔ خدا معلوم کیوں، شاید بنارس شہر اُنھیں پسند نہ آیا ہو۔ بھلا کہاں بمبئی اور کہاں بنارس یا پھر ہو سکتا ہے کہ لپ اسٹک کی کڑواہٹ ہنوز اُنھیں مُنھ بگاڑنے پر مجبور کر رہی ہو ——— اس واقعہ کے دوسرے ہی دن وہ واپس چلی گئیں۔

ابّا اور امّی کے ثروت بھیّا کے بڑے احسانات تھے۔ اُنھوں ہی نے اُنھیں پڑھایا لکھایا تھا اور اُنھیں اتنی اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ ورنہ بیچارے چچا جان اُنھیں کہاں پڑھا لکھا سکتے تھے۔ وہ غریب آدمی تھے اور اُن کی زندگی کی گذر اوقات صرف چند بیگھے کھیت اور ایک مختصر سی جائداد کی رہینِ منت تھی۔ بچپن ہی سے ثروت بھیّا ہم لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ امّی اور ابّا کی بات کبھی نہ ٹالتے۔ اُن کا حکم اُن کے لئے حکمِ خداوندی کا درجہ رکھتا تھا۔

امّی نے ثروت بھیّا کی شادی چُپکے ہی چُپکے اپنے بھائی کی لڑکی یعنی انھیں بی شہناز سے طے کر رکھی تھی۔ وہ انھیں زبان دے چکی تھیں کہ ——
ثروت تمھارا اور شہناز ہماری ہے اور شاید اسی لئے وہ محترمہ ہمارے گھر

آئی بھی تھیں۔ ہم لوگ اس خوفناک سازش سے قطعاً نا آشنا تھے۔

ثروت بھیا کے امتحان کا نتیجہ آیا۔ اُنھوں نے فرسٹ ڈویژن میں ایم اے پاس کرلیا تھا۔ ہم سب بیحد خوش ہوئے۔ ہمارے گھر میں عید منائی جانے لگی۔ ثروت بھیا کے ابا اور ان کی امی کو بھی اس خوشی میں شرکت کی خاطر دیہات سے بُلا لیا گیا تھا۔ عذرا آپا بیحد خوش تھیں۔ اُنھوں نے ثروت بھیا کی کامیابی کے لئے روزے مان رکھے تھے لہٰذا اُنھوں نے نتیجہ سُنتے ہی خوشی خوشی روزے رکھنے شروع کر دیئے۔

"اب تمھیں شادی کر لینی چاہیئے بیٹے"! امی نے ثروت بھیا سے ایک دن کھانے پر کہا اور ثروت بھیا کا چہرہ مارے خوشی کے مسکرانے لگا۔

امی بولیں "میں نے بات پکی کر لی ہے۔" اور اس بات پر ثروت بھیا چونکے۔

"ہاں"۔ امی نے اُن کی سراسیمگی دُور کر دی۔ "کیا شہناز تمھیں پسند نہیں ہے؟۔ اُس نے بھی تو بی۔ اے پاس کر لیا ہے۔ ثروت بھیا پر گویا بجلی گر پڑی۔ جیسے فالج کا حملہ ہو گیا ہو ان کے اوپر۔ ان کے کان بہرے ہو گئے سر چکرا گیا۔ اور تمام جسم سن سے ہو کر رہ گیا۔ امی جہاں دیدہ تھیں لہٰذا فوراً بولیں "میں زبان دے چکی ہوں اب سے نہیں بلکہ یہ بات تو کئی برس سے طے کر رکھی تھی میں نے۔"

ثروت بھیا کھانا چھوڑ کر اُٹھ گئے۔ ثروت بھیا کی دنیا اُجڑ گئی۔ اُنھیں ایسا معلوم ہوا جیسے اُنھیں کسی نے خواب سے جھنجھوڑ کر زبردستی جگا دیا ہو۔ وہ

عجیب گومگو کی حالت میں تھے۔ اُنھیں عذرا آپا سے محبت تھی۔ بیحد محبت۔ وہ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ ایک کی زندگی دوسرے سے وابستہ تھی پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دائمی جُدائی اُن کے لئے موت کا پیغام تھی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثروت بھیّا انکار کر دینا چاہتے تھے مگر یہ ممکن کیسے تھا وہ احسان فراموش نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ امّی اور ابّا کے اُن پر کتنے احسانات تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اُنھیں ان کے ان احسانات کا بدلہ چکانا ہے وہ امّی اور ابّا کے لئے ہر قربانی کر سکتے تھے۔ مگر اتنی بڑی قربانی کا تصور بھی کبھی اُنھوں نے نہیں کیا تھا۔ پھر بیچاری عذرا آپا کیا کہیں گی۔ اُن کا دل وہ کیسے توڑ سکتے تھے۔ اُنھیں اس کا اچھی طرح احساس تھا کہ عذرا آپا صرف اُن کی خاطر جی رہی ہیں وہ صرف اسی ایک اُمید پر جئے جا رہی ہیں کہ وہ ایک دن اُن کے ہونگے پھر وہ اُنھیں کس طرح چھوڑ دیں ۔ اُن کی اُمیدیں نہیں توڑی جا سکتی تھیں۔ اور ادھر امّی اور ابّا کا اسرار تھا کہ جس طرح بھی ہو ثروت کو شہناز کی شادی کرنی چاہیئے۔ امّی سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہی تھیں۔ اُنھیں ثروت بھیّا اور عذرا آپا دونوں کی حالت کا بخوبی اندازہ تھا۔ اُنھیں معلوم تھا کہ وہ آپس میں شیر و شکر ہیں۔ مگر خدا معلوم کیوں یہ سب جانتے ہوئے بھی وہ انجان بن رہی تھیں۔ وہ اُنھیں جُدا کرنے پر تُلی ہوئی تھیں۔ جس طرح بھی ممکن ہو۔

"آپ امّی کا کہنا نہیں ٹال سکتے۔ وہ بہت سخت ہیں۔

ان کے دل میں جو کچھ آتا ہے وہ کر گذرتی ہیں وہ اپنی ضد کے آگے
کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتیں آپ مفت میں اُن سے اُلجھ رہے ہیں
اُنکے سینے میں دل کی جگہ پتھر رکھا ہوا ہے۔ پھر کیا فائدہ اس پتھر سے
ٹکرانے کا۔ آپ مجھ بدنصیب کی خاطر اتنی بہت سی اُلجھنیں اپنے سر
مول نہ لیجئے امّی اور ابّا جو کچھ کہتے ہیں بخوشی مان جائیے اسی میں
آپکا بھلا ہے۔ سارے خاندان کا سوال ہے۔ اگر آپنے شہناز بہن
سے شادی نہ کی تو بھی وہ ہمیں کبھی ایک نہ ہونے دینگی۔ اور اسطرح
ہمارے درمیان ایک ایسی گہری خلیج حائل ہو جائیگی جسے ہم ملکر بھی
عمر بھر نہ پاٹ سکیں گے۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ میرا دنیا میں کوئی
نہیں ہے۔ نہ ماں نہ باپ۔ نہ کوئی بڑا بھائی نہ بہن۔ آخر کون ہے جو
میرے دل کی آواز سُنیگا۔ میں اپنی مرضی کی مختار تو ہوں نہیں
اور نہ آزاد ہوں کہ اپنا راستہ آپ پسند کر لوں محتاج ہوں اِنھی
لوگوں کی۔ اور شاید زندگی بھر محتاج ہی رہونگی۔ لہٰذا آپ شہناز بہن
کو اپنی زندگی کا شریک بنا لیجئے میں تو پہلے ہی سے جانتی تھی کہ
وہ مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہیں اُنھوں نے پیدا ہوتے ہی سُکھ
دیکھا ہے پھر اپنی اس زندگی میں بھی وہ اپنی مرضی کا سُکھ کیوں نہ
حاصل کریں۔ اُنکی اچھی قسمت اُنکے ساتھ ہے۔ اور ہمیشہ رہیگی۔ پھر وہ
ماشاءاللہ گریجویٹ ہیں خوبصورت ہیں اور ہر طرح آپکے لئے موزوں
آپ میرا غم نہ کیجئے شمع سحر سمجھئے مجھے تو جو جھلملا رہی ہو۔ اور اب

بہت جلد بجھ جاؤنگی۔ اسلئے کہ جس روغنِ اُمید پر زندہ تھی وہ اب مجھ سے جُدا کر دیا گیا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ بلا روغن شمع ایک منٹ بھی روشن نہیں رہ سکتی جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔

بہرحال میں آپ سے یہی التجا کرتی ہوں کہ آپ اپنی نئی زندگی شروع کر دیجئے۔ نہایت ہی ہنسی خوشی کیساتھ اور اب یہی میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ زندگی بھر آپکے لئے دعا کرتی رہی ہوں مرتے وقت بھی آپ ہی کیلئے دل سے دُعا نکلیگی۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اس آرزو کو نہ ٹھکرائینگے کہ شادی کر کے چاند سی دُلھن گھر میں لے آئیے یہ میری التجا ہے آپ سے میں آپ کی بھیک مانگ رہی ہوں۔ آپکی نئی زندگی کی بھیک، دیکھئے خدارا انکار کر کے مجھ بدنصیب کو اور زیادہ اذیت میں مبتلا نہ کر دیجئے گا۔

حرماں نصیب عذرا!

عذرا آپا نے یہ خط لکھ کر میرے ہی ہاتھوں ثروت بھیّا کو پہنچا دیا۔

ثروت بھیّا کی شادی کے انتظامات شروع ہو گئے۔ عذرا آپا نے شادی کے تمام انتظامات میں حصہ لیا۔ وہ ہر کام میں پیش پیش دکھائی دیتیں اُنھوں نے اس شادی کے سلسلے میں دل کھول کر دلچسپی لی اُنھوں نے رات دن ایک کر دیئے۔ رات رات بھر وہ بیٹھ کر دُلھن کے جوڑوں کو سنوارتیں انمیں لپکا، گوٹا ٹانکتیں۔ بناتی سنوارتیں۔ امّی اور ابّا اُن کے اس انہماک سے بیحد خوش تھے۔ مگر خدا معلوم کیوں اُن کی اس دلچسپی سے مجھے رنج ہوتا میرا دل

بیٹھا جاتا اور میرا دل چاہتا تھا کہ میں اُن کی گود میں سر رکھ کر اُن سے چمٹ کر رونے لگوں، خوب پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ اتنا روؤں کہ میرے دل کا بخار ہلکا ہو جائے۔ میں خوب اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ عذرا آپا کا دل بجھ چکا ہے اُنکی اُمیدیں مر چکی ہیں۔ اور اُنکی یہ دوڑ دھوپ یہ کدوکاوش دق کے مریض کا آخری سنبھالا ہے۔ چراغ کی آخری لَو ہے جو بھڑک کر اتنی تیز روشنی پھیلا رہی ہے۔ بس اب اسمیں کیا دھرا ہے بجھنے ہی والی ہے، وہ ایک گھڑی کی اور مہمان ہے بیچاری ثروت بھیّا دولھا بنکر بیٹھے تو تمام اور بہنوں کی طرح اُنکے سر پر آنچل ڈالنے کیلئے امّی نے عذرا آپا کو بھی کہا اور نہ صرف یہ کہا بلکہ انھیں مجبور بھی کیا کہ وہ ثروت بھیّا کے سر پر آنچل ڈالکر ضرور کھڑی ہوں۔ اور وہ بیچاری امّی کے اس آخری حکم کی تعمیل میں دھڑکتے دِل لرزتے ہونٹ، لڑکھڑاتے قدم اور اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی پوری قوتِ برداشت سے روکتے ہوئے آگے بڑھیں اور ثروت بھیّا کے سر پر آنچل ڈالکر کھڑی ہو گئیں میں نے دیکھا ثروت بھیّا کے سر پر عذرا آپا کا پٹا ہوا آنچل کانپ رہا تھا

دوسرے دن الہ آباد سے شہناز باجی ہمارے گھر آگئیں۔ مگر پہلے کی طرح نہیں بلکہ دُلھن بنکر۔ اُنکے ابّا نے اُنکی شادی اپنے وطن الہ آباد سے آکر کی تھی۔ جسوقت کار ہماری کوٹھی کے سامنے آکر کھڑی ہوئی تو خاندان کی سب اور عورتوں کے ساتھ عذرا آپا بھی اُنھیں اُتارنے گئیں۔ امّی نے عذرا آپا سے کہا تم دُلھن کو اُتارو اور وہ امّی کا یہ حکم پاکر ایکبار پھر پورے استقلال کیساتھ آگے بڑھیں اُنھوں نے کار کا دروازہ کھولا اور شہناز باجی کو جو اسوقت سُرخ قیمتی کپڑے کی ایک گٹھری معلوم

ہو رہی تھیں اپنی گود میں اُٹھا کر سجے ہوئے ہال تک لے آئیں اور انھیں نرم و نازک ایرانی قالین پر گاؤ تکیہ کے سہارے بٹھا دیا تمام عورتیں دُلھن کا مُنھ دیکھنے کیلئے پل پڑیں۔ سب سے آخر میں عذرا آپا نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دُلھن کا گھونگھٹ اُٹھایا عطریات کی تیز خوشبوؤں میں ملی جُلی لپ اسٹک کی خوشبو اُنکی ناک میں گئی اُنکے حسرت و ارمان کا خون دُلھن کے ہونٹوں پر جما ہوا تھا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر نہ کہہ سکیں۔ اُنکے گلے میں پھندا لگ گیا "مبارک ہو بہن" ہونٹوں کی کپکپاہٹ سے مس ہوتی ہوئی بدقت تمام یہ آواز اُنکے مُنھ سے نکلی اور باوجود انتہائی ضبط کے گرم گرم آنسوؤں کے کئی قطرے اُنکی اُداس آنکھوں سے نکل کر دُلھن کے سُرخ دامن میں جذب ہو گئے۔

دُودھ میں مکّھی

ابراہیم جلیس

صفحات :- ۱۲

جب سے بڑے بڑے پیسے والے انسانوں نے کرۂ ارض آپس
میں بانٹ لیا ہے۔ ہم جیسے ایک روپیہ روز کمانے والے انسانوں کے لئے
اس وسیع و عریض زمین پر ایک چپہ بھی ایسا نہیں جو ہمارا اپنا ہو جو کچھ ہے
وہ لالہ ہری داس کا ہے۔ میں اُسکی چنتامنی بلڈنگ کے ایک بوسیدہ کمرے
میں رہتا ہوں۔ اور مہینے کے مہینے تین روپیہ ادا کرتا ہوں میں اکیلا ہی نہیں
مجھ سے اور بھی بہت سے ایک روپیہ روز کمانے والے انسان تین روپیہ کرایہ
ادا کر کے زمین پر زندہ رہتے ہیں بمبئی یونیورسٹی کا نوجوان گریجویٹ ہریشچندر
بھی، اور کمرشل بنک کا بوڑھا کلرک گلاب چند اور اُسکی نوجوان بیوی بسنتو بھی
اِس چنتامنی بلڈنگ میں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ سب برابر ہیں سب ایک
دوسرے کے دوست ہیں سب ایک روپیہ کیلئے مر مر کر زندہ رہنے والے جو مہینے

کے مہینے عرق ریزی سے کمائے ہوئے تین چمکدار سکّے لالہ ہری داس کی خدمت میں پیش کر کے ایک ایک مہینہ اور زمین پر زندہ رہنے کے حق کو محفوظ کر لیتے ہیں۔

میرے کمرے کے دائیں طرف نوجوان ہرشچندر اور بائیں طرف بوڑھا کلرک گلاب چند اور اُسکی نوجوان بیوی بسنتو رہتے ہیں۔ ہم لوگ تھک تھکا کر شام ہی سو جاتے ہیں اور صبح چڑیوں کے چہچہانے سے قبل ہی جاگ پڑتے ہیں۔ صرف اتوار کی چھٹی کو ہم کلکٹر صاحب کی طرح دس گیارہ بجے تک پیر پھیلا کر سوتے ہیں۔

مگر ایک اتوار خلاف معمول مجھے بوڑھے گلاب چند کے بھجن گانے سے پہلے ہی جاگ اُٹھنا پڑا جس زبان سے روزانہ ایک عظیم ترین طاقت کی تعریف میں گیت سُنتا تھا۔ اُسی زبان میں آج بُری اور مکروہ گالیاں نکل رہی تھیں، برابر برابر حیثیت والے انسانوں کی پُرامن زندگی میں جھگڑا چنتا منی بلڈنگ سے نئی بات تھی میں نے دروازہ کھولکر دیکھا کہ نوجوان ہرشچندر ہاتھ میں لوٹا لئے سر جھکائے کھڑا ہے اور بوڑھا گلاب چند بار بار پیٹ پر گر جانے والے جینو کو کان پر لٹکائے اسپر سینچر کی جھڑی کی طرح برس رہا ہے اور دس پانچ کرایہ دار جھگڑا اُچکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بات اتنی تھی کہ نوجوان بسنتو نل پر کپڑے دھو رہی تھی اور ہرشچندر لوٹے میں پانی بھرنا چاہتا تھا بسنتو وہاں سے ہٹ نہیں رہی تھی۔ ہرشچندر نے اُسکو اُسکی چھاتی ——— وہاں سے ہٹا دیا۔ اور گلاب چند نے اشلوک پڑھتے پڑھتے کھڑکی سے یہ سب کچھ دیکھ لیا۔

مجھے ہرشچندر سے اِس حرکت کی قطعی اُمید نہ تھی۔ اتنا فاقہ مست

ہونیکے بعد بھی اُسکے رگ پٹھوں میں ـــــ پیدا ہوگیا عجیب بات تھی میں نے بسنتو کی طرف دیکھا۔ وہ رحم طلب مجرم کی طرح اپنے بوڑھے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر میں نے اسکی آنکھوں میں ایک خاص جھلک بھی دیکھی۔ اس جھلک کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا جائے تو یوں ظاہر ہو۔

میرے بوڑھے قابلِ رحم شوہر ـــــ کیوں اس دہکتے ہوئے نوجوان کے مُنھ لگتے ہو۔ یہ تو جوانی کی آگ سے گویا پھُنک رہا ہے اور تم ـــــ تمھیں دیکھکر تو میرا من کہتا ہے :

سیّاں توری سیجریا پہ میں آؤں گی

ہوسکتا ہے کہ میں نے غلط سمجھا ہو کیونکہ بسنتو تو ایک بہت ہی شریف عورت تھی جسکی شرافت ایک لمبے گھُونگھٹ کی شکل میں ہمیشہ اسکے چہرے پر لہراتی تھی۔ میں نے ہریشچندر سے ملامت بار نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا

"ہریشچندر کیا یہ حرکت تمھیں زیبا ہے کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ان گندے کمروں میں رہنے والی عورتیں بھی گندی ہوتی ہیں۔ کیا ان کرائے کے کمرے میں رہنے والی عورتیں بھی کرائے کی ہیں ؟"

ہریش نے سائلانہ انداز میں اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا :

"ملہر بھیا ـــــ"

گلاب چند قطع کلام کر کے للکارا۔

"بس ہمیں بھیّا مت کہو، غنڈے بدمعاش۔ اگر ایسی ہی جوانی اُبلتی ہے تو شادی کیوں نہیں کر لیتے۔"

شادی۔ اب تو میں چونک پڑا۔ ہم جیسے ایکروپیہ کمانے والوں انسانوں کیلئے شادی بڑا ہی مہنگا سودا ہے۔ ہم شادی نہیں کر سکتے۔ اسلئے تو تمھاری عورتوں کو چھیڑتے ہیں۔ اور جب ہمیں یہ خیال آتا ہے کہ ہماری زندگی میں شادی کا کوئی امکان ہی نہیں ہے تو ہماری امنگیں خطرناک طریق پر ابل پڑتی ہیں۔ اور اسوقت ہریش ہریش نہیں رہتا۔ بلکہ ایک مرد ہو جاتا ہے۔ اور بسنتو بسنتو نہیں رہتی بلکہ ایک عورت ہو جاتی ہے۔ پیسے سے محروم انسانوں کی بس یہی اخلاقیات ہے۔

یکایک مجھے ہریشچندر سے ہمدردی سی ہوگئی۔ میں نے واقعی اس کی طرفداری میں کہنا شروع کیا:

"بھیا گلاب چند یہ اتفاق کی تو بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہریشچندر کا ہاتھ غلطی سے لگ گیا ہو"

ہریش نے فوراً بات کاٹتے ہوئے کہا:

"ہاں بھیا غلطی سے میرا ہاتھ ——"

گلاب چند نے اپنے ہاتھ نچا کر کہا —— "تم چپ رہو جی"

میں نے کہا:

"بھیا میں ہریش کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ اس قماش کا لڑکا نہیں اتنی سی بات کو خواہ مخواہ جھگڑے کی بات بنا دینا تو تمھاری بدنامی کا باعث ہے چلو اب معاف کر دو۔ ہریش! بھیا سے معافی چاہ لو"

ہریش نے آگے بڑھ کر سر جھکا کر معافی چاہ لی۔ مگر گلاب چند بڑبڑاتا ہی رہا

اور میں نے زبردستی اُسکو اُسکے کمرے میں پہنچا دیا۔

اِدھر میرے دل میں کُرید پیدا ہو رہی تھی کہ ہریشچندر سے پوچھنا چاہیئے کہ ہمیشہ ہاتھ بھر لمبے گھونگھٹ کو دیکھتے رہنے کے باوجود اُسکے ہاتھ میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی ـــــ کوئی بات ضرور ہوگی۔ میرا دل کہہ رہا تھا۔ کوئی بات ضرور ہے۔

جب میں کوئلے سے دانت مانجھتا ہوا پانی کے نل کے قریب گیا تو وہاں ہریشچندر بیٹھا مُنہ دھو رہا تھا میں نے اُسکے قریب ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"ہریش، میں مانتا ہوں کہ بسنتو ایک بہت ہی شریف عورت ہے مگر میرے دل میں جو کُرید سی پیدا ہو رہی ہے وہ کیوں ـــــ؟"

ہریش نے مُنہ میں بھرے ہوئے پانی کی کلّی کرتے ہوئے جواب دیا:۔

"بھیّا تم کیا جانتے ہو سُسری کو۔ اِس گھونگھٹ کو الٹ کر اس کے ماتھے پر لکھے ہوئے گناہوں کو پڑھو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ وہ سامنے اینٹوں کے بھٹّے پر کام کرنے والی مزدورنیاں اتنی داغدار نہیں ہیں جتنی یہ عورتیں ـــــ یہ گھونگھٹ والیاں"

"مگر بھیّا یہ سب کچھ تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

ہریش نے اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی کے انداز میں کہنا شروع کیا ـــ

"ہاں تو سُنو ـــ یہ نیچے کے کمرے میں جو کالا سا مُسٹنڈا بڑھئی رہتا ہے نا ـــ ـــ کیا نام ہے اُس کا گنپت ـــ ٹھیک ہے وہ کل مجھ سے کہہ رہا تھا کہ

جسدن اُسے کام نہیں ملتا ہے اُسدن بسنتو اُسے چوری چھپے اٹھنی، چونی دے دیا کرتی ہے۔ بھلا ایک شوہر والی عورت کو ایک غیر مرد سے اتنی ہمدردی کیوں سوچنے والی بات ہے نا بھیّا"۔

"اٹھنّی چونّی وہ خود دے دیتی ہے"۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا گنپت دے سکتا ہے۔ جب سے اُسے نیچے والے کمرے میں رہتے دیکھا ہے شاید ہی کبھی کام پر گیا ہو، کھاتا پیتا کیسے ہوگا۔ اور کوٹھی کا تین روپیہ کرایہ کہاں سے ادا کرتا ہوگا۔ یہی بات تو تھی کہ اتنے دن یہاں رہنے کے بعد آجکل بالکل پہلی بار بسنتو کو دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ کے شعلے بھڑک اُٹھے اور اب تم آگئے تو جانتے ہی ہو بھیّا۔ اب میں چلتا ہوں"

ہرپرش کے چلے جانے کے بعد بڑی دیر تک دانت مانجھتا رہا اور سب کچھ بھول گیا۔ میری اُنگلی خود بخود دانتوں کو گھس گئی۔ اور میں اُسوقت چونکا جب بسنتو پھر نل پر پانی کا گھڑا بھرنے آئی اور ادھر اُدھر زمین پر کچھ ڈھونڈنے لگی۔ آج میں نے اُسکو نئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بسنتو بہہ ——— " میں کھانس پڑا۔ آج پہلی بار میں بھی بسنتو کو بہن نہ کہہ سکا۔ کیا ڈھونڈھ رہی ہو؟"

"اٹھنّی ڈھونڈھ رہی ہوں بھیّا ——— یہیں کپڑے دھوتے وقت مُنڈیر پر رکھ کر بھول گئی تھی"۔

میں نے عمداً جھوٹ کہدیا۔

"ارے ——— ابھی وہ کالا سا بڑھئی گنپت ——— جو نیچے کے کمرے میں

رہتا ہے۔ آیا تھا۔ شاید اُسکی نظر پڑگئی ہو۔ اور وہ اُٹھالے گیا ہو وہ آدمی تو کچھ بدمعاش سا معلوم ہوتا ہے۔"

اور فوراً ہی میں نے بسنتو کیطرف غور سے دیکھا۔ وہ ایکدم ٹھٹھک گئی تھی اور اُسکا سانولا چہرہ سُرخ انگارا ہوگیا تھا۔

بیچارہ بوڑھا گلاب چند دفتر کی میز پر صرف بسنتو ہی کیلئے نہیں جُھکا رہتا بلکہ نادانستہ طور پر اس گنپت کو بھی پالتا ہے۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ دنیا مجبور اور ترسی ہوئی عورتوں کا پیشہ صرف جسم بیچنا ہی نہیں بلکہ جسم خریدنا ہے۔

مجھپر اس واقعہ کا بڑا اثر تھا۔ بسنتو دن بھر میری آنکھوں میں سمائی رہی۔ میرے دل میں ایک بیچینی بسی تھی کہ نرم و گداز چھاتیوں کے پیچھے دھڑکتے ہوئے دل میں کیا کیا بھرا ہوتا ہے۔ لمبے رنگین آنچل کے پیچھے چھُپے ہوئے چہرے تخلیئے میں کیونکر مُسکراتے ہیں ہیں یہی سوچتا۔ بے مطلب بے مقصد تنگ اور پُرپیچ گلیوں میں جو عورت ہی کی طرح پُراسرار ہوتی ہیں۔ رات کے تین بجے تک ۔ پھر چنتامنی بلڈنگ پہنچا ۔ جب میں اوپر کی منزل کو جانیوالا زینہ طے کر رہا تھا تو زینے کے سائے میں مجھے کوئی چھُپا بیٹھا نظر آیا ۔ میں سمجھا کوئی بھک منگا ہوگا جو عالیشان مکانوں اور اُونچے محلات والی سرزمین میں بھی خانماں برباد ہے اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ آج بھی بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا مگر لالٹین میں تیل نہ تھا۔ اسی لئے مجبوراً سگریٹ سُلگا کر اپنے دروازہ کی چوکھٹ پر جا پہنچا۔ مدھم سی چاندنی بام و در پر پھیلی ہوئی تھی اور ایک سپید اُداسی اور خاموشی کائنات پر چھائی ہوئی تھی میں وطن میں ہزاروں میل دُور بیٹھی ہوئی دوشی کو یاد کر رہا تھا کہ

نیچے سے ایک ہلکی سیٹی کی آواز آئی اور پھر کسی کے کھکھارنے کی مدھم آواز ـــــ یہ معنی خیز ایک ہلکی سی سیٹی اور کھکھارنے کی مدھم آواز یقیناً کسی کو بُلا رہی ہے۔ مگر کس کو ـــــ میں اُٹھکر دیکھنا ہی چاہتا تھا کہ بُوڑھے گلاب چند کا دروازہ آہستہ سے کھُلا اور تھوڑی دیر تک کھُلا ہی رہا مگر اُسمیں سے کوئی نہ نکلا۔ یہ کیوں پیچھے یقین ہوگیا کہ بسنتو ہی ہے۔ ورنہ گلاب چند ہوتا تو باہر آجاتا یہ پیچیدہ اُلجھن میں وہیں بیٹھے بیٹھے مصنوعی طور پر کھانس پڑا۔ دروازہ آہستہ سے بند ہوگیا۔

اب میں سب کچھ سمجھ گیا کہ یہ نیچے سے سیٹیاں کون بجا رہا ہے اور کون کھنکارتا ہے۔ گلاب چند سو رہا ہے اسی لئے بسنتو کی دل کی اُمنگیں جاگ پڑی ہیں سیٹیوں کی آواز پر مین کی متوالی ناگن کی طرح مست ہو رہی ہے۔

میں سگریٹ پر سگریٹ اُڑاتا وہیں بیٹھا رہا۔ اسی طرح آدھا گھنٹہ گذر گیا۔ پھر گلاب چند کے کمرے کا دروازہ کھُلا اور میں اندر کیطرف دبک گیا۔ اب میں نے بسنتو کا باہر جھانکتا ہوا سر بھی دیکھا اور عمداً شرارت سے کھانس پڑا۔ ساتھ ہی میں نے اس کمرے سے بسنتو کی ہلکی ہلکی آوازیں سُنیں۔

"ناتھ ـــ ذرا جاگو اُٹھو ـــ اُٹھو ـــ اُٹھو"

"کیا ہے بسنتو" ـــ یہ گلاب کی آواز تھی۔

"ناتھ ـــ اب یہاں ہمارا گذارا نہ ہوگا۔ یہ جگہ شریفوں کی نہیں"۔

بسنتو کی ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز میں نے سُنی چند لمحوں کے بعد گلاب چند کے کمرے کا دروازہ زور سے کھُلا اور گلاب چند گالیاں بکتا باہر نکلا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں لانبی سی لکڑی تھی۔ اور ایک ہاتھ میں لالٹین۔ میں دروازہ ہی میں کھڑا

تھا۔ اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں بے کمینے۔ اپنے آپکو بڑا پارسا بتاتا ہے اب کہاں گئی تیری پارسائی اس لکڑی سے تیرا سر نہ پھوڑ دوں تو گلاب چند میرا نام نہیں۔"

میں یکایک پریشان ہوگیا اور اپنے آپکو سنبھالتے ہوئے بولا:۔

"دیکھو گلاب چند آخر میں نے تمہارا بگاڑا ہی کیا ہے جو گالیاں بک رہے ہو تمہارا یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔"

گلاب چند چیخنے لگا۔ "کیا بگاڑا ہے؟ غُنڈے بدمعاش میری عورت ذرا سنڈاس تک جا رہی تھی تو تُو نے اُسکا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر کہتا ہے۔ کیا بگاڑا ہے۔"

اسی اثناء میں ہرشچندر اور دوسرے سب کرایہ دار جمع ہوگئے پہلی منزل سے صرف گنپت اکیلا اوپر دوڑتا ہوا آیا۔ میں نے گلاب چند سے کہا:۔

"میں پرماتما کی قسم کھا کر کہتا ہوں گلاب چند کہ میں نے تمہاری عورت کو کبھی بُری نظر سے نہیں دیکھا۔ یہ تم کیا کہتے ہو۔"

گلاب چند بپھر گیا۔ "پرماتما کی قسم کھاتا ہے۔ تو کیا بسنتو جھوٹ بولتی ہے میں تیرا سر پھوڑ دوں گا کمینے۔"

سوائے ہرشچندر کے سب کرایہ دار مجھ پر لعنت ملامت کرنے لگے اور گنپت اپنی اُبلتی ہوئی لال لال آنکھیں نکالتے ہوئے بولا:۔

"سرپھجادیوں پر بُری نجر ڈالتے ہوئے شرم نہیں آتی بابو۔ عورت کا ایسا ہی سوک ہے تو ایک اٹھنی کیوں نہیں خرچ کرتے۔"

میں اسکا کچھ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ہرشچندر مجھے زبردستی اپنے

کمرے میں گھسیٹ کر لے گیا۔ اور اندر سے کواڑ بند کر لئے۔ باہر گلاب چند چیخ رہا تھا۔

"کل سیٹھ ہری داس کو کہکر ان کمینوں کو یہاں سے نکلواتا ہوں"۔

گنپت نے شیلے پر دھلا مارا۔ "جرور بابو۔ جرور، ان بدمعاشوں کو جرور سزا ملنی چاہیئے"۔

دوسرے دن مجھے کمرا چھوڑ دینے کا نوٹس ملا۔ میں نے اسباب کمرے سے باہر نکالتے ہوئے بسنتو کی طرف دیکھا اسکے چہرے پر ایک لمبا سا گھونگھٹ لہرا رہا تھا۔

برف کی سِل

علی عباس حُسینی

صفحات :- ۱۲

ہمسائی کے ہاں شادی تھی۔ "بڑی آپا" کہنے والی انور بیاہی جا رہی تھی۔ گھر میں سینکڑوں عورتیں موجود تھیں ـــــ بوڑھی، جوان، شادی شدہ، بن بیاہی، خوبصورت، بدصورت، آدمی کا بچہ! ـــ ہر ایک کے چہرے پر ہنسی کھیلتی تھی۔ ہر ایک خوش دکھائی دیتی تھی، مگر کوئی جمیلہ کی طرح بے آپے نہ تھی۔

نہ جانے کیوں آج وہ بوکھلا سی گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اسکا دل گا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں رہ رہ کے اُسکے جسم بھر میں ایک مترنم سی لہر دوڑ جاتی تھی۔ جیسے کوئی اُسکے سازِ زندگی کو بار بار چھیڑتا تھا۔ جیسے کوئی اُسے بار بار گدگداتا تھا۔ جیسے کوئی بار بار چٹکیاں لیتا تھا ـــــ وہ اپنی رگوں میں گرم خون کی روانی محسوس کرتی تھی، جلتا ہوا اُبلتا ہوا جوش مارتا ہوا! اُسکا جی چاہتا تھا کسی طرح یہ خون بہہ نکلے۔ اُسکا جی چاہتا تھا کہ وہ گھر بھر میں اُچکتی پھرے، ٹھمکتی پھرے، گاتی پھرے، ہنستی پھرے! وہ ایک جگہ

ذرا دیر بیٹھتی، پہلو بدلتی، مُسکراتی، کھڑی ہو جاتی، انگڑائی لیتی، آگے بڑھ جاتی۔ وہ ایک تتلی تھی، نازک حسین، دلربا۔ مگر بلا کی بے چین! کسی پھول پر جم کر نہ بیٹھنے والی! کسی غنچے پر نہ ٹھہرنے والی!۔

ڈومنیاں گا رہی تھیں، بوڑھی پھٹی آواز سے، بے سرے پن سے "آیا بنارے! آیا بنارے" کی رٹ لگائے ہوئے تھیں۔ جوان کی آواز میں رس تھا۔ تو اُسکی آنکھوں میں بھی مدہوشی تھی۔ کالی سیاہ پُتلیاں، بڑے بڑے دیدے، دنبالہ دار سرمہ لگا ہوا، ہونٹوں پر پان کی دھڑی جمی ہوئی، چُست انگیا میں بوٹی بوٹی پھڑکتی ہوئی! سپر شرارتیں کہ توبہ ہی بھلی! وہ کولھے مٹکاتی، آنکھ چمکاتی، آنکھیں مارتی اور کسی نہ کسی کی فرمائش پر اُسکی رشتہ دار کو ننگی ننگی گالیاں گا گا کر سُنا دیتی ——— جمیلہ کو یہ فحش مذاق، شادی بیاہ کی یہ گندی گالیاں کبھی نہ بھائی تھیں لیکن آج یہ گالیاں شراب کی طرح تلخ ہونے پر بھی سرور انگیز تھیں۔ وہ یہ بھول جاتی کہ اُسکا دوپٹہ سرک کر کہاں سے کہاں پہنچا وہ یہ بھی بھول جاتی کہ پاس کوئی بڑا کھڑا ہے یا چھوٹا، وہ بار بار ہنستی، تال دیتی اور انگڑائیاں لیتی!۔

ناک چوٹی گرفتار حسنی کو اُس نے کبھی اچھا نہ سمجھا تھا۔ اُسکی کرنجی آنکھیں، اُسکے گھنگھریالے بال، اسکا شلجمی رنگ جمیلہ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ مگر آج وہی حسنی سُرخ ساری میں ببر بہوٹی بنی ہوئی اسی پیاری معلوم ہوتی تھی کہ جی چاہتا تھا اسے کلیجہ میں بھر لو۔ جیسے جمیلہ کے دل میں سوائے محبت کے کسی جذبے کی گنجائش ہی نہ رہ گئی ہو۔ جیسے اُس نے اس راز کو پالیا ہو جو حسنی کو گھنٹوں سنگار کرنے پر مجبور کرتا تھا ——— سپاہی کا ہنر ہے اپنے اسلحہ کو صاف اور تیز رکھنا، ادیب کا ہنر ہے اپنے

قلم کی نوک پلک دیکھتے رہنا، اور عورت کا ہنر ہے اپنے کو ہر آن حسین تر بناتے رہنا!
—— حسنی اسکے سوا اور کیا کرتی تھی؟ وہ اپنے کو کسی کے پیشکش کے قابل بناتی تھی پیش کش! ہاں پیشکش ہی میں عورت کی فتح ہے! جیت ہے! حکومت ہے! لیں اکڑنے، برا نے چنگھاڑنے والے مرد پر حکومت! —— اور اُس نے پھر انگڑائی لی۔ آ
اس موٹے دوپٹے کو آج کیا ہوا ہے؟ جب دیکھو سر سے کھسکا جا رہا ہے!
آنہہ، ہوگا! کون دیکھتا ہے؟ سب عورتیں ہی عورتیں تو ہیں! اور سب خوش اپنے کو بھولی ہوئی، مگر میری طرح کوئی بے آپے نہیں، شاید دُلھن ہو چلو دیکھیں کیسی لپٹی لپٹائی، سمٹی سمٹائی بیٹھی ہے، خون کا گھنجھ قطرہ! . . . . . .
بخورات سے رُندھا اور بسا ہوا کمرہ، شنجرفی گھونگھٹ میں سے جھلکتا ہوا شہابی چہرہ، عطر عروس کی لپٹ، حنائی ہاتھوں سے چھوٹا سا سلام! جمیلہ نے بلائیں لینے کی جگہ دُلھن کو گود میں سمیٹ کر پیار کر لیا۔ انور نے شرما کر احتجاج کی "بڑی آپا" اس تخاطب نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ نوج یہ ہندوستانی رشتے! قدم قدم پر چھوٹے بڑے کا خیال۔ آدمی کس سے بولے کس سے ہنسے؟ اُس نے جھنجھلا کر کہا "بھاڑ میں جائیں بڑی آپا!" اور باہر چلی آئی۔
گھر بھر میں بجلی کی روشنی، دالانوں میں کمروں میں بیویوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ، صحن میں شامیانے کے نیچے صحنک کی تیاریاں، شامیانے کے پیچھے سے جھانکتا ہوا چودھویں کا چاند۔ اُس نے مہ کامل کی طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ بلند کئے اُنگلیوں میں اُنگلیاں پھنسائیں اور پھر انگڑائی لی۔ پھر ہاتھ نیچے لاتے ہوئے خود ہی مسکرا کر گنگنانے لگی۔ "اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن!"

میزبان بی بی نے پکار کر کہا "اری جمیلہ بیگم! کچھ مہمانوں کا بھی خیال ہی ہو سکو تلی پان پتہ مل رہا ہے؟" ـــــ بڑی محبت تھی اُس کی تھکی ہوئی بوڑھی آواز میں۔ اور اپنانے پر۔ کا انداز تو دیکھو۔ خود اُسے بھی میزبانی میں داخل کر لیا۔ اب چاہے اُسے رات بھر پان کا ٹکڑا نہ ملے، ایک کھیل اُڑ کر حلق میں نہ جائے۔ مگر وہ شکایت کر ہی نہیں سکتی۔ وہی تو منتظم ہے، اُسی کی لڑکی، اُسی کی عزیزہ اُسی کی بہن کا تو بیاہ ہے! ـــــ وہ دوپٹہ درست کرتی ہوئی ہنس کر بولی "جی ہاں آپ اِدھر سے بیفکر رہیں سبکو ساری چیزیں پہنچ رہی ہیں"

حُسنیٰ نے چپکے سے بغل میں کھڑے ہو کر کہا "تو پھر مجھے پان کھلواؤ نا!"

جمیلہ نے حسنیٰ کے اسطرح خاموشی سے پاس آنے پر کوئی تعجب نہ محسوس کیا وہ تو بڑی دیر سے جمیلہ کے پاس ہی تھی پیشکش بنی ہوئی! اُس نے حسنیٰ کو بڑی محبت سے دیکھا کیسی چھوٹ پڑ رہی تھی چاند کی اُسکے گورے گورے گالوں پر! اُس نے حُسنیٰ کے لپ اسٹک سے لال ہونٹوں پر اپنے کلمہ کی اُنگلی ماری۔ پھر اُسکی صراحی دار گردن میں بانہہ آویزاں کر کے کہا: "وہ چاند تمھیں آنکھیں مار رہا ہے حسنیٰ!"

حُسنیٰ نے جمیلہ کے اس فقرے کے جواب میں اُسے صرف مُسکرا کر دیکھا اس مُسکراہٹ میں غضب کی ہمدردی و یگانگت تھی۔ جمیلہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے حسنیٰ کے دل میں بھی وہی جذباتِ انبساط موجزن ہیں جو اُسے دیر سے گرمائے ہوئے تھے۔ جمیلہ نے ایک رُکتی ہوئی ٹھنڈی سانس لی۔ یہ اٹکتی، کھٹکتی، سینہ میں چبھک سی پیدا کرتی ہوئی سانس، افسردگی، اضمحلال، یا افسوس کے اظہار کا ذریعہ نہ تھی بلکہ یہ مسرت کے جامِ لبریز کی ایک لہر تھی، چھلک جانیوالی، چھلکا دینے والی ایک کیفیت جیسے سُبک قدم صبا کلیوں کو کھلاتی چل رہی ہو، جیسے آنکھیں لٹانے والا چاند دل میں

حسنیٰ نے اُسے مُسکرا کر دیکھا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں شعر پڑھا:۔

کس کے چہرے کا حیرتی ہو ماہ ؟ جملہ تن ایک دیدہ وا ہے!

جمیلہ نے ایک چھلتی نظر ماہ چہار دہم پر ڈالی پھر حسنیٰ کے ہوش چہرے پر آنکھیں جما لیں دفعتہً اسکے ہاں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوگئی۔ ایک مردانہ خواہش۔ حسنیٰ کو شباب حُسن کو لُوٹ لینے والی خواہش۔ آکاش میں مرد ہوتی! اُسنے ایک کھٹکتی ہوئی سانس لیکر سوچا اُس نے حسنیٰ کی گردن میں پڑی ہوئی بانہہ پر اپنا بوجھ بڑھا دیا۔ حسنیٰ اُسکی طرف جُھکنے لگی۔ شاخ بارور کی طرح جُھکنے لگی .....

"بی بی، اچھے میاں بڑی دیر سے آپ کے لئے بِلک رہے ہیں"۔

جمیلہ نے حسنیٰ کے بچہ کی کھلائی کو رقیب کی نظروں سے دیکھا۔ کہاں آگئی یہ مُردار اپنے اچھے میاں کو لیکر۔ مگر جب حسنیٰ اُسکی بانہہ اپنی گردن سے آہستہ سے الگ کرکے پھول سے بچے کیطرف پلٹی تو جمیلہ نے ماں بیٹے دونوں کے چہروں پر ایک ایسی چمک دیکھی جو دل میں تیر وسلسلہ کیطرح پیوست ہوگئی۔ اُسے دفعتہً محسوس ہوا کہ اُس کی خوشی نامکمل ہے، اُسکی محبت ناقص ہے۔ وہ اب تک بے ثمر ہے!۔۔۔

اُسکی نظروں میں ساس نندوں کا شکایت بھرا چہرہ پھر گیا۔ پانچواں سال تھا اُسکی شادی کو، مگر "ایک چوہیا" بھی وہ ابتک نہ جن سکی تھی۔ نہ میاں کو آجتک اسکی فکر ہوئی تھی، نہ اُسے پروا۔ وہ ضبطِ تولید کے قائل تھے، اور خود جمیلہ "تخلیق" کی تکالیف سے ترساں تھی۔ وہ محبت کے روحانی پہلو، اُسکے اغراق اُسکی مثالیت کی قائل تھی لیکن اس طیّب طاہر جذبے میں بہیمانہ افعال وحرکات کا اشتراک۔ اُسے حد درجہ کریہہ معلوم ہوتا تھا۔ اُسمیں جذبۂ مقاومت اُبھار دیتا تھا۔ لیکن آج اچھے میاں اور حسنیٰ کے چہروں کی چمک نے

اسے محسوس کرادیا کہ تولید میں "خالقیت ہے"۔ عورت کار ربانی فریضہ!۔۔۔ اُسکے جسم میں لرزش سی پیدا ہوگئی، جیسے اُس نے کوئی قصور کیا ہے، جیسے وہ کسی چوری میں پکڑی گئی ہے، جیسے بھری برادری اُسے سُبک نظر سے دیکھ رہی ہے۔ جیسے وہ سچ مچ عورت اور مرد کی درمیانی جنس سے ہے!

اُس نے پلٹ کر جسنی کی بھری گود کو دیکھا اُسے جمیلہ کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ وہ اچھے میاں کو سینے سے چمٹائے آنکھیں بند کئے جھوم رہی تھی۔ بچہ ماں کے گال پر گال رکھے ننھے ننھے ہاتھوں سے چاند کو بُلا رہا تھا۔ جمیلہ کو محسوس ہوا جیسے وہ پتلی پتلی اُنگلیاں اُسکے سینے کو چیرتی ہوئی دل میں در آئیں اور اُسے مسلنے لگیں ۔۔۔ وہ کچھ شرمائی کچھ مرجھائی سی وہاں سے چلی، قدرے بدحواس ہو چلی۔ درمیان میں ایک ۵ برس کی بچی سے ٹکرائی، چونکی، تو دیکھا کھوئی ہوئی منزل کیلئے دوسرا سنگ میل ہے۔ اُس نے بسورتی ہوئی بچی کو جلدی سے گود میں اُٹھالیا۔ گھبرا گھبرا کر مُنہ چوما۔ اُسے چاند دکھایا، بہلانے کے لئے گا گا کر سُنایا:۔

چندا ماما دُور کے　　لڈو بنائے بُور کے
لڈو گیا تُوٹ　　چندا گیا رُوٹھ

بچی ہنس دی "کہاں کُو تھا ہے ہنس تو لہا ہے"۔ جمیلہ نے پیار کر کے ٹھنڈی سانس لی "رُوٹھا نہ ہوتا تو ہمارے پاس کیوں نہ آتا؟"۔۔۔ بچی کو گود سے اُتار کر آگے بڑھ گئی۔ دل میں آیا چلو گھر چلیں۔ خیال آیا بی بیاں صحنک میں ڈھونڈینگی۔ اُنھ! بہت سی سُہاگنیں ہیں۔ شادی کا بھرا گھر ہے بسکو اتنا دھیان کہ بن بچوں والی جمیلہ غائب ہے۔ بن بچوں والی ۔۔۔ بانجھ!۔۔۔ ہائے اللہ کہیں ایسا ہی تو نہیں ہے؟۔۔۔ ایک ہُوک سی اُٹھی۔ وہ

تلملا گئی اُن سے کہونگی ڈاکٹرنی کو دکھاؤ، حکیم کو بلواؤ۔ مگر۔ مگر بڑی ہی بے شرمی ہے ۔ اُسکے قدم اور جلدی جلدی اُلٹنے لگے۔ وہ جلدی سے ہمسائی کی کوٹھی اور اپنے بنگلے کے درمیانی دروازے میں سے نکل گئی۔

بنگلہ اندھیرا تھا۔ نوکر چاکر، ماما دائیاں، میاں، سب ہی تو آج شادی کے گھر میں ہاتھ بٹانے، برات اُتارنے، مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے میں مشغول تھے۔ اسی لئے اسے یہ پرانا گھر اجنبی سا معلوم ہوا۔ مگر وہ نہ ڈری، نہ جھجکی۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی اس نے بٹن دبا کر روشنی کی۔ وہ اپنی سنگار میز کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اُس نے قدآدم آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ چوڑی پیشانی پر سیاہ چمکتی ہوئی زلفیں، پتلی جھکی ہوئی بھوؤں کے نیچے دو سیاہ چمکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، انہیں سُرخ سُرخ ڈورے، پتلی چھوٹی ناک، میانہ دہانہ، ٹھوڑی کے ٹھیک بیچ میں ایک ہلکا سا گڑھا اور اُسمیں ایک چھوٹا سیاہ تل۔ اُسے خود ہی اپنی صورت پر پیار آگیا۔ وہ مُسکرائی۔ اُس نے اپنی پتلی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے، اور زبان نکالکر خود اپنی صورت کا مُنہ چڑا دیا! ۔۔۔ پھر وہ زور سے ہنسی اور سیدھی ہنستی میاں کے دفتر میں گئی۔ اُس نے اُنکی میز پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کا "ریسیور" اُٹھایا ہمسائی کے مردانے کا نمبر بتایا اور انتظار کرنے لگی۔ کسی نے وہاں سے "ہیلو" کہا۔ اُس نے کہا "محتشم صاحب کو ٹیلیفون پر بھیجدو"۔

اُسکا دل دھڑکنے لگا۔ بڑی بیحیائی ہے۔ وہ دل میں کیا سمجھینگے۔ ہاتھ کانپنے لگا اُس نے "ریسیور" میز پر رکھدیا۔ اُسکا جی چاہا وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ آخر آج اُسے ہو کیا گیا ہے؟ وہ کیوں بوکھلائی بوکھلائی سی ہے؟ آخر میاں سے کیا کہیگی؟ اُسکے نتھنوں پر پسینوں کے ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے۔ اُس نے "ریسیور" اُٹھایا کہ اُسے

چُپکے سے ٹیلیفون کے "ٹرمینسمیٹر" پر رکھکر گفتگو کا موقع ہی نہ دے لیکن اُسکے اُٹھاتے ہی آواز آئی اُنکی پیاری آواز — "ہیلو" گھبراکر بول اُٹھی "۔ ذرا — ذرا یہاں آئیے! کام ہے!"

"اچھا آپ ہیں! ابھی آیا سرکار!"

اب کیا کیا جائے؟ اب تو راہِ فرار بھی مسدود ہوگئی! وہ تھوڑی دیر کھڑی کھڑی کانپی پھر دفتر کی روشنی بُجھا کر اپنے کمرے میں آئی۔ دو مسہریوں پر سپید سپید چادریں، ہلکی ریشمی دُلائیاں، سرہانے دو دو تکئے! ایکطرف اُسکی سنگار میز! اسپر آرائش و زیبائش کے سامانوں میں مشرق و مغرب کی آمیزش کنگھا، بُرش، پاؤڈر، کریم، سینٹ، عطر، سُرمہ، چاندی کا گلوری دان کچھ انگوٹھیاں۔ دوسری جانب اُنکی میز! اسپر مردانے بُرش اور کنگھے کیساتھ ایک جوڑی ڈمبل —

"کسقدر خوبصورت ہے اُنکا جسم بیس برس کے قریب عُمر مگر بوٹی بوٹی کسی ہوئی پھُرتی قوت اور مردانگی کا نمونہ! جب ہی تو بڑے گھمنڈ سے کہتے تھے "تمھاری جسمانی خوبصورتی بچّہ نہ ہونے ہی تک ہے، پیاری بنو!" اور میرے شرمانے اور دوپٹہ میں مُنھ چھپانے پر کسطرح ہنستے ہیں "مجھی کہتی ہے۔ حجاب نوعروساں در برشوہر نمی ماند۔ اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند!" اور تم ہو کہ ابتک چھوئی مُوئی بنی ہو! الجاؤ! اُجھینپو!" — اور آج کیا کہینگے وہ؟ انھیں کی بات سچ ہوئی! میں اُن سے برابر لڑی کہ ہر عورت فطرتاً رنڈی نہیں ہوتی۔ وہ کہتے "تم اپنا ذکر نہ کرو تم عورت نہیں ہو، تم تو قطبین کی نہ پگھلنے والی برف کی سل ہو، ہاتھی دانت کی مُورتی ہو، سنگِ مرمر کی پری ہو!" — ہائے اللہ یہ مجھے کیا ہوگیا کہ میں نے اُنکو خود سے بُلالیا۔ وہ چاہے میرے دکھانے کو کتنا ہی خوش ہوں، لیکن دل میں ضرور کہینگے "نکلی جمیلہ بھی رنڈی ہی!" اور وہ اپنی مخصوص ہنسی ہنسیں گے،

وہی جسکا ہر قہقہہ کہتا ہے "تمہارا میاں کبھی غلط بات کہتا ہی نہیں بنّو! ۔۔۔ وہ عورت کی رگ رگ پہچانتا ہے، بی بنّو!" ۔۔۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے مُنھ چھپا لیا۔ جیسے کوئی سچ مچ وہاں کھڑا ہے جیسے کوئی سچ مچ اُسے جھینپتے دیکھ رہا ہے۔ وہ اسیطرح کھڑی کھڑی دوا یکبارگی جُھومی، اُسے محسوس ہوا کہ اسمیں قوتِ مقاومت نہیں رہگئی اور اب بات اُسکی برداشت سے باہر ہوگئی۔ اُس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ آہٹ پر کان لگائے، کہیں وہ آتو نہیں رہے ہیں! ۔۔۔ اُس نے جلدی سے روشنی گل کی اور لمبے لمبے قدم رکھتی، مُڑ مُڑ کر دیکھتی، ۔۔۔ ہمسائی کی کوٹھی میں چلی گئی ۔۔۔

دیوار تو درمیان تھی ہی بس اپنی پھلواڑی طے کی اور اُنکے صحن میں ہولی لیکن اتنی راہ اس طرح اٹھ سے گذری کہ ہمسائی کے ہاں پہنچتے پہنچتے وہ ہانپنے لگی۔ دل دھڑک رہا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ہمسائی کی شکایت اور سہیلیوں کے طعنوں کا جواب وہ بڑی مشکل سے رُک رُک کر دے سکی۔ جب ذرا دم ٹھکانے ہوا تو ان انوکھے جذبات و خیالات کو بھلانے کیلئے وہ کام پر پل پڑی۔ اُس نے ساری بیویوں کو کھانا کھلایا، پان پہ پان بنا کے دیئے، دُلھن کو سنوارا، دولھا کے اندر آنے پر رسمیں کرائیں اور تاروں کی چھاؤں میں انور کو سسرال رخصت کر کے وہ گھر پلٹی ۔۔۔ تھکی ہوئی چُور افسردہ و مضمحل، بابل کے پُرحسرت گیت کی کھٹک دل میں لئے ہوئے ۔۔۔

پھیکی چاندنی اب بھی پھیلی تھی پھولوں پر شبنم کے موتی جھلک رہے تھے ہوائیں خنکی کیساتھ ایک خوشبودار مستی تھی، آس پاس کے درختوں سے چڑیوں کے چہچہانے کی آواز کانوں میں ایک خوشگوار جھنجھناہٹ پیدا کر دیتی تھی۔ اُسنے انگڑائی لی رگوں کے ٹوٹنے کی آواز کیساتھ ایک غنچے کے چٹخنے کی آواز بھی سُنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو

گلاب کی ایک کلی کھل رہی تھی۔ وہ گنگنا اٹھی۔

"ہوئیں کیاریاں ہری ہری جیسے کہ رُت پلٹ چلی۔ کون یہ مُسکرا دیا۔ ہنسنے لگی کلی کلی"۔ رُت پلٹ چلی۔ رُت پلٹ چلی۔ اُس نے بار بار دُہرایا۔ اُسکا اضمحلال غائب ہوگیا۔ اُسکے دل میں تمام وہی جذبات عود کر آئے۔ جو ٹیلیفون کرنے سے پہلے موجزن تھے اُسکا بیساختہ جی چاہا وہ میاں کو جگا کر کھینچ لائے۔ چلو پھولوں کا کھلنا دیکھو، گلوں کے کٹوروں میں شبنم کے موتی دیکھو اور رات کی دن سے ہم آغوشی دیکھو ــــ اُسکے قدم تیز ہوگئے، اُسکا تنفس تیز ہوگیا، اُسکی گردن آگے بڑھ گئی، گویا وہ اپنے میاں کی طرف اسی طرح کھنچی جا رہی تھی۔ جیسے فولاد مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ الان میں پہلے میاں کے دفتر کا کمرہ ملتا تھا اُس نے اپنی سانس کو قابو میں کرنے کے لئے اسے کھولکر جھانکا۔ اُسے یقین تھا۔ یہاں کوئی نہ ہوگا۔ "وہ اپنی مسہری پر دراز آرام کرتے ہونگے لیکن صبح کے دُھندلکے میں کوئی مخملی قالین پر پڑا ہوا معلوم ہوا۔ اُسے تعجب سا ہوا۔ اُس نے اندر ہاتھ بڑھا کر سوچ دبا دی۔

اُسکی جوان ماما رمضانی بیخبر سوئی تھی لیٹیں چھٹکی ہوئی، کپڑے بے ترتیب، لُٹے ہوئے مسافر کی بے پروائی! جمیلہ نے جھنجھلا کر سوچا "اس مالزادی کو یہاں لیٹنے کی کس نے اجازت دی!" اُس نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ میاں کا ایک موزہ میز پر رکھا تھا، ایک نیچے گرا تھا، کالی شیروانی رمضانی کے سرہانے فرش پر پڑی تھی، اور وہ بغل والے حمام میں لہر الہرا کے گا رہے تھے ــــ

داغ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی؛ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

"مرمر کی پری" نے چیخ روکنے کے لئے اپنے ہی ہاتھ سے اپنا منہ بند کرلیا۔

دلِ ناتواں

دھرم پرکاش آنند

صفحات :- ۲۲

یہ تمھاری جستجوئے حُسن خود فریبی ہے۔ یہ ناحق کی آشفتہ سری تمھاری شکست کا آئینہ ہے۔

میں کافی ہاؤس کے ایک کونے میں بیٹھا بُوند بُوند کر کے زہر کو پیتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ دفتر کا سارا کام چھوڑ کر آج پھر کافی ہاؤس کیوں چلا آیا ہوں۔

یہ کافی بخار کی دوا کی طرح کڑوی اور بدمزہ ہے۔ میرے دماغ میں خشکی سی پھیلنے لگی ہے لیکن میں برابر پیے جا رہا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ناحق کی بیخوابی کا سامنا ہوگا۔

اکیلا بیٹھتا ہوں نہیں، بالکل اکیلا نہیں۔ راؤ ہے، گوپال ہے، کبھی کبھی وینکٹ بھی آ بیٹھتا ہے اور تب میں بُوند بُوند نہیں، گھُونٹ گھُونٹ کافی پینے لگتا ہوں۔ کڑوی، بدمزہ، خشک کافی۔

اور میں راؤ سے پوچھتا ہوں "راؤ تم شادی کیوں نہیں کرتے ؟" راؤ ایک بنک میں ملازم ہے، اچھی تنخواہ پاتا ہے۔ ۳۲-۳۳ سال کی عمر کا ہے۔ کنوارا ہے۔

"راؤ یہ نہ کہو کہ تمھیں بیوی نہیں ملتی۔ تم چاہو تو کل ہی شادی رچا لو لیکن تم اُن لوگوں میں سے ہو جو لڑکی کے تصور سے تو محبت کرتے ہیں لیکن لڑکی کے وجود سے لرزاں رہتے ہیں۔ تم بیوی کو نہیں اپنے آپکو ڈھونڈھ رہے ہو تم اُسے کبھی نہیں ڈھونڈھ پاؤ گے۔ تمھاری شادی کبھی نہیں ہوگی ..... وہ دیکھو ایک اور لڑکی کافی ہاؤس میں داخل ہوئی ہے۔ دروازے پر رُک گئی ہے۔ گوپال گہری نظروں سے اُسکے دلکش جسمانی نشیب و فراز کو دیکھ رہا ہے۔ اور وہ یہ دیکھ رہی ہے کہ جس کو وہ ڈھونڈھنے آئی ہے۔ وہ کافی ہاؤس میں ہے کہ نہیں۔

گوپال، اُدھر مت دیکھو۔ دوست، اِس سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر کسی بھرے ہوئے جسم والی لڑکی سے محبت کرنی ہے تو تمھیں ایسی بہت سی لڑکیاں ملجائینگی اُرمی سے ملے ہو؟ اُسکے جسم کا نکھار دیکھا ہے؟ ہاں، تم کچھ دن تو اُس کی محبت میں مبتلا رہے لیکن مجھے معلوم تھا تم لوٹ آؤ گے۔ اُرمی کا تمھیں تین چار ملاقاتوں تک نشہ رہا۔ بہت کافی ہے۔ دلکش جسمانی نشیب و فراز کے باوجود اُرمی تمھیں جچی نہیں۔ جچے گی بھی نہیں اُسمیں کچھ خامیاں ہیں۔ ملاقات کے کچھ دیر بعد تمھیں ہر ایک لڑکی میں کچھ خامیاں نظر آنے لگتی ہیں اُن خامیوں کو بیان کروگے؟ کیا کروگے بیان کرکے۔ تم گھوم پھر کر پھر اسی میز پر آجاؤ گے۔ اور گھونٹ گھونٹ کرکے کڑوی کافی پیوگے۔ اور کہوگے "کوئی خوبصورت لڑکی نہیں ملتی" تم لڑکی کے رنگین تصور کو لڑکی کے مادّی وجود میں ڈھونڈھتے ہو اسکا نتیجہ سوائے نا اُمیدی کے

اور کیا ہوگا۔

راؤ۔ یہ بات بات پر اپنے خیالات کا جائزہ لینے کی عادت تمہارے لئے بہت بُری ہے۔ تم ہر وقت اپنے آپ سے پُوچھتے رہتے ہو کہ ایسا کیوں ہوا؟ تم اپنی شکست کیوجہ جنسی بھوک میں ڈھونڈھتے ہو تمہارا خیال ہے کہ اگر تمہاری زندگی میں کچھ ایسی لڑکیاں آئی ہوتیں جنھوں نے اپنے جسم کو تمہارے حوالے کر دیا ہوتا تو تمہاری دماغی کیفیت سُدھر گئی ہوتی۔ اور تم اتنے پریشان نہ پھرتے لیکن یہ تم اس لئے کہتے ہو کہ تمنے ابھی تک کسی لڑکی کے جسم کو چھوا تک نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ تم بیمار ہو! اور تمہاری بیماری کا واحد علاج عورت کی صحبت ہے لیکن میری بات مانو۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ سر ہلاتے ہو تم؟ یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ میں غلطی پر ہوں یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ اگر تم کسی عورت کے پاس سے بھی ہو کر گذر جاؤ تو تمہارے جسم میں ایک خوش کُن سنسنی اور تمہارے دل میں ایک میٹھی ہلچل پیدا ہو جاتی ہے کیا پھر کُنڈا سے کافی ہاؤس میں ملاقات کی بات سُنانے لگے ہو؟ وینکٹ، راؤ پھر پُرانی کہانی لے بیٹھا ہے اچھا سُنا لینے دو۔ بیمار کی دوا تو ہمارے پاس نہیں ہے لیکن یہ واقعہ سُنا دینے سے اسکے دل کو تھوڑی سی تسکین ضرور ملجاتی ہے۔ راؤ تم نے کہانی ابھی شروع بھی نہیں کی اور تمہارا مُنہ لال ہونے لگا تمھیں آدمی کس نے بنایا ہے تم تو کچی مٹی کے گھڑے ہو جو پانی کے مَس سے بکھر جاتا ہے طوفان کا مقابلہ کیا کریگا سُناؤ سُناؤ ہم سُن رہے ہیں۔ ہاں تو ہم سبھی میز کے گرد کافی پی رہے تھے۔ وہی باتیں ہو رہی تھیں جو روز ہوا کرتی ہیں۔ وینکٹ (جسکا چہرہ اُسکے بالوں کے رنگ سے بھی زیادہ سیاہ ہے) کہہ رہا تھا۔ یار کوئی آرٹ سرکل بنائیں، کوئی میوزک

سوسائٹی قائم کریں ہیں اپنے آپکو بحیثیت پبلسٹی انچارج پیش کرتا ہوں لیکن پبلسٹی کے ان شاہکاروں کو کالج کی لڑکیوں تک کون پہنچائیگا؟ گوپال تم یہ کام کروگے۔؟ گوپال بھلا کیوں کرنے لگا؟ اُسے کیا پڑی ہے کہ دوسروں کی دوستی کیلئے لڑکیاں مہیا کرتا پھرے؟ خود اُسکی بہت سی دوست ہیں بمبئی میں پہلے پہل اُسکی دوستی ایک مہٹی لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ بی۔ اے میں پڑھتی تھی پہلی ملاقات میں گوپال نے اُسکے چہرے کی تعریف کی۔ اُس سے کہا تمھاری شکل مجھے لاہور کی ایک لڑکی یاد دلاتی ہے جو ہر اتوار کو میرے گھر پر آکر میری کتابوں کو بڑے قرینے سے میز پر سجا دیا کرتی تھی میں ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ دوسری ملاقات میں گوپال نے اُس لڑکی کے جسم کی تعریف کی اور کہا کہ میں بمبئی میں اکیلا ہوں، بالکل اکیلا، اپنے اکیلے پن کو مٹانے کیلئے میں شراب پینے لگا ہوں۔ اور یہ کہکر اپنے چہرے پر ایک بڑا غریبانہ سا جذبہ لاکر سگرٹ سُلگانے لگا۔ لڑکی اُس کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھتی رہی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ کس جذبے کو اپنے دل میں جگہ دے۔ گوپال سگرٹ کا کش لگاتا ہوا کرسی میں آرام سے بیٹھ گیا چھت کی طرف دیکھتا ہوا دھوئیں کے دائرے بنانے لگا۔ اور اُسکا بایاں ہاتھ لڑکی کے ہاتھ کو ڈھونڈھ کر اُسے آہستہ آہستہ سہلانے لگا تیسری ملاقات میں گوپال اُس لڑکی کو اپنے گھر لے گیا۔ اور کہنے لگا "تمھیں دیکھکر مجھے کچھ ہو جاتا ہے میرے دماغ میں کھلبلی سی مچ جاتی ہے میں اور بھی بہت سی لڑکیوں سے ملا ہوں لیکن ایسا اثر مجھ پر پہلے کبھی نہیں ہوا۔ تمھاری قربت میں میں اپنے آپکو بھولنے لگتا ہوں" اور یہ کہکر گوپال نے لڑکی کی اُس شرافت کو چھین لیا جسکو لڑکی اتنی دیر سے محفوظ رکھتی چلی آئی تھی جسپر اُسکے

ماں باپ کو ناز تھا جب سماج اُسکو ایک اچھے گھرانے کی بیٹی کے نام سے یاد کرتی تھی لڑکی نے کہا "تم وحشی ہو، جانور ہو، کمینے ہو" اور لڑکر چلی گئی لیکن دس پندرہ دن کے بعد خود ہی گوپال کو ٹیلیفون پر کہنے لگی "کیوں ناراض ہو کیا؟ بہت دن سے ملاقات نہیں ہوئی، کب ملوگے؟ اور تب آہستہ آہستہ گوپال نے اُس لڑکی کی معرفت اُسکی کئی سہیلیوں سے دوستی پیدا کرلی۔ اور اب وینکٹ آرٹ سرکل بنانیکے متعلق سوچ رہا ہے۔ گوپال کی مدد لینا چاہتا ہے۔ گوپال اپنی خوش قسمتی کیوں بانٹے؟ اُسکا جواب ٹھیک ہی تو تھا "ہوش کی دوا کرو دوست تمھارے تو بیوی ہے بچے ہیں" اس سے کیا ہوتا ہے۔ بچے ہونا خوش قسمتی کی نشانی تھوڑے ہی ہے۔ یہ تو شادی کا لازمی نتیجہ ہے اور جس عورت سے شادی کی جائے۔ اُس سے محبت ہو بھی سکتی ہے نہیں بھی ہو سکتی اور محبت تو قناعت کا دوسرا نام ہے۔ اسکا لُبِ لباب یہی ہے کہ مجھے میری چیز مل گئی میں اسی میں رچ جانا چاہتا ہوں مست ہو جانا چاہتا ہوں، میرے لئے اسکے پرے کچھ نہیں لیکن وینکٹ کیسے قناعت کرے، ایک وینکٹ ہی کیوں کوئی بھی کیسے قناعت کرے۔ اصل میں تو آدمی کی شخصیت کے اظہار کا سنگ بنیاد خود غرضی ہے میں جس دُھن میں مست ہوں میری خوشی کیلئے مجھے اُسوقت اُس دُھن کا، اُس ذہنی یا دلی کیفیت کا عکس ملنا چاہیئے۔ آدمی کی ذہنی کیفیتیں تو دن کے پہروں کی طرح ہیں جن میں مختلف راگ چاہئیں۔ ایک صورت تو ایک ہی کیفیت کو پورا کرتی ہے اور ایک ہی ضرورت کو۔ وہ بہت سی کیفیتوں کو پورا کیا کرتی تھی۔ محبت کے پہلے جوش میں پر اُسوقت دُھن ایک عورت تو نہیں ہوتی۔ زمین و آسمان کی سب عورتوں کا مُرکب ہوتی ہے۔ ایک ماحول ہوتی ہے۔ جو آدمی کی رگ رگ میں

سرایت کر جاتا ہے لیکن جو ایک عورت ہے وہ کبتک ساری عورتوں کا مرکب بنی رہ سکتی ہے
اکثر لوگوں کو یہ بات شادی کے کچھ ہی مہینوں بعد معلوم ہو جاتی ہے۔ اکثر کوئی برس
بعد۔ اور تب جو زندگی کے دوسرے جھنجھٹوں میں اُلجھ کر نہیں رہ گئے انھیں پھر دوسری
عورتوں کی تلاش شروع ہو جاتی ہے، دوسری دُھنوں کے عکس کی۔ وینکٹ، تمھارے
دانت مصنوعی ہیں لیکن تمھارا جواب بڑا معقول تھا "ہاں" تم نے کہا تھا "بیوی ہے،
بچے ہیں اور ۔۔۔ اور جستریں ہیں"۔ وہ دیکھو کون آئی ہیں۔ باتیں بند کرو بھئی، ذرا دیکھ لینے
دو۔ دروازے میں دو لڑکیاں کھڑی ہیں۔ اُنکی نگاہیں اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈھ رہی ہیں
وہ مُسکرانے لگیں۔ ایک میز خالی نظر آئی ہے۔ سانولی کو نہیں دوسری کو دیکھو۔ سر کا
ایک مہم سا جھٹکا، لبوں پر ایک دلنواز مُسکراہٹ، بازو کے سہارے چھاتی سے لگی
ہوئی کتابوں پر ذرا سا دباؤ، ہاتھ میں تھمے ہوئے بیگ کی ہلکی سی جُنبش، اور وہ خالی میز
کی طرف بڑھی، اپنی سانولی سہیلی کیساتھ۔ راؤ تمھارے لبوں میں تھما ہوا سگرٹ لرزنے
لگا ہے، راؤ، تمھارے ہاتھ کانپنے لگے ہیں، یہ دیکھو دیا سلائی بجھے جا رہی ہے، ہاتھ کو
مضبوط رکھو نہیں تو سگرٹ نہیں سلگے گا۔ تمھاری تو آواز میں بھی تھرتھراہٹ ہے
ذرا اُونچا بولو دوست، ان لڑکیوں میں سے ایک کو جانتے ہو؟ کسکو؟ وہ جسکی دونو
کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اُن بازوؤں کو چُوم رہی ہیں جنھوں نے کتابوں کو تھام
رکھا ہے؟ اُسکو جسکی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ہے جیسے کسی نے آئینے
کی مدد سے سورج کا عکس ڈالدیا ہو؟ اُسکو جسکے گالوں میں مُسکراتے وقت دو دلنواز
چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے ہیں! بڑے خوش قسمت ہو کمبخت۔ کُندا؟ کیا
پیارا نام ہے مطلب کیا ہے اسکا؟ ایک سفید پھول جو مغربی گھاٹ کے پہاڑوں

اُگتا ہے؟ دیکھو وہ تمھاری طرف دیکھ رہی ہے مُسکراؤ، گدھے کہیں کے مُسکراؤ، اچھا رہنے دو۔ وہ تمھاری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اُسکی نگاہیں دُور کھڑے ہوئے بیرے کو اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جاؤ اُس سے مل لو۔ باتوں باتوں میں اُسے کل یا پرسوں کیلئے اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت دے آنا نہیں، خدا کی قسم ہم میں سے کوئی بھی تمھاری باتوں میں خلل انداز نہیں ہوگا۔ ہاں ایک بات، ہم جب کسی خالی میز کی تلاش کرتے ہوئے وہاں سے گذریں تو ہمیں دیکھکر مُسکرا دینا جیسے تم نے ہمیں پہچان لیا ہو۔ اُسوقت ہم کنکھیوں سے کُنڈا کو دیکھ رہے ہونگے تمھاری نظروں کا تعاقب کرتی ہوئی وہ بھی ایک اُڑتی ہوئی نگاہ ہم پر ڈالیگی۔ ہمیں معلوم ہے کہ جسوقت وہ ہمیں دیکھے گی ہماری نگاہیں اُسپر سے ہٹ کر خلا میں کھو جائیں گی لیکن اُسے یہ تو معلوم ہو جائیگا کہ ہم تمھارے دوست ہیں، گوپال تم زیرلب مُسکرانے لگے! دوست، تم ہماری باتوں کو بیوقوفانہ سمجھتے ہونا! پر تمھیں معلوم ہے کہ کُنڈا کا ہمیں ایک نگاہ دیکھ لینے سے کیا فائدہ ہے؟ ہمیں محسوس ہونے لگیگا۔ کہ ہم اُس سے ایک قدم نزدیک آگئے ہیں۔ ہم اب کافی ہاؤس میں آنیوالی عام بھیڑ کے فرد نہیں رہے۔ بلکہ کسی غیر مرئی زنجیر سے کھنچکر ایک ایسے مخصوص حلقے کے ممبر بن گئے ہیں جسکے ایک کارکن کی کُنڈا سے جان پہچان ہے اور اسطرح کُنڈا کو قریب سے نہ جانتے ہوئے بھی اُسمیں اور ہم میں ایک اپنا پن سا پیدا ہو جائیگا۔

راؤ، تم کُنڈا کے پاس جانے لگے ہو؟ آج تو بڑی ہمت دکھا رہے ہو بھئی۔ اچھا جاؤ۔ جاؤ۔ ویکٹ، یہ راؤ کیا آج کچھ پی کر آیا ہے کہ اتنی دلیری دکھا رہا ہے ویکٹ، راؤ اب پرلے کونے میں کیا جھانک رہا ہے؟ جانتا ہے کہ اُس کونے میں

اُسکی جان پہچان کا کوئی فرد موجود نہیں لیکن پھر بھی جھانک رہا ہے۔ شاید کچھ تو اپنے آپکو دھوکا دینا چاہتا ہے اور کچھ باقی لوگوں کو۔ کہ وہ واقعی کسی کی تلاش میں ہے۔ خدا خدا کر کے اب اُس میز کی طرف چلا تو ہے جہاں وہ دو نو لڑکیاں بیٹھی ہیں بھئی واہ، وہاں تو وہ رُکا ہی نہیں۔ ہوا میں مُنہ اُٹھائے خلاء میں آنکھیں گاڑے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ اب جھانک جھانک کر باہر دیکھ رہا ہے۔ شاید اب کسی کے انتظار کا بہانہ کر رہا ہے کبھی کبھی کنکھیوں سے کُندا کی طرف بھی دیکھ لیتا ہے کہ کہیں وہ تو اُسکی طرف نہیں دیکھ رہی۔ بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے اور سر ہلاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ اب آنیوالا نہیں آئیگا۔ اب تک راؤ نے اپنے دل کو تسلی دے لی ہے کہ اب وہ اپنی شرافت کو کھوئے بغیر کُندا سے بات چیت کر سکتا ہے۔ اُسکی میز کے پاس سے ہو کر گذرتے ہوئے وہ یکایک ٹھہر جائیگا۔ اور حیران کُن لہجہ میں کہیگا۔ "ہیلو آج تم کافی ہاؤس میں کہاں؟" تب وہ اپنی گھڑی کی طرف دیکھیگا۔ اور بڑبڑائیگا۔ کہتا تھا "ڈیڑھ بجے آؤنگا"۔ پونے دو ہونے کو آئے کمبخت ابھی تک آیا بھی نہیں۔ آخر کار ــــ آخر کار وہ کُندا کے پاس پہنچ ہی گیا۔ کُندا مُسکرائی ہے۔ اُسکی سہیلی نے بھی سوالیہ نگاہوں سے اُسکی طرف دیکھا ہے۔ اور راؤ کے مُنھ سے بات بھی نہیں نکلی۔ اُسکا چہرہ سُرخ ہو اُٹھا ہے اُس نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر ٹیکدیئے ہیں اور تھوڑا سا آگے کو جُھک گیا ہے۔ اُسکے ایک ہاتھ میں سگریٹ ہے۔ سگریٹ کا دُھواں کانپتا ہوا ہوا میں اُٹھ رہا ہے ضرور اُسکا سارا جسم کانپ رہا ہوگا۔ وہ کبھی ایک پاؤں کے پنجے پر زور ڈالکر کھڑا ہوتا کبھی دوسرے پر۔ اُس نے جیب سے رومال نکالا ہے، اور ہتھیلی کو پونچھنے لگا ہے ضرور اُسے پسینہ آرہا ہوگا۔ آخر حوصلہ کر کے کانپتی ہوئی آواز میں اُس نے پوچھ ہی لیا ہے

"تمہارے والد صاحب بمبئی ہی میں ہیں کیا؟" "ہاں" کُندا نے جواب دیا ہے۔ "بہت دن سے اُن سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ غالباً اس اتوار کو ان سے ملنے آؤنگا۔" کُندا مُسکرائی ہے اُسکے گالوں کے ڈلنواز گڑھے اور گہرے ہو گئے ہیں۔ وہ کہہ رہی ہے "میں والد صاحب سے کہہ دونگی۔" بس اور کچھ نہیں۔ راؤ اور کچھ نہیں بولا۔ اُس سے اور کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ اُس نے کُندا کو اگلے دن یا اُس سے اگلے دن اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت بھی نہیں دی اُس نے ٹھیک طرح سے اُسکی طرف دیکھا ہی نہیں۔ اُسکا بدن کانپتا رہا۔ اُسکے دل کی دھڑکن تیز ہوتی رہی۔ اُسکی آواز لرزتی رہی۔ وہ واپس آگیا۔ اب اُسکے ماتھے پر پسینہ ہے۔ اُسکا چہرہ لال ہے۔ اُسکے لب خشک ہیں اور اُن پر ایک شکستہ سی مُسکراہٹ ہے۔ اُسکا جسم گرم ہے۔

بھئی اس سارے قصّے کا مطلب کیا ہے۔ آخر تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی مرکز پر اُسی زمین کو گھسے جا رہے ہو۔

میں کچھ نہیں ثابت کرنا چاہتا۔ ہم سب یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم سب ایک ہی لڑکی کو کافی ہاؤس کے اندر آتا دیکھتے ہیں لیکن اسی حقیقت کی بنا پر ہمارے زاویۂ نظر مختلف ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے مجھے کافی ہاؤس پسند ہے۔ یہیں نہ صرف خوبصورت لڑکیاں ہی آتی ہیں۔ بلکہ اُنکا یہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے۔ مجھے اُسکا تجزیہ کرنے کا بھی موقعہ ملتا ہے۔ وینکٹ، گوپال، راؤ اور میں، ہم سب صرف ایک ایک شخص نہیں، ہم نمونے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک سماج کے کسی خاص طبقے کے نقطہ نظر کی نمایندگی کرتا ہے، وینکٹ تاجر ہے۔ ۵۰ سال ہوئے وہ تیس روپے ماہوار پر ایک دفتر میں ٹائپ کرنے کے کام پر ملازم تھا۔ آج وہ اپنا مالک

آپ بمبئی میں اشتہار بازی کی ایک مشہور کمپنی اُسکے ہاتھ میں ہے۔ مہینے میں دس ہزار کی آمدنی اُسکے لئے معمولی بات ہے۔ ۳۰ روپیہ ماہوار سے ۱۰ ہزار روپیہ ماہوار اور ۵ سال کا عرصہ ۳۰ سے ۵۰ ہوئے ہونگے۔ ۵۰ سے ۱۰۰، ۱۰۰ سے ہزار۔ قدم قدم پر وینکٹ نے سوچا ہوگا کہ اور زیادہ پیسے بنانے کا کونسا طریقہ ہے۔ اُسکا جو تخیل تھا جو دماغ تھا اُنکو اُس نے اپنے پر قابو نہیں پانے دیا بلکہ اُنکو اپنا خدمتگار بنا کر رکھا۔ وہ زندگی کی مادی صلیبوں سے ہم آہنگ ہوگیا ہے۔ اُسکے لئے راگیوں کا راگ، شاعروں کی شاعری، مصوروں کے شاہکار، جبلی لوگوں کے ڈھیلے دماغوں کا نتیجہ ہیں۔ جو بذاتِ خود تو کوئی خوبصورت چیز نہیں صرف اُس جیسے ٹھوس آدمیوں کا بیکار وقت میں دل بہلانے کا ایک ذریعہ ہیں وینکٹ چیز کو دیکھتے ہی اُسکی اپنی زندگی میں وقعت کو پہچان لیتا ہے، وہ کسی قسم کی غیر مادی رنگینیوں کو اپنی آنکھوں پر پردہ نہیں ڈالنے دیتا۔ اُس نے عورت کی ہستی کا بھی نچوڑ نکالکر رکھدیا ہے۔ اُسکے لئے عورت گوشت کا ایک دلکش تودہ ہے جسکے جسم کے اُتار چڑھاؤ سے جسکی شخصیت کے مخصوص انداز اظہار سے دل میں ایک دلچسپ سنسنی پیدا ہوتی ہے۔ اُس گوشت کے دلکش تودے کو چھونے کو جی چاہتا ہے۔ یہ بس آدمی کے جسم میں ایک طوفان اور دماغ میں ایک ہیجان پیدا کر دیتا ہے، ایک طوفان جس سے آنکھیں چمکنے لگتی ہیں، نتھنے پھولنے لگتے ہیں، جسم سے آگ کے شرارے چھوٹنے لگتے ہیں، ایک ہیجان جس میں دنیا کی سُدھ بُدھ کھو جاتی ہے جسمیں قوس قزح کی رنگینی بجلیوں کی کڑک، بھونچالوں کے دھچکے، سب کچھ خلط ملط ہوکر شامل ہیں۔ اور پھر آدمی اُس گوشت کے تودے کو بازوؤں میں بھینچتا ہے اور اپنا بناتا ہے، اور پھر اُس عورت کی اُس گوشت کے دلکش تودے کی نوعیت ختم ہوجاتی ہے اور وہ اصلیت کا پیروکار پھر اپنے

اصل اور ٹھوس کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے۔ ونیکٹ کیلئے عورت کی خوبصورتی کی تعریف بھی وہی ہے جو شاعروں کی شاعری کی یعنی بیکار وقت میں دل بہلانے کا ذریعہ۔

کیوں وینکٹ، ٹھیک ہے نا؟ تمہارے لئے عورت کی خوبصورتی کو پرکھنے کی کسوٹی اُس تک رسائی کا امکان ہے جسکو نہیں پایا جا سکتا نہیں خریدا جا سکتا۔ (میرا مطلب ضروری طور پر پیسوں سے نہیں) وہی زیادہ خوبصورت ہے لیکن اُسکے پانے کی ناکام آرزو میں تم اپنا وقت کھونے والے نہیں۔ وہ گوپال ایسے خوبصورتی کے پجاریوں کے اپنا وقت اور دماغ ضائع کرنے کے ذریعے ہیں۔ تم تو "نو نقد نہ تیرہ اُدھار" پر یقین رکھتے ہو۔ جو مل گئی جیسی مل گئی، جہاں مل گئی، اگر آسانی سے مل گئی تو وہی بھلی گوپال، تم مُسکرانا چھوڑو گے؟ تم نے بھی کبھی اپنے آپکا تجزیہ کرنیکی کوشش کی ہے؟ تم اپنے آپکو دوسروں سے بہت مختلف سمجھتے ہو۔ لاکھوں میں ایک، عام آدمیوں سے بہت اُونچے، بہت پرے۔ اگر میری مُسکراہٹ بھی اتنی معنی خیز ہو سکتی جتنی کہ تمہاری (اگرچہ زیادہ پائپ پینے سے تمہارے دانت زرد ہو گئے ہیں) تو میں تمہارے بھولے پن پر ضرور مُسکرا دیتا۔ کہ باقی سب کو ٹھیک سمجھنے والے تم اپنے آپکو ٹھیک نہیں سمجھ سکے۔ تم لاکھوں میں ایک نہیں ہو، لاکھوں جیسے ایک ہو۔ تم بھی سماج کے ایک مخصوص فرقے کے اتنے ہی نمائندہ نمونے ہو جتنا کہ وینکٹ۔ تمہاری قسمت میں بھٹکنا لکھا ہے۔ تم ذہنی تسکین سے ہمیشہ اتنا ہی دُور رہو گے، جتنا کہ اب ہو۔ تم کبھی برازیل جانے کی سوچتے ہو کبھی نیوزی لینڈ لیکن اگر تم سائبیریا بھی چلے جاؤ تو وہاں پہنچکر تم اُس سے بھی پرے جانا چاہو گے۔ تم تصور کو حقیقت میں بدلنا چاہتے ہو۔ تخیل کو اصلیت سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہو لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ تصور اور حقیقت دو

مختلف چیزیں ہیں۔ اگر تم تصور کو حقیقت کا جامہ پہناؤ گے تو تمھیں نا اُمیدی ہوگی کیونکہ تصور حقیقت بنکر حقیقت کی طرح ہی غیر دلچسپ ہو جائیگا۔ تم آسمان کو چھونے کے منصوبے باندھتے ہو لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ تم اگر اُڑ کر آسمان تک پہنچ گئے تو آسمان بھی سوائے پانی اور ہوا کے اور کچھ نہیں ہوگا، اور آسمان کے پرے تمھیں ایک اور آسمان نظر آئیگا۔ آخر سراب کے سہارے نخلستان کی تلاش میں کبتک ریگستانی صحرا نوردی کرتے رہو گے یا تو ٹیکٹ کی طرح تخیل کو حقیقت کا غلام بنالو اور سمجھ لو کہ اصلیت تخیل کی آخری عملی منزل ہے، یا پھر یہ جان لو کہ اصلیت تصور کی پہلی سیڑھی ہے جسکی آخری سیڑھی پہنچ سے بہت پرے ہے لیکن خیر چھوڑو، تم تو خوبصورتی کو پکڑ لینا چاہتے ہو۔ مرمریں باہوں پر سر رکھ کر سونا چاہتے ہو۔ نرم، لمبے بالوں سے کھیلنا چاہتے ہو۔ شدت جذبہ سے کانپتی ٹھوڑی کو ہاتھوں میں لیکر اُسکی چمکتی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا چاہتے ہو۔ سُرخ، بھورے نمدار ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کرنا چاہتے ہو، یہ سب کچھ ممکن ہے اور تم یہ سب کچھ کرتے ہو لیکن یہ کرتے ہی تم اُس دوشیزہ سے دُور ہونے لگتے ہو۔ تمھارا ذہن کہتا ہے اِن مرمریں باہوں سے بھی زیادہ مرمریں باہیں ہوسکتی ہیں۔ ان بالوں سے بھی زیادہ مرمری باہیں ہوسکتی ہیں۔ ان بالوں سے بھی زیادہ خوبصورت لمبے بال ہوسکتے ہیں، اِن آنکھوں سے بھی زیادہ خوبصورت آنکھیں، ان ہونٹوں سے بھی زیادہ بھرے ہوئے ہونٹ۔ اور تب تم اِس نئی دوشیزہ کی تلاش میں کھو جاتے ہو۔ اور جب وہ ملجائے تو تمھیں پھر محسوس ہونے لگتا ہے کہ اِس سے پرے اِس سے بھی زیادہ خوبصورت ایک اور دوشیزہ ہے اور تم اپنی اِس جُستجوئے تسکین کو کچھ پُر اُمید بنانے کیلئے شراب کا سہارا لینے لگے ہو۔ تمھاری دوپہر کافی ہاؤس میں کٹتی ہے لیکن شام کو تمھارا بسیرا میخانے

میں ہوتا ہے، میرا مطلب ساقی اور جام والے میخانے سے نہیں بلکہ ڈنشا ڈنشا اینڈ کمپنی کی شراب کی دُکان سے ہے جہاں نہ ساقی ہے نہ جام، صرف تمھارے اشاروں پر ناچنے والا بیرا ہے جو بہ حیثیت ایک مرد تمھاری خوبی کو اُسوقت پرکھتا ہے جب تم "وائٹ ہاؤس" "وسکی یا ٹو ایکسز" رم پی کر اسکو انعام دینے لگتے ہو۔ پی کر کچھ نا اُمیدی کم ہوتی ہے، کچھ سکون ملتا ہے، کچھ اُمید بندھتی ہے کہ اب جو لڑکی ملیگی وہ خوبصورتی کا مکمل مجسمہ ہوگی۔ اور دل کو ڈھارس بندھتی ہے کہ اب تمھاری جُستجوئے تسکین کی آخری منزل قریب ہے۔ پر دوست، اتنی لڑکیوں سے ہم صحبت ہونیکے بعد بھی تم ابھی تک تلاشِ حُسن میں سرگرداں ہو تمھارا علاج ڈنشا ڈنشا اینڈ کمپنی کا شرابخانہ ہی ہے یا وہاں سے جھومتے نکلنے کے بعد کسی سڑک کا کنارہ ــــ

رُک جاؤ رُک جاؤ۔ اپنے اس نفسیاتی تجزیہ کو ذرا دم لینے دو۔ راؤ کی خوبصورت دوست نے سر اور ہاتھ کی ایک ہم آہنگ جُنبش سے بالوں کی ایک چوٹی کو پیچھے پیٹھ پر ڈالدیا ہے۔ اب وہ اپنی سہیلی سے کچھ کہہ رہی ہے۔ شاید پوچھ رہی ہے کھانے کو کچھ اور تو نہیں چاہیئے؟ اب وہ بائیں ہاتھ سے بیرے کو بل لانے کیلئے اشارہ کر رہی ہے۔ کیوں ونکیٹ، اگر تمھیں کُنداکی سہیلی بلجائے (ذرا سا نولی ضرور ہے) تو کیسی رہے!

گوپال تم اپنی معنی خیز مُسکراہٹ (تمھارے دانت پیلے ہی سہی) کے غیر مرئی ایلچی اُس خوبصورت لڑکی کی طرف نہ بھیجو جسکے گالوں میں بات کرتے وقت چھوٹے چھوٹے ڈمپل گڑھے پڑجاتے ہیں۔ جانتے نہیں راؤ ابھی اُس سے باتیں کرکے آیا ہے۔ راؤ اُسکے باپ کو جانتا ہے راؤ کیا کہنے ہیں تمھاری دلیری کے۔ تم سب خوبصورت لڑکیوں کے باپوں کو جانتے ہو تم اُنمیں سے ہو جو سوال کا حل سوال کو نظر انداز کرنے میں ڈھونڈھتے ہیں۔ تم

ہمیشہ یہی کہتے رہوگے میں رما کے باپ کو جانتا ہوں میں کرشنا کے بھائی کو پہچانتا ہوں کملا کے چچا سے میری واقفیت ہے لیکن میں رما اور کرشنا اور کملا کیلئے "نمستے، نمستے" سے آگے کبھی نہیں بڑھا۔ راؤ تم کبھی آگے بڑھوگے بھی نہیں تم نے تصور اور اصلیت کے درمیان ایک بڑی اونچی دیوار تعمیر کر رکھی ہے تم کئی بار تصور کے پروں پر اڑکر دیوار کے اسطرف جھانکتے ہو جدھر اصلیت ہے اور بھائی کی گہرائی دیکھ کر تمہارا دل کانپ کانپ اٹھتا ہے۔ تم جھانکنے تک سے ڈرتے ہو کودوگے خاک۔ تم عورت کو کوئی مادی وجود دیتے ہوئے ہچکچاتے ہو تمہارے لئے عورت ڈر کی چیز ہے۔ تم اپنی خود اعتمادی کھو بیٹھے ہو تم اپنے سے ہمیشہ یہی سوال پوچھتے رہتے ہو کیا مجھے کوئی عورت پسند کر سکتی ہے؟ اگر میں کسی عورت سے کوئی مذاق کروں تو کیا وہ میرے منہ پر تھپڑ تو نہیں کھینچ مارے گی۔ اور اگر بھولے سے کسی کو مجھ سے عشق ہو بھی گیا تو میرا کوئی دوست اُسے مجھ سے چھین کر تو نہیں لیجائیگا۔ تم دل ہی دل میں لڑکیوں سے ملنے کے ارادے باندھتے رہتے ہو انکو قابو میں رکھنے کے طریقے سوچتے رہتے ہو۔ اپنی کشش بڑھانے کیلئے اپنے انداز بیاں کو اپنے جذبات کے اظہار کو ایک مخصوص ڈھنگ میں ادا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہو لیکن وقت آنے پر ہمت ہار بیٹھتے ہو کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ تم سر سے بدقسمت ہو کیونکہ تمہارے اس ڈر نے تمہیں زندگی کی تھوڑی سی خوشی حاصل کرنے سے بھی روک رکھا ہے۔ وینکٹ کو دیکھو اُسکے مادی نقطہ نظر سے تمہیں اتفاق نہ سہی لیکن زندگی کو خوشگوار بنانے کیلئے کم سے کم اُس نے ایک خاص راستہ تو اختیار کیا ہوا ہے۔ وہ عورت کو ایک مادی چیز سمجھتا ہے خالص مادی چیز شاعروں نے، فلسفیوں نے، ادیبوں نے عورت کے اردگرد جو رنگین غیر مادی اور دلچسپ صفات کا ایک ہالہ سا بنا رکھا ہے اُسکی وینکٹ کے نزدیک کوئی

وقعت نہیں۔ وہ جب ایسی شاعرانہ گفتگو سنتا ہے تو چپکے سے مسکرا دیتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ یہ عورت جسکی بابت اتنی رنگین بیانی کیجارہی ہے اگر میرے بازوؤں میں نہ آئی تو کسی اور مرد کے بازوؤں کی زینت ہوگی۔ وہ خلا ہیں نہیں گھومے گی اور نہ ہی شاعروں کی تمام شاعری اُس دوسرے مرد کو اُس عورت سے وہی فائدہ اُٹھانے سے روکے گی جو میں اُن عورتوں سے اُٹھاتا ہوں جو مجھے مل سکتی ہیں۔ اسیطرح اگرچہ گوپال کی زندگی میں کافی تلخی، کافی ناکامی، کافی محرومی ہے۔ تو بھی وہ اپنے حال میں مست ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو راستہ اُس نے اختیار کر رکھا ہے اُسکا انجام سوائے تلخی اور ناکامی کے اور کچھ نہیں لیکن کم سے کم اُسکا راستہ مُعیّن تو ہے۔ اور جب وہ اُن سنگ میلوں کو دیکھتا ہے جنکی مدد سے وہ اُس راستے پر بڑھتا ہے تو کچھ وقت کیلئے اُسکی زندگی بڑی ہری بھری ہو اُٹھتی ہے۔ اُسمیں پھر بھرے بھرے ہونٹ، اور دلنواز مُسکراہٹیں اور بھرتے گیسو اور چمکتی آنکھیں گھومنے لگتی ہیں لیکن اُسکی شکست اُسکی فتح ہی ہیں پنہاں ہے کیونکہ وہ ہر سنگِ میل کو منزل سمجھنے لگتا ہے، اور جب سنگِ میل پر پہنچتا ہے۔ تو یکایک محسوس کرتا ہے کہ منزل ابھی اور آگے ہے لیکن راؤ تمھاری نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ تم تجربہ شروع ہی نہیں کرتے اسلئے تم اپنی فتح اور شکست دونوں ہی سے ناآشنا ہو۔ تم آدمی نہیں اشتر مُرغ ہو جو ریت میں سر چھپا کر دنیا کی رنگینیوں اور مصیبتوں دونوں ہی سے بے بہرہ ہو جاتا ہے ——

پر بھلے آدمی تم کونسے تیس مارخاں ہو۔ تم نے کونسے قلعے فتح کر لیے ہیں آتی جاتی لڑکیوں کو تم بھی ایسے دیکھتے ہو۔ جیسے مجنوں کے بعد عشق تمہارے ہی در پے ہیں آیا ہے۔

ہاں، عاشق تو ہوں لیکن نہ وینکٹ جیسا، نہ گوپال جیسا۔ راؤ کی طرح بزدل بھی نہیں ہوں۔ میرے لئے عورت نہ تو صرف گوشت کا تودہ ہے۔ اور نہ مجھے یہ خیال ہے کہ اب جس عورت سے میری جان پہچان ہوگی۔ وہ خوبصورتی کا مکمل مجسمہ ہے میں تو عورت کو عورت بھی سمجھتا ہوں اور ایک خوبصورت شے بھی۔ عورت کو عورت سمجھ کر میں نے بھی اُس سے کئی بار ربط بڑھایا ہے لیکن میں نے یہ خیال اپنے آپ پر کبھی غالب نہیں ہونے دیا کہ میں نے اُس عورت کو پاکر خوبصورتی کے مجسمے کو پالیا ہے۔ کافی عرصہ پہلے میں بھی گوپال کی طرح ہر خوبصورت لڑکی کے پیچھے لپکا کرتا تھا لیکن جب میں نے دیکھا کہ اُس خوبصورت شے کو پاکر بھی خوبصورتی کی حرص نہیں جاتی۔ تو میں نے جان لیا کہ کسی چیز کی خوبصورتی اُسکے نہ پانے ہی میں ہے۔ میں نے اپنی نا اُمیدی کو شراب کے گلاس میں غرق نہیں کیا۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ تلاشِ حُسن تو جُستجوئے اُفق ہے۔ اسکی ابتدا مجھ سے ہے۔ اسکی انتہا کوئی نہیں۔ اور اس لئے اب جب میں عورتوں کی خوبصورتی کی تعریف کرتا ہوں تو اسلئے نہیں کہ میں اُنھیں پاسکوں۔ بلکہ اسلئے کہ اس تعریف سے مجھے خوشی ملتی ہے۔ میری تلاشِ حُسن کو شش ملتی ہے۔ مجھے قدرت کی تخلیق کی داد دینے کا موقعہ ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قدرت کی سب سے خوبصورت تخلیق عورت ہے۔ اور اس سے بھی بڑھکر قدرت کی تخلیق مرد ہے جو اس خوبصورتی کی داد دے سکتا ہے۔ کُل کائنات خوبصورت ہے۔ سمندر کا ساحل سے ہمیشہ ٹکراتے رہنا، سوتے ہوئے مکانوں پر چھٹکتی ہوئی چاندنی، زور سے برستی ہوئی بارش کی ٹپ ٹپ، سونے میں ہوا سے ہلتے ہوئے پتوں کی سرسراہٹ کتنی خوبصورتی ہے ان میں، عورت کی خوبصورتی کائنات کی اس خوبصورتی کی زنجیر

ایک اور کڑی ہی تو ہے۔ عورت کا حُسن کتنا متحرک اور نرالا ہے۔ اُسکا رنگ لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ اسی لئے اِس خوبصورتی کی کوئی تھاہ نہیں، کوئی کنارہ نہیں، کوئی منزل نہیں ہیں تو اب عورت سے پیار نہیں کرتا عورت کے اظہارِ حُسن سے پیار کرتا ہوں یا یوں کہو کہ یکبارگی ہی بہت سی عورتوں سے پیار کرتا ہوں۔ کیونکہ کسی ایک عورت کا حُسن مکمل نہیں ہیں عورت کو نہیں پکڑتا اُسکے حُسن کی یاد دل میں رکھ لیتا ہوں۔

اِسی لئے کھوئے کھوئے رہتے ہو شاید!

ہاں، میری زندگی نہ ختم ہونے والا ایک نشہ ہے ہمیشہ تلاشِ حُسن میں سرگرداں رہتا ہوں۔ اِسی لئے چاہوں نہ چاہوں راہ چلتی ہر لڑکی کو دیکھنے کیلئے میری نگاہ بیساختہ اوپر اُٹھ جاتی ہے۔ اگر اُسکی پیٹھ میری طرف ہے تو دل ہی دل میں اُسکے بال بنانے کے انداز کا جائزہ لیتا ہوں۔ جوڑا بنا رکھا ہے اُس نے؟ پنجابی انداز میں؟ گجراتی انداز میں؟ کتنی خوبصورتی ہے گجراتی لڑکیوں کے بال بنانیکے انداز میں۔ ایجنٹا کی تصویروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ بالوں کو کس کر جوڑے کی لپیٹ میں نہیں لے لیتیں۔ گویا اُن سے دُشمنی ہو۔ وہ بالوں کو بھی جسم کا ایک ذی حس حصّہ سمجھتی ہیں اور اس پیار سے جوڑے کی شکل میں گوندھتی ہیں کہ بال اور جوڑا دونوں میں جان ڈال دیتی ہیں۔ اظہارِ خوبصورتی کی کتنی سمجھ ہے انکو۔ بالوں کو گردن کی پُشت تک کچھ ڈھیلا ڈھیلا چھوڑ دیتی ہیں اور جہاں گردن اور کندھے ملتے ہیں وہاں بالوں کو کچھ اِس صفائی سے جوڑے کی شکل میں سمیٹتی ہیں جیسے کوئی سانپ کُنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ اور جب بات کرتے وقت اُنکا سر دائیں بائیں یا آگے پیچھے ہلتا ہے تو گردن کی پُشت پر کا جوڑا اِدھر اُدھر سرکتا ہے۔ اور بذاتِ خود باتیں کرتا معلوم ہوتا ہے۔ یا پھر کوئی ایسی

لڑکی نظر آجاتی ہے جس نے بالوں کی دو چوٹیاں کر رکھی ہیں۔ کتنے لمبے بال ہیں اسکے دونوں چوٹیوں کے سرے کولھوں کو چھو رہے ہیں، ڈھیلا ڈھیلا گونتھا ہے بالوں کو اور سروں کے پاس تو انکو بالکل سرکش ہی رہنے دیا ہے، انکے سرے پیچدار گول نینے سے بنگئے ہیں کتنی شفقت اور محنت سے اس نے بالوں کے سروں کو یوں گول کیا ہوگا یا پھر اگر کوئی ایسی لڑکی سامنے سے آرہی ہو تو اسکی مستانہ چال کو دیکھتا ہوں اس کی پیشانی پر بہکی ہوئی پریشان زلف کو دیکھتا ہوں جسے وہ اپنی انگلیوں کے نازک لمس سے سر پر پیچھے کرتی ہے لیکن جو سرکش بنی اسی تیزی سے پھر پیشانی پر لپک آتی ہے۔ آنکھوں کی مسرت خیز چمک کو دیکھتا ہوں، ہونٹوں پر چھلتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھتا ہوں، ساڑھی کی فنی لپیٹ سے نمایاں تر ہوتے ہوئے جسم کے دلآویز خطوط کو دیکھتا ہوں اور پھر۔۔۔۔

ہاں ہاں اور پھر۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔اور پھر کبھی کبھار کسی کو بلا لیتا ہوں۔

کسی خوبصورتی کی دیوی کو؟ کسی مجسمۂ حسن کو؟

نہیں، خوبصورتی کا خواب میرے دماغ سے باہر کوئی ہستی نہیں رکھتا۔ اصلیت خوبصورت نہیں ہے۔ اسپر خوبصورتی کا خول میں چڑھاتا ہوں۔ خوبصورتی کی مورت میرے تخیل کے رنگین گوشوں سے باہر قدم رکھتے ہی ناپید ہو جاتی ہے۔ میں عورت کو خوبصورت اسلئے کہتا ہوں کیونکہ وہ میری خوبصورتی کی پیاس کو اور بھی بڑھاتی ہے لیکن کوئی بھی عورت میرے خوابوں کی تعبیر نہیں کیونکہ کسی ایک عورت کا حسن مکمل نہیں۔

تو پھر کس کو بُلاتے ہو؟

کسی کو بھی، جو خوبصورتی میرے تخیّل میں ہے اُسکی جھلک۔ صرف جھلک مجھے کسی لڑکی میں مِلجاتی ہے میں اُس جھلک کو وسعت دیتا ہوں۔ قطرے کو سمندر بنالیتا ہوں اور اُسکے خیال میں کھوجاتا ہوں کچھ وقت کیلئے اُسکی اور خامیاں میری نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہیں۔ دل میں یکبارگی ایک طوفان سا اُٹھتا ہے اُس لڑکی سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ حوصلہ کرتا ہوں اور لڑکی کو بُلالیتا ہوں۔

اب سمجھے؟ پچھلے ہفتے جس لڑکی کو کافی ہاؤس میں لئے بیٹھے تھے۔ وہ بھی خوبصورتی کی ایک جھلک تھی۔

ہاں اُس لڑکی سے ملاقات کی بھی ایک کہانی ہے میں پچھلے سال اگست کے مہینے میں پُونا سے بمبئی آرہا تھا۔ گاڑی میں بھیڑ بہت تھی۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبّے میں بھی جگہ بہت مشکل سے ملی۔ ایک کونے میں دبک کر بیٹھنا پڑا۔ اُس کونے میں غسلخانہ تھا۔ غسلخانہ کا دروازہ اچھّیطرح بند نہ ہوتا تھا۔ ہلکی ہلکی بدبو سے دماغ پراگندہ ہورہا تھا۔ سوچا اس ڈبّے میں سے نکل بھاگوں۔ اُٹھنے ہی لگا تھا کہ پرلے کونے میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی پر نظر پڑی۔ وہ کتاب پڑھنے میں مشغول تھی۔ اُسکا سر کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ اُسکے سر کے آدھے بال دُھوپ میں چمک رہے تھے۔ اُس نے بالوں کی دو موٹیاں چوٹیاں کی ہوئی تھیں جو اُسکے دونوں کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اُسکی گود میں جاکر ایک ہوگئی تھیں میرے دماغ میں اُسکے بالوں کی خوبصورتی سرایت کرگئی۔ میں اپنے کونے کی گندی فضا بھول گیا۔ اور لڑکی کیطرف دیکھتا رہا۔ اُسکے بالوں کی خوبصورتی کو اپنے اندر جذب کرتا رہا۔ بالوں پر دھوپ کی چمک سے جو ایک مسرت خیز کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اُسکے لئے تشبیہیں

ڈھونڈتا رہا۔

کچھ دیر بعد لڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے (جو غالباً اُسکا باپ تھا) اُسے کچھ کہا۔ لڑکی نے کتاب پر سے نظر اُٹھائی۔ چاروں طرف دیکھا۔ بالوں کی چوٹیوں پر ہاتھ پھیر کر اُنھیں ہلکے سے دبایا مُسکرائی اور پھر سر جُھکا کر پڑھنے میں مشغول ہوگئی۔ مجھے اُسکی مسکراہٹ بہت بھلی لگی۔ اب جب میں اس واقعے پر غور کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اُس لڑکی کے چہرے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ جسے غیر معمولی کہا جا سکے یا جو خاص جاذبِ نظر ہو لیکن اُسوقت میں اُسکی خوبصورتی کا جائزہ اُسکے بالوں کی خوبصورتی سے لے رہا تھا۔ جو واقعی خوبصورت تھے اور اسلئے اُسوقت مجھے اُسکا چہرہ، اُسکے خدوخال بہت دلآویز معلوم ہوئے میں اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ کب وہ سر اُٹھائے اور مُسکرائے۔

اُنھی دنوں میں ایک رسالے کیلئے ایک کہانی لکھ رہا تھا۔ اس لڑکی کا اُس کہانی سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا لیکن یہ لڑکی میرے دماغ پر کچھ اسطرح چھا گئی تھی۔ کہ بمبئی پہنچکر میں نے اُسکی بالوں کی تعریف میں دو تین صفحے لکھے اور بے محل ہوتے ہوئے بھی اُنکو اُس کہانی میں جڑ دیا۔ وقت پاکر میں اُس لڑکی کو بھول گیا، صرف اُسکے بالوں کی خوبصورتی کی یاد ذہن کے کسی گوشہ میں گھر بنا کر رہ گئی۔

قریباً ایکسال بعد پچھلے ہفتے میں نے اُسی لڑکی کو کافی ہاؤس میں بیٹھے دیکھا وہ ایک لڑکے کیساتھ بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ راؤ اُسدن کافی ہاؤس میں نہ تم تھے، نہ وینکٹ۔ صرف گوپال ایک کونے میں بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ اور کافی ہاؤس میں داخل ہوتی ہوئی لڑکیوں کا جائزہ لے رہا تھا میں بھی گوپال کے پاس بیٹھ گیا۔ کافی پیتے پیتے میں نے کئی بار اُس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اُس لڑکی کی نظریں بھی دو تین بار مجھ پر

پڑیں تھوڑی دیر بعد وہ اور اُسکا ساتھی اُٹھکر چلے گئے اور میں گوپال سے باتیں کرنے میں محو ہوگیا۔

جب میں کافی ہاؤس سے باہر نکلا تو دیکھا کہ وہی لڑکی سامنے بس سٹینڈ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی ہے۔ معاً میں نے سوچا کہ وہ وہاں کھڑی نہ معلوم کبتک بس کا انتظار کرتی رہیگی کیوں نہ اُسے اپنی موٹر میں بٹھا کر اُسکی منزل تک پہنچا دوں۔

بس سٹینڈ پر پہنچکر میں نے موٹر روکدی اور اُسکا دروازہ کھولتے ہوئے لڑکی سے کہا۔ "آپکو کہاں جانا ہے"۔ اُس نے جگہ کا نام بتا دیا۔ میں بھی اُدھر ہی جا رہا تھا۔ نہ جا رہا ہوتا تو بھی ضرور کہدیتا کہ اُدھر ہی جا رہا ہوں۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے میری بغلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اِس جُرأت کیلئے معذرت پیش کرتی ہوئی بولی کہ آجکل بس کیلئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور مجھے آج جلدی گھر پہنچنا ہے۔ میں نے بات چلانے کیلئے کہا۔ "میں آپکو ایکبار پہلے بھی مل چکا ہوں"۔ اور وہ بولی "مجھے بھی کچھ کچھ یاد پڑتا ہے" میں نے کہا۔ "میں یاد دلائے دیتا ہوں۔ پچھلے سال اگست کی بات ہے۔ ریل گاڑی میں پُونا سے بمبئی آتے ہوئے"۔ اور وہ کہنے لگی "ٹھیک ہے۔ اُس ڈبے میں کچھ چینی لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اور بہت شور و غل تھا"۔ اور میں نے کہا۔ "آپ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ اور آپنے اپنے بالوں کی دو چوٹیاں کی ہوئی تھیں۔ اور آپکے بالوں پر سورج چمک رہا تھا جس سے آپکے بال سُنہری معلوم ہو رہے تھے۔ میں اُن بالوں کی خوبصورتی کو دیکھ رہا تھا۔ آپ پڑھنے میں محو تھیں۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ کہ آپکے بال دھوپ میں سُنہری لگتے ہیں۔ آپکی مُسکراہٹ بھی ضرور صبح کی نرم دھوپ کی طرح خوشگوار ہوگی"۔ وہ لڑکی مُسکرائی اور سامنے سڑک کی طرف دیکھتے

ہوئے کہنے لگی "یاد نہیں پڑتا میں اُسوقت کونسی کتاب پڑھ رہی تھی گجراتی کی تھی یا انگریزی کی؟" میں نے کہا "پچھلے سال آپکو دیکھنے کے بعد میں نے آپکا ایک کہانی میں ذکر کیا تھا۔ اور وہ کہانی بڑی مقبول ہوئی۔ یہ سب آپ ہی کیوجہ سے تھا۔ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے" وہ لڑکی صرف مُسکراتی رہی۔ اُسکی منزل قریب آرہی تھی میں نے کہا "اگر آپکو کوئی عذر نہ ہو تو کل کافی ہاؤس میں میرے ساتھ کافی پیجیئے" اور اُسنے جواب دیا "میں وعدہ تو نہیں کرتی کیونکہ عام طور پر ہم چار پانچ سہیلیاں کالج سے چھٹی ملنے پر اکٹھی ہی کہیں چائے پینے بیٹھ جاتی ہیں۔ اور میں اُنکو چھوڑ کر آنہیں سکتی لیکن میں کوشش ضرور کرونگی"

اگلے دن وہ مجھے کافی ہاؤس میں ملی۔ یہ بات تم سب کو معلوم ہے، جب وینکٹ اور راؤ میرے پاس بیٹھنے لگے تھے۔ تو میں نے کہا تھا میں آج اکیلا بیٹھنا چاہتا ہوں مجھے کسی کا انتظار ہے۔ راؤ تم کانپنے لگے تھے۔ اور تم نے اپنے آپکو سنبھالنے کے لئے ایک سگرٹ سلگا لیا تھا۔ اور وینکٹ، تم میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر بولے تھے۔ "ہمیں بھی یاد رکھنا"

وقت مقررہ کے ۵ منٹ بعد وہ لڑکی کافی ہاؤس میں داخل ہوئی دروازے پر رُک کر اپنی گردن کو لمبا کر کے کسی کو ڈھونڈنے لگی۔ اُسکی نظر مجھ پر پڑی اور اُسکے پتلے ہونٹ ایک ہلکے تبسم کے زیر اثر تھوڑے سے کھُل گئے۔ میں نے بیرے کو کافی لانے کیلئے کہا۔ وہ کہنے لگی معاف کیجئے مجھے تھوڑی سی دیر ہوگئی، اور پھر وہ اپنے پتلے ہونٹوں سے مُسکرائی میں نے اُس لڑکی سے پوچھا۔ "آپکا نام کیا ہے"۔ اور وہ بولی "پدما" میں نے کہا "بڑا پیارا نام ہے۔ پدم "کنول" کو کہتے ہیں۔ تم کنول ہو"۔ اُس نے مُسکرا کر جواب دیا۔ پدم کنول کو کہتے ہیں لیکن میرا نام پدما ہے اور پدما لکشمی کو کہتے ہیں۔ مجھے اپنا نام

بالکل پسند نہیں۔ کاش میرا نام اُرملا، یا اُوشا، یا سروولا ہوتا۔" اور میں نے کہا اپنا نام کسی کو اچھا نہیں لگتا لیکن پدما واقعی بڑا پیارا نام ہے۔ وہ چُپ رہی اور اپنے بائیں ہاتھ کے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔ اور میں نے دیکھا کہ اُسکی ہتھیلیوں پر حنا کی صندلی تحریر ہے۔ میں بڑا حیران ہوں کیونکہ میرا خیال تھا کہ آجکل کی پڑھی لکھی لڑکیاں حنا ایسی ویسی آرائشی چیزیں پسند نہیں کرتیں۔ انکی پسند غازہ اور پاؤڈر اور لپ سٹک لیکن پھر میں نے سوچا کہ بمبئی ہے اور بمبئی میں سب کچھ ممکن ہے! اور میں نے کہا "پدما میں نے تمھارے بالوں سے متاثر ہو کر کچھ لکھا تھا۔ سنوگی"۔ وہ بولی "میری پرورش بمبئی میں ہوئی ہے۔ میری زبان اُردو نہیں پھر بھی میں سمجھنے کی کوشش کرونگی"۔ اور میں نے پڑھنا شروع کیا۔ جب میں کہانی میں لڑکی کے بالوں کی تعریف کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ پدما اپنے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے اُس نے اپنے بالوں کی دونوں چوٹیوں کو جو اُسکی پیٹھ پر لٹک رہی تھیں پیار سے پکڑ کر آگے کر لیا ہے اور اب وہ اُسکے کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اُسکی آغوش کو چُوم رہی ہیں اور وہ انھیں پیار سے تھپتھپا رہی ہے! اور اب اُس نے ایک چوٹی کے سرے کو ہاتھوں میں لیکر اُسے کھولڈالا ہے۔ اور اُسے انجانے طور پر پھر گوندھنے لگی ہے۔ اور میں نے کہا کیا کسی اور نے کبھی تمھارے بالوں کی تعریف نہیں کی اور اُس نے چوٹی کے سرے کو شفقت سے گوندھتے ہوئے کہا "معلوم نہیں"۔

جب وہ چلی گئی تو وینکٹ نے پیچھے سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور کہا "آج تو چڑیا کو پھانس لیا"۔ وینکٹ بُرا نہ مانتا۔ اُسوقت میں انتہائی کوشش کے باوجود بھی تمھارے لئے اپنی آنکھوں کی نفرت کو نہ چھپا سکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔ گویا کسی نے پوجا کے پھولوں پر تھوکدیا ہو۔ تم چپکے سے کھسک گئے تھے۔

"پر تمھاری پدما کئی بار کافی ہاؤس میں آتی ہے۔ اُسدن کے بعد تمھیں اُس کے ساتھ ملتے تو نہیں دیکھا۔"

میں پھر اُس سے ملا بھی نہیں ہیں گوپال ہوتا گوپال تمھارے دانت بہت پیلے ہیں۔ (دوست تمبا کو پینا کم کردو) تو پدما سے اگلے دن ملتا اور پھر اُس سے اگلے دن، جبتک کہ اُسکی خوبصورتی سے سیر ہو کر اُس سے مایوس نہ ہو جاتا لیکن مجھے پدما کی خواہش نہیں، اُسکے بالوں کی خوبصورتی درکار ہے۔ اور وہ میں دُور سے دیکھ لیتا ہوں۔

"نزدیک سے شاید اور بھی بہتر ہو۔"

نہیں اُسکے بالوں میں تو جو ہے سو ہے اُنکی اصلی خوبصورتی میرے تخیّل میں ہے اور تصوّر بعد میں ہے۔ قُرب میں حقیقت ہے اور حقیقت میں مایوسی ہے۔

عجیب آدمی ہو۔

ہاں، بہت عجیب ——

اِحسان علی

ممتاز مفتی

صفحات :- ۲۴

کیسی رنگیلی طبیعت تھی احسان علی کی۔ محلے میں کون تھا جو اُنکی باتوں سے محظوظ نہ ہوتا تھا۔ اگر وہ محلے کی ڈیوڑھی میں جا پہنچتے جہاں بُوڑھوں کی محفل لگی ہوتی تو کھانسی کی آوازوں کی بجائے قہقہے گونجنے لگتے۔ چوگان میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے پاس سے گذرتے تو دبی دبی کھی کھی کا شور بلند ہوتا۔ محلے کے کنویں کے پاس جا کھڑے ہوتے تو لڑکوں کے کھیل میں نئی روح دوڑ جاتی۔

جوان لڑکیاں انھیں دیکھ کر گھونگھٹ تلے آنکھوں ہی آنکھوں میں مُسکراتیں اور پھر ایکطرف سے نکلجانے کی کوشش کرتیں۔ ٹٹیار عورتیں دیکھ پاتیں تو اُنکے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے۔ خواہ مخواہ جی چاہتا کہ کوئی بات کریں۔ بُوڑھی عورتیں قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں مثلاً اُس روز احسان علی کو چوگان میں کھڑا دیکھ کر ایک بولی "یہاں کھڑے ہو کسے تاڑ رہے ہو احسان علی؟"۔

"یہ سامنے عورتوں کا جو جھرمٹ لگا ہے۔ نہ جانے کس محلے سے آئی ہیں"۔
دوسری نے دُور کھڑی عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔
"اے ہے اب تو اپنے حمید کیلئے دیکھا کرو"۔ بھابی کہنے لگی۔ "اللہ رکھے جوان ہوگیا ہے"۔
"اور تو کیا اپنے لئے دیکھ رہا ہوں بھابی"۔ احسان علی مُسکرایا۔
اس بات پر ایک معنی خیز طنزیہ قہقہہ بلند ہوا۔ احسان علی ہنسکر بولا۔ "دنیا کسی صورت میں راضی نہیں ہوتی۔ چاچی اپنے لئے دیکھو تو لوگ گھُورتے ہیں کسی کیلئے دیکھو تو طعنہ دیتے ہیں مذاق اُڑاتے ہیں"۔ جواب دینے میں احسان علی کو کمال حاصل تھا۔ ایسا جواب دیتے کہ سُنکر مزہ آجاتا۔ شاداں نے یہ سُنکر چاچی کو اشارہ کیا اور مصنوعی سنجیدگی سے کہنے لگی۔ "چاچی اس عمر میں اوروں کیلئے دیکھنا ہی رہجاتا ہے"۔
احسان علی نے آہ بھری۔ بولے "کاش کہ تم ہی سمجھتیں شاداں"۔
"اتنی عمر ہوچکی ہے چچا تمھیں سمجھ نہ آئی"۔ شاداں مُسکرائی۔
"ابھی دیکھنے کی ہوس نہیں مٹی"۔
"اچھا شاداں ایمان سے کہنا" وہ سنجیدگی سے بولے "کبھی تمھیں میلی آنکھ سے دیکھا ہے؟"۔
"ہائیں چچا" شاداں ہونٹ پر اُنگلی رکھکر بیٹھ گئی "میں تو تمھاری بیٹی کیطرح ہوں"۔
"یہ بھی ٹھیک ہے"۔ وہ ہنسے "جب جوانی ڈھل گئی تو چچا جی سلام کہتی ہوں لیکن جب جوان تھی۔ توبہ جی پاس نہ پھٹکتی تھی کبھی کیوں بھابی جھوٹ کہتا ہوں میں؟"
اس بات پر سب ہنس پڑیں اور احسان علی وہاں سے سرک گئے۔

اُنکے جانیکے بعد بھابی نے کہا "توبہ بہن! احسان علی اور بات کرنیسے چُوکے"
چاچی بولی "ساری عمر تو عورتوں کو ڈانٹنے میں کٹ گئی۔ اب تو باتیں ہی باتیں ہیں"
"لے بہن"۔ شاداں نے مُسکراتے ہوئے کہا "اب کونسا حاجی بن گیا ہے۔ اب
بھی تو عورت کو دیکھ کر مُنہ سے رال ٹپکتی ہے"۔
"لیکن شاداں" بھابی نے کہا "شاباش ہے اسکو کبھی محلے کی لڑکی کو میلی
آنکھ سے نہیں دیکھا"۔
"یہ تو میں مانتی ہوں"۔ شاداں نے اَن جانے میں آہ بھری۔
"یہ صفت بھی کسی کسی میں ہوتی ہے"۔ چاچی نے کہا۔
جب محلّے والیوں کی یہ بات احسان علی نے پہلی بار سُن پائی تو بولے "اتنا
بھروسہ بھی نہ کرنا مجھ پر شاداں"۔
"کیوں" چاچی نے ہنسکر کہا "یہ کیا جھوٹ ہے تمھاری یہ صفت واقعی خوب ہے
میں تو مُنہ پر کہوں گی احسان علی"۔
"لو چاچی یہ صفت نہ ہوتی ان میں تو ہمارے محلّے میں رہنا مشکل ہو جاتا" شاداں بولی
احسان علی کھلکھلا کر ہنس پڑے بولے "چاچی کہتے ہیں ایکدفعہ ایک بلّی کُنویں
میں گر گئی۔ باہر نکلنے کیلئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ پھر بولی آج کی رات یہیں بسر کرینگے"۔
"یہ بلّی کا واقعہ کیا ہوا" چاچی نے مُسکراتے ہوئے پوچھا۔
"ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا" شاداں بولی۔
"بس تو چھوڑ اس بات کو" بھابی نے کہا "احسان علی کی بات کریدنے سے
نکلے گا کیا؟"۔

احسان علی اس دوران میں ہنستے رہے پھر بولے "چاچی یہ میری صفت نہیں یہ تو محلے والیوں کی خوبی ہے بیچاری ایسی بنی ہیں کہ خواہ مخواہ مان بہن کہنے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں شاداں ؟"

"ہائے اللہ سُنا تم نے چاچی ؟" شاداں چلّائی۔

"سمجھی بھی ہو اُسکی بات ؟" بھابی مُسکرائی۔

"سب سمجھتی ہوں" چاچی نے ہنسکر کہا۔

"خدا کا ہزار ہزار شکر ہے" شاداں بولی "کہ محلّے والیاں ایسی ہیں۔ پر میں پوچھتی ہوں چچا اگر محلے میں کوئی ایسی ویسی ہوتی تو کیا واقعی ریجھ جاتے اُس پر ؟"

"تم اُسکی باتیں سُنو" بھابی نے کہا۔

"توبہ کیسی باتیں بناتا رہتا ہے" چاچی ہنسی۔

"کسی محلّے والی پر ریجھتے تو اک بار مزہ چکھا دیتی تمھیں چچا" شاداں آنکھیں چمکا کر بولی "جُوتا دکھا دیتی میاں کو۔ کیوں بھابی ؟"

"واہ" احسان علی مُسکرائے "شاداں جس نے جُوتا دکھا دیا سمجھو بات پکّی کر دی"

"ہائے میں مرگئی" شاداں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔

"احسان علی تجھ پر خدا کی سنوار" چاچی نے ہاتھ چلایا۔ اور احسان علی ہنستے ہنستے آگے نکل گئے۔ اُنکی عادت تھی کہ محفل پر اپنا رنگ جما کر چلے جایا کرتے۔

اگرچہ محلے والیاں اکیلے میں احسان علی کی گذشتہ زندگی پر ناک بھوں چڑھایا کرتیں اور اُنکی فطری کمزوری پر مذاق اُڑاتیں لیکن جب وہ سامنے آجاتے تو نہ جانے کیوں اُنکی آنکھوں میں چمک لہرا جاتی اور وہ خواہ مخواہ ہنس پڑتیں جوان ٹھیاریں تو اب بھی

پلا بچا کر نکلنے کی کوشش کرتیں۔ جب احسان علی جوان تھے اُن دنوں تو کسی عورت کا اُنکے قریب سے گذر جانا بیحد مشکل تھا۔ خواہ مخواہ دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ماتھے پر پسینہ آجاتا۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتی۔ "ہائے میں مرگئی۔ یہ تو اپنا احسان علی ہے"۔ ان دنوں بوڑھی عورتیں بھی مندوش نگاہوں سے گھورتی تھیں۔ محلے کے مرد تو اب بھی نہیں دیکھ کر تیوری چڑھا لیتے۔ البتہ جب وہ کوئی دلچسپ بات کرتے تو وہ ہنسنے لگتے۔ اور یوں ہمکلام ہوتے جیسے اپنی فراخدلی کیوجہ سے اُنکے گذشتہ گناہ معاف کر دیئے ہوں لیکن احسان علی کی غیر حاضری میں اکثر وہ کہا کرتے۔ "بوڑھا ہوگیا ہے لیکن ابھی ہدایت نہیں ہوئی۔ ہدایت تو اللہ میاں کیطرف سے ہوتی ہے جنھیں نہ ہو اُنھیں کبھی نہیں ہوتی۔"

"حرامکاری کی لت کبھی جاتی ہے۔ باباجی"

"ہاں بھئی یہ تو سچ ہے"۔

"دیکھ لو اتنی عمر ہوچکی ہے۔ باتوں میں کوئی فرق آیا ہے؟ وہی چھیڑ خانی ــــ لاحول ولاقوۃ"۔

بات بھی سچی تھی اگرچہ احسان علی پچاس سے زیادہ ہوچکے تھے لیکن وہی مُنڈی ہوئی داڑھی متبسم آنکھیں اور چھیڑ دینے والی باتیں۔ اُنکی روح ویسے ہی جوان تھی۔ بچوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھتے تو وہیں کھڑے ہوکر واہ واہ کرنے لگتے کھلاڑی کو داد دینے لگتے یا امپائر بنکر کھڑے ہوجاتے۔ لڑکے اُنھیں کھیل میں حصہ لینے پر مجبور کرتے۔ تالیاں بجاتے شور مچاتے۔ "چچا جی ہمارے آڑی بنیں گے"۔ "نہیں ہمارے"۔ ایک ہنگامہ برپا ہوجاتا۔ کھڑکیوں سے محلے والیاں جھانکنے لگتیں۔ "لو دیکھ لو احسان علی گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں"۔ چق کی اوٹ میں سے آواز آتی۔ "بھائی جی کیا پھر سے جوان ہونے کا ارادہ ہے"۔

سبز جنگلے سے شاداں سر نکالتی" ابھی تو اللہ رکھے پہلی جوانی ہی ختم نہیں ہوئی" شاہ نشین سے چاچی بولتی "توبہ شاداں تو کبھی کسی رُخ چین لینے نہیں دیتی" شکر کر کہ احسان علی کا دھیان اور کھیلوں سے ہٹا ہے۔ گلی ڈنڈا کھیلنے میں کیا عیب ہے" مسجد سے آتا جاتا کوئی محلے دار انھیں دیکھ کر ہنستا "کبتک اس لڑکیوں لڑکوں کے کھیل میں لگے رہو گے اب خدا کو بھی یاد کر لیا کرو احسان علی ہنس کر گنگناتے "وقت پیری گرگ ظالم میشود پرہیزگار" دوسرا آکر کہتا "دنیا داری کی غلاظت سے اکتائے نہیں ابھی؟ صوم وصلوٰۃ کی پاکیزگی کو کیا جانو" احسان علی کہتے "باباجی غلاظت کا احساس ہو تو پاکیزگی کی آرزو پیدا ہوتی ہے نا تم میں احساس نہیں کیا" باباجی پوچھتے اور وہ جواب دیتے "احساس تو ہے پر غلاظت بھی ہو" اس بات پر کوئی لاحول پڑھ دیتا۔ اور وہ ہنستے "لو بھائی جی اب تو شیطان بھی آگیا اور وہ ہنس مکھ کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

احسان علی کے آنے سے پہلے محلہ کیسا ویران دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ موسم سرما میں دوپہر کے قریب محلے والیاں چوگان میں اکٹھی ہو کر ازار بند بُنا کرتی تھیں۔ دوپہر کے قریب جب چوگان میں دھوپ آتی تو چوکیاں بچھ جاتیں مٹی کی ہنڈیاں رکھدی جاتیں جن میں تیلیوں کے مٹھے بھرے ہوتے۔ بارہ بجے کھانے پینے سے فارغ ہو کر عورتیں وہاں جمع ہونا شروع ہو جاتیں۔ ایک بجے تک اچھا خاصہ میلا لگ جاتا۔ ہاتھ چلتے دھاگے تیلیوں سے پھسلتے ہوئے عجیب آوازیں پیدا کرتے تیلیاں ٹکراتیں ازار بند بنتے ہوئے کسی کی بات چھڑ جاتی۔ گلے ہوتے شکایتیں کی جاتیں۔ ایک دوسرے پر آوازے کسے جاتے مگر قہقہے کی آواز نہ آتی۔

ادھر ڈیوڑھی میں مسئلے مسائل کی بات گرم رہتی۔ شریعت کے احکام بار بار

دہرائے جاتے۔ حدیثوں کے حوالے دیئے جاتے۔ اولیاء کرام کی حکایات سُنائی جاتیں ہنگامہ تو رہتا تھا مگر اسمیں مزاح کی شیرینی نام کو نہ ہوتی۔ عورتوں کے مُسلسل جھگڑوں اور مردوں کی خشک بحثوں کیوجہ سے وہ مسلسل شور محلہ کو اور بھی ویران کر دیتا۔ پھر احسان علی مشن لیکر محلّے میں آ بسے اُنکے آنیکے بعد محلّے کا رنگ بدل گیا۔ جب عورتیں ایکدوسرے کے رگلے شکوے کرنے میں مصروف ہوتیں تو احسان علی آنکلتے اور آتے ہی ایسی بات کرتے کہ سبھی ہنس پڑتیں اور محفل کا رنگ ہی بدلجاتا۔ طعنے اور تمسخر کی جگہ ہنسی مذاق شروع ہوجاتے۔ آپس میں جھگڑتی ہوئی عورتیں ملکر احسان علی کے خلاف محاذ قائم کرلیتیں اور محلّے کے چوگان میں قہقہے گونجنے لگتے محلّے کے بزرگ خشک مسائل چھوڑ کر احسان علی کے چٹکلے سُننے لگتے۔ بات بات پر لاحول پڑھنے والے بڈھے لاحول پڑھنا بھولجاتے لیکن پھر بھی عادت سے مجبور ہوکر کوئی نہ کوئی لاحول پڑھدیتا۔ اس پر احسان علی کھلکھلا کر ہنس پڑتے "بھائی جی کیا آپکو بات بات پر لاحول پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں جبتک شیطان کا خطرہ لاحق نہ ہو لاحول کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔" احسان علی کو لاحول سے چڑ تھی چڑ۔ ہاں تو واقعی احسان علی کے آنے پر محلّے میں ایک نئی روح دوڑ گئی تھی۔

پھر ـــــ ایک روز ایک انوکھا واقعہ ہُوا۔

چوگان میں عورتیں حسبِ معمول جمع تھیں نئی روشنی کے نوجوانوں کی بات چل رہی تھی کہ شاداں نے دُور سے احسان علی کو آتے دیکھ لیا۔ چاچی کو اشارہ کر کے باآواز بلند بولی۔ "چاچی خدا جھوٹ نہ بُلائے۔ آجکل تو چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی چچا احسان علی بنے ہوئے ہیں۔ راہ چلتی لڑکی کو ٹاڑتے ہیں۔"

"ہائے ہائے" چچی نے شاداں کا اشارہ سمجھے بغیر کہا۔ "تم تو خواہ مخواہ اس بیچارے"۔
شاداں نے پھر سے اشارہ دُہرایا۔ جسے دیکھکر چچی کا غصہ مُسکراہٹ میں ڈھل گیا
"آجکل کے مردوں کی کیا پوچھتی ہو چچی"۔ شاداں نے پھر سے بات شروع کی۔
"بال کھچڑی ہو جاتے ہیں۔ پر عورتوں کو تاڑنے کی لت نہیں جاتی"۔
"ہاں شاداں" چچی نے مُنہ بنا کر کہا۔ "زمانہ ہی ایسا آیا ہے"۔
اسکے بعد مجمع پر خاموشی چھا گئی ہر کوئی احسان علی کی بات سُننے کی منتظر تھی
اگرچہ وہ سب یُوں بیٹھ گئی تھیں۔ جیسے اُنھیں احسان علی کے آنے کی خبر ہی نہ ہو۔
احسان علی آئے اور چُپ چاپ اُنکے پاس سے گذر گئے۔
اُنھوں نے اُنھیں جاتے ہوئے دیکھا اور حیران ہو گئیں۔
"اللہ خیر کرے آج احسان علی کو کیا ہوا ہے" چاچی زیرلب بولی۔
"میں تو آپ حیران ہوں"۔ شاداں ہاتھ ملنے لگی۔ "اے ہے احسان علی
اور چُپ چاپ پاس سے گذر جائے"۔
"میں کہتی ہوں ضرور کوئی بات ہے"۔ بھابی نے اُنگلی ہلاتے ہوئے کہا۔
"کہیں گھر سے لڑکر تو نہیں آئے تھے"۔ شاداں نے پوچھا۔
"لو" چاچی نے ہونٹ پر اُنگلی رکھکر کہا۔ "جس روز نواب بی بی سے لڑا اُس روز
تو اور بھی چمکا ہوا ہوتا ہے۔ کیوں بھابی یاد ہے کل کیسے ہنس ہنسکر گھر کی لڑائی کی باتیں سنا رہا تھا"
"ہاں"۔ بھابی مُسکرائی جیسے لڑائی نہ ہوئی تماشہ ہوا۔
"اسکا کیا ہے" چاچی بولی۔ "اسکے لئے تو ہر بات تماشہ ہے۔ چاہے موت کی ہو یا بیاہ کی"
"ہائے چاچی کیسی اچھی طبیعت ہے احسان علی کی کبھی ماتھے پر تیوری نہیں دیکھی۔

ایمان سے رنگیلا ہے رنگیلا۔"

"پر میں کہتی ہوں ضرور آج کوئی بات ہے۔" بھابی ہونٹ پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی۔

شاداں ازار بند لپیٹتے ہوئے بولی۔ "چلو تو چلکر نواب بی بی سے پوچھیں۔"

"اے ہے دو جوتے تو چڑھا لینے دے۔" بھابی نے کہا۔

"ہونہہ دو جوتے، اتنا لوبھ بھی کیا۔" اُسنے اُٹھکر بھابی کے ازار بند کو زبردستی لپیٹ دیا پہلے تو وہ نواب بی بی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں پھر چاچی نے بات چھیڑی کہنے لگی۔ "خیر تو ہے۔ احسان علی کو کیا ہوا ہے آج؟"

"ابھی اچھے بھلے باہر گئے ہیں" نواب بی بی نے جواب دیا۔

"وہ تو ہمنے بھی دیکھا تھا اُسے باہر جاتے ہوئے۔" بھابی نے کہا۔

"میں نے تو بلکہ انھیں چھیڑنے کی خاطر کچھ کہا بھی تھا۔" شاداں بولی۔

"میں نے کہا چلو دوگھڑی کا مذاق ہی رہیگا۔ پر انھیں یوں چپ چاپ دیکھ کر میں تو حیران رہ گئی کہیں یہ ہری بات کا بُرا ہی نہ مان لیا ہو۔ تو بہ میں نے بات ہی کیوں کی۔"

"اُونہوں" نواب بی بی نے کہا۔ "بُرا ماننے والا نہیں وُہ۔"

"کسی فکر میں پڑا تھا۔ جو یوں پاس سے گذر گیا۔" چاچی نے کہا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" نواب بی بی نے کہا۔ "اپنے حمید کا خط آیا ہے آج۔ لڑکے نے اپنی شادی کے بارے میں لکھا ہے۔"

"ہائیں میں مرگئی" شاداں چلائی۔ "آپ اپنی شادی کیلئے لکھا ہے کیا تو بہ کیا زمانہ آیا ہے۔"

"اسمیں حرج ہی کیا ہے۔" چاچی بولی۔ "اللہ رکھے جوان لڑکا ہے۔ آپ کماتا ہے

لکھ دیا تو کونسی قیامت آگئی"۔

"میں جانوں احسان علی کو دیر نہیں کرنی چاہیئے اس بات میں"۔

"اونہوں اُنھیں خیال ہوتا اس بات کا تو یہاں تک نوبت ہی نہ آتی۔ میں تو کب سے کہہ رہی تھی کہ لڑکے کو نامزد کر دو لیکن اُنکے اپنے چاؤ بھی ختم ہوں اتنی عمر ہو چکی ہے لیکن ابھی ہوس نہیں گئی"۔

"نہ بہن" چاچی بولی "مجھ سے تو آپ اُنھوں نے کئی بار کہا ہے کہ چاچی چاچی جہاں لڑکا کہیگا اُسکی شادی کر دینگے۔ اللہ اللہ خیر سلا آجکل یہ کام لڑکے کی مرضی بغیر نہیں ہوتے۔ بات بھی سچی ہے"۔

"یہ باتیں" نواب بی بی بولی "تو اب کیوں سر پیٹ کر باہر نکل گیا ہے لڑکے نے اپنی بیوی تلاش کر لی ہے تو ــــ"

"اپنی بیوی آپ تلاش کر لی ہے؟" شاداں چلائی۔

"سچ؟" بھابی ران پر ہاتھ مار کر بولی۔

"ہاں بھابی" نواب بی بی بولی "پہلے تو اُسے اپنی مرضی کی بیوی تلاش کرنے کی پڑی پڑھاتے رہے اور اب اُس نے اپنی بیوی کا چُناؤ کر لیا ہے تو میاں گرم ہو رہے ہیں"۔

"کون ہے وُہ"؟ چاچی نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم اسکول میں اُستانی ہے۔ لڑکے نے فوٹو بھی بھیجی ہے اُسکی"۔

"ہم بھی تو دیکھیں"۔ شاداں نے منت کی۔

نواب بی بی اُٹھ بیٹھی اور میز کی دراز میں سے فوٹو لے آئی۔

"ہائے چاچی یہ تو میم ہے میم" شاداں خوشی سے پھولی نہ سمائی۔
"اے ہے" چاچی بولی "ایسی ہی تو ہوتی ہیں یہ اسکول والیاں"۔
"توبہ کیسی بنی ٹھنی بیٹھی ہے" بھابی ہنسی۔
"کتنی خوبصورت ہے"۔ شاداں بولی۔ "احسان علی کو ایسی خوبصورت بہو کہاں سے مل سکتی تھی"۔

عین اُسوقت احسان علی آگئے شاداں کی بات سُنکر وہ گھبرا گئے بیٹھک کر کھڑے ہوگئے پھر کمرے سے باہر جانے لگے لیکن شاداں کب چھوڑنے والی تھی انہیں "مبارک ہو چاچا" وہ بولی "نئی بہو مبارک ہو۔ محلے کی لڑکیاں تو تمہیں پسند نہیں تھیں۔ اللہ رکھے لڑکے نے یہ مشکل بھی آسان کردی"۔

ایک ساعت کیلئے احسان علی کا منہ فق ہوگیا لیکن جلد ہی وہ سنبھلکر غصے میں بولے۔ وہ تو بیوقوف ہے بیوقوف اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ خوبصورت لڑکیاں دیکھنے کیلئے ہوتی ہیں بیاہنے کیلئے نہیں۔ بھلا دیکھو تو اس لڑکی کا اس گھر میں گذارہ ہوسکتا ہے کیا؟"

"کیوں اسکو کیا ہے"۔ شاداں بولی "دیکھو تو کتنی خوبصورت ہے"۔
"یہی تو مصیبت ہے" وہ سر کھجلاتے ہوئے بولے۔
"آپ جو ساری عمر خوبصورت لڑکیوں کے پیچھے پیچھے پھرتے رہے ہو احسان علی۔ اب کیا لڑکے کا جی نہیں چاہتا۔ بھابی بولی۔
"پیچھے پیچھے ہی پھرتا رہا ہوں نا بیاہ کر تو نہیں لایا کسی کو۔ یہ دیکھ لو۔ یہ حمید کی ماں بیٹھی ہے"۔ وہ جوش میں بولے۔ "دیکھ لو کیا ناک نقشہ ہے"۔

"کیوں نواب بی بی کو کیا ہے" چاچی ہنسی۔

"میں کب کہتا ہوں کہ کچھ ہے۔ اگر کچھ ہوتا تو کیا میرے چوٹھے پر بیٹھ کر برتن مانجھتی رہتی؟"

آخر حمید کا بھی تو جی چاہتا ہے کہ خوبصورت لڑکی ہو آخر حرج ہی کیا ہے" شاداں مسکرائی۔

"میں کب کہتا ہوں کہ جی نہ چاہے لیکن چاچی یہ تیتریاں تو یارانہ لگانے کیلئے ہوتی ہیں۔ بیاہنے کیلئے نہیں"۔

"ہائیں" شاداں نے ناک پر انگلی رکھلی" احسان علی تم نے تو حد کر دی"۔

"کوئی محلے کی بیاہ لیتا پھر چاہے جہاں مرضی ہوتی یارانے لگاتا پھرتا ــــ" احسان علی اپنی ہی دُھن میں کہے گئے۔

"توبہ میری احسان علی تم تو بات کہتے ہوئے کسی کا لحاظ نہیں کرتے"۔ چاچی بولی

"لو اسے دیکھو نا ذرا" احسان علی نے پھر تصویر اُنکے سامنے رکھدی "یہ آنکھیں راہ چلتے کو روکتی ہیں یا نہیں۔ توبہ آنکھ بھر کے دیکھا نہیں جاتا"۔

"اے ہے دیکھا کیوں نہیں جاتا بھلی اچھی تو ہے"۔ شاداں مسکرائی۔

"مرد کی آنکھ سے دیکھو تو معلوم ہو نا" احسان علی ٹکٹکی باندھکر اُسے دیکھنے لگے

"اپنی بہو کے بارے میں کہہ رہے ہو" چاچی ہنسی۔

"بہو تو جب بنے گی تب دیکھا جائیگا۔ چاچی ویسے بات کر رہا ہوں آخر مجھے بھی تو اسی گھر میں رہنا ہے" وہ مسکرائے۔

اس بات پر نواب بی بی کی بھی ہنسی نکل گئی بولی" انکی تو عادت ہی ایسی ہے جو

مُنہ میں آیا کہدیا۔"

اُنکے چلے جانیکے بعد احسان علی پھر اُسی طرح گُم سُم ہوگئے۔ حمید کی ماں نے کئی بار بات چھیڑنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے خیالات میں گُم تھے۔ دفعتاً وہ اُٹھ بیٹھے "حمید کی ماں مجھے آپ جاکر اُس سے ملنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ معاملہ ہاتھ سے نکلجائے سُوٹ کیس میں دو جوڑے رکھدے میں صبح پہلی گاڑی سے ہی چلا جاؤں۔"

حمید کے پاس پہنچکر پہلے تو اُنھوں نے باتوں ہی باتوں میں اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ چُٹکلے سُنائے۔ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کو پیش کرنے کیلئے آپ بیتیاں بیان کیں لیکن جب حمید نے کسی بات کا جواب نہ دیا تو وہ دلیلوں پر اُتر آئے لیکن اسپر بھی حمید خاموش رہا تو اُنھوں نے اُسے دھمکانا شروع کردیا۔ جلد ہی دھمکیوں نے منّتوں کی شکل اختیار کرلی۔ اسپر حمید بولا "آباجی میں مجبور ہوں میں نسرین سے بیاہ کرنے پر مجبور ہوں۔" اسوقت احسان علی کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی ڈوبتا سہارا لینے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ دفعتاً وہ پھر جلال میں آگئے بولے "اچھا بیشک بیاہ لاؤ اُسے لیکن وہ ہمارے یہاں کبھی نہ آئیگی کبھی نہیں ہم اس سے کبھی نہیں ملیں گے۔" اسپر حمید اُٹھ بیٹھا بولا "آپکی مرضی۔" "لیکن اس لڑکی کو بیاہنے پر تم اس قدر مُصر کیوں ہو؟" اُنھوں نے پوچھا۔ "میں مجبور ہوں آباجی۔" حمید نے کہا۔ "ہماری شادی ہوچکی ہے۔" "ہوچکی ہے؟" وہ دھڑام سے صوفے پر گر گئے۔ "ہوچکی ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" "یہ حقیقت ہے۔" حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس بات کو ایک ہفتہ ہوچکا ہے۔" "ایک ہفتہ؟" اُنھوں نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ "یہ بات ہے تو پھر جھگڑا ہی کیا" وہ دفعتاً ہنس پڑے لیکن اُنکی ہنسی بیحد کھسیانی تھی۔

حمید اُٹھ بیٹھا اور ساتھ والے دروازے کو کھٹکھٹانے لگا۔ "ایں!" احسان علی نے حیرانی سے اُسکی طرف دیکھا۔ "تم تو کہتے تھے۔ یہ کمرہ پڑوسیوں سے متعلق ہے۔" "اور کیا کہتا آباجی" حمید مُسکرایا اور پھر آواز بلند بولا۔ "نسرین آجاؤ۔ آباتم سے ملنا چاہتے ہیں۔" "اوہ" احسان علی کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ "تو یہ بات ہے۔"

نسرین بڑے پُروقار انداز سے کمرے میں داخل ہوئی۔ "سلام عرض کرتی ہوں۔" سُریلی آواز کمرے میں گونجی دو ایک ساعت کیلئے وہ سامنے ٹنگی ہوئی تصویر کو گھورتے رہے۔ پھر دفعتاً اُنھیں احساس ہوا کہ اُنھیں جواب میں کچھ کہنا چاہیئے۔ "بیٹھیئے تشریف رکھیئے۔ وہ گھبرا کر بولے۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ وہ اُسی صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی ہے۔ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے! اب کیا ہو سکتا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں جو ہونا تھا ہو چکا فضول۔ "ہاں بھئی"۔ وہ حمید سے مخاطب ہوئے۔ "تم انھیں محلے میں لاؤ نا تمھیں وہاں آنا ہی پڑیگا۔ تمھاری ماں تمھاری راہ دیکھ رہی ہے۔" "سچ" "کیا واقعی آپ چاہتے ہیں کہ ہم گھر آئیں؟" "اور تو کیا مذاق کر رہا ہوں میں تمھیں چھٹی لینی چاہیئے۔ ہاں۔" "چھٹی تو میں نے پہلے ہی سے لے رکھی ہے۔" حمید مُسکرایا۔ "تو پھر یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیا حماقت ہے" اُنھوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "کل ہی پہنچ جاؤ وہاں۔ اچھا میں اب جاتا ہوں نسرین کو ساتھ لانا۔ سمجھے؟"

جسوقت حمید اور نسرین محلے میں داخل ہوئے وہ سب چوگان میں تھیں۔ نسرین نے کالا ریشمیں برقعہ اُتارا۔ ایک ساعت کیلئے وہ جھجک گئیں ـــــ رسمی سلام ہوئے۔ دعائیں دی گئیں۔ سر پہ ہاتھ پھیرے گئے۔ جب دُلھن اپنے گھر چلی گئی تو نکتہ چینی ہونے لگی۔ ایک بولی "لے بہن دُلھن کا ہمارے ساتھ کیا میل"۔ شاداں بولی

"کیوں ہم کیا کم ہیں کسی سے" تیسری نے کہا۔ "مُنہ پر اللہ مارا پوڈر دودو اُنگل چڑھا ہوا ہے"۔ چوتھی نے کہا "ویسے تو چودھویں کا چاند ہے"۔ احسان علی کا گھر تو منور ہو گیا۔ "ہاں بہن"۔ شاداں نے آہ بھر کر کہا۔ "اُسے محلّے والیاں پسند نہ تھیں"۔ شاداں نے سر اُٹھایا تو سامنے احسان علی کھڑے تھے۔ بھابی بولی۔ "سُنا احسان علی شاداں کیا کہہ رہی ہے"۔ "لاحول ولاقوۃ"۔ احسان علی کے مُنہ سے بیساختہ نکل گیا۔ شاداں کب چھوڑنے والی تھی انھیں بولی۔ "لو چاچی آج تو چچا کے مُنہ سے بھی لاحول سُن لیا۔ احسان علی کو دفعتاً اسکا احساس ہوا تو لگے سر کنے وہاں سے۔ شاداں نے بڑھکر ہاتھ سے پکڑ لیا۔ بولی "اب کہاں جاتے ہو میں تو گن گن کے بدلے لونگی۔ چاچی ہنسی، بولی "کیسی مبارک مُنہ سے آئی ہے کہ احسان علی کے مُنہ سے عربی کے لفظ نکلے"۔ "پر چاچی" شاداں چلّائی — "اُن سے بھلا پوچھو تو آج لاحول پڑھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے انھیں" "اے ہے شاداں" بھابی بولی "کیا کہہ رہی ہے تو؟ "ٹھیک تو کہہ رہی ہوں"۔ شاداں چمکی "اُس روز میں نے لاحول پڑھا تو احسان علی نے کسقدر شرمندہ کیا تھا۔ مجھے کہنے لگے جب لاحول پڑھا جائے تو شیطان کچھ دُور نہیں ہوتا" "اب تُو اُسے جانے بھی دیگی یا نہیں" چاچی چڑکر کہنے لگی۔ "گھر بہو آئی ہے اور تو نے اُسے یہاں پکڑ رکھا ہے"۔

اسی شام کو جب دُولھا دُلھن اپنے کمرے میں چلے گئے تو شاداں نے حسبِ معمول ازراہِ مذاق چچا سے کہا۔ "خیر سے دُلھن گھر میں آئی ہے تمھیں تو شکرانہ کے نفل ادا کرنے چاہئیں احسان علی"۔ جب کبھی شاداں انھیں مذاق سے نفل یا نماز ادا کرنے کو کہا کرتی تو احسان علی جواب میں کوئی نہ کوئی فقرہ چُست کر دیا کرتے لیکن اس روز وہ بولے۔ "سچ — اچھا شاداں تو بھی کیا کہیگی کہ چچا نے کبھی میری بات نہیں مانی۔

آج تو تیری بات پوری ہی کر دیتے ہیں"۔ یہ کہکر وہ حمام کے پاس جا بیٹھے اور وضو کرنے لگے۔ پہلے تو سمجھتی رہی کہ مذاق کر رہے ہیں لیکن جب وہ جائے نماز پر کھڑے ہو گئے تو شاداں حیران رہ گئی۔

اگلے روز تمام محلے میں بات مشہور ہو چکی تھی کہ احسان علی نے نفل پڑھے۔

"سچ" چچی بولی۔

"کیا واقعی" بھابی نے دونوں ہاتھوں سے سینہ سنبھال لیا ــــ "نہیں نہیں میں نہیں مانتی"۔

"تمہاری قسم" شاداں نے ہاتھ چلا کر کہا۔

"مبارک قدم ہو دُلھن کا" چاچی بولی "کہ احسان علی مصلے پر کھڑے ہوئے"۔

محلّے کی ڈیوڑھی تک بات پہنچی تو اس پر بحث ہونے لگی۔

"اجی ہر بات کیلئے وقت مقرر ہے"۔

"میں کہتا ہوں شکر کرو کہ اس نٹ کھٹ نے سجدہ کیا"۔

"آخر کب تک نہ کرتا سجدہ"

احسان علی کو آتے دیکھ کر ایک بولا "آخر آ گئے نا راہِ راست پر"۔

"ہاں بھئی اب تو چھُپ چھُپ کے نفل پڑھے جاتے ہیں"۔

"احسان علی تو کہا کرتا تھا جب غلاظت کا احساس ہو تو ــــ"

"آ گئے نا عورتوں کی باتوں میں"۔ احسان علی نے ہنسنے کی کوشش کی "کون ہے باباجی جو عورت کی بات میں نہیں آتا۔ سب مجھ سے ہیں"۔

"لیکن اسمیں بُرا کیا ہے" باباجی نے کہا "ہمیں تو بلکہ خوشی ہے کہ تم نے سجدہ کیا"۔

دو دن تو احسان علی کے گھر میں ہنگامہ رہا۔ عورتیں آتی جاتی رہیں محلے کی کمین میراثی ڈوم اور بھانڈ بدھائی دینے کیلئے آموجود ہوئے پھر تیسرے دن جب انھیں فراغت ہوئی تو نواب بی بی نے کہا۔ "اب کیا دُلھن کیلئے چار ایک جوڑوں کا انتظام بھی نہ کروگے۔ اور محلے والے، انھیں تو ولیمہ کی دعوت دینی ہوگی"۔

پہلے تو احسان علی شہر جاکر چیزیں خریدنے کیلئے تیار نہ تھے پھر جب انھوں نے دیکھا کہ نواب بی بی کیساتھ حمید جانے کو تیار ہوگیا ہے تو وہ گھبرا گئے۔ بولے "حمید کا جانا ٹھیک نہیں۔ دولھا کو دُلھن سے علیحدہ کرنا مناسب نہیں"۔

"تو پھر میرے ساتھ کون جائیگا؟" نواب بی بی نے چڑکر پوچھا۔

"تو میں ہی چلا جاتا ہوں"، وہ بولے۔

اس بات پر حمید کہنے لگا "میرے جانے میں کیا حرج ہے ابّا جی۔ آپ جو گھر میں نسرین اکیلی تو نہ رہیگی"۔

احسان علی نے اصرار کیا تو وہ بولا "آپ جاکر نہ جانے کیا کیا اُٹھا لائیں گے"

"اوہ یہ بات ہے"۔ احسان علی نے اطمینان کا سانس لیا۔ "تو دلھن بھی ساتھ لیجاؤ"

اس بات پر نواب بی بی چلّائی "لے ہے نئی دُلھن کو ساتھ ساتھ لئے پھریں لوگ کیا کہیں گے"۔

احسان علی خاموش ہوگئے اور حمید اپنی والدہ کو ساتھ لیکر دو روز کیلئے شہر چلا گیا۔

پہلے روز تو وہ باہر نکل گئے۔ چوگان میں بیٹھی عورتوں کیساتھ باتیں کرتے رہے پھر ڈیوڑھی میں جا بیٹھے لیکن جلد ہی وہاں بھی نئی دُلھن اور اُنکے نفلوں کی بات چھڑ گئی۔ وہ بہانے بہانے وہاں سے سرک آئے۔ بچّوں نے انھیں گذرتے ہوئے دیکھا اور لگے

شور مچانے۔ ایک ساعت کیلئے وہ حسب معمول وہاں کھڑے رہے پھر دفعتاً کوئی خیال آیا۔ اس کھڑکی کی طرف دیکھا جو نسرین کے کمرے سے اسطرف کھلتی تھی۔ اس خیال پر وہ پھر چوگان میں آکھڑے ہوئے۔ چوگان میں شاداں نے انھیں پکڑ لیا اور لگی مذاق کرنے لیکن اس روز انھیں کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔ بار بار اوپر کھڑکی کی طرف دیکھتے اور پریشان ہو جاتے۔

شام کو جب وہ گھر پہنچے تو نسرین مسکراتی ہوئی انھیں ملی۔ بولی "رات کے لئے کیا بنواؤں؟"۔

"جو تم چاہو"۔ وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ نسرین انھیں کی چارپائی پر بیٹھ گئی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ "اوہ"۔ اُنکے مُنہ سے بیساختہ نکل گیا۔

نسرین چونک پڑی "کیا چاہیئے آپکو؟"

"میں تو بھول ہی گیا"۔ وہ اپنی ہی دُھن میں بولے۔

"کیا؟" نسرین نے پوچھا۔

"کچھ نہیں کچھ نہیں"۔ وہ بڑبڑائے "میرا مطلب ہے"۔ انھیں خود سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اُنکا مطلب کیا ہے اور وہ اسقدر مضطرب کیوں ہیں۔ اُنکی گھبرائی ہوئی نظریں جائے نماز پر جا پڑیں۔ اطمینان کا سانس لیا۔ جیسے ڈوبتے کو سہارا مل گیا ہو "میرا مطلب ہے"۔ وہ بولے "مغرب کی نماز کا وقت تو جا رہا ہے"۔ انھیں وضو کرتے دیکھکر نسرین نے جائے نماز بچھا دی۔ اور آپ اُسکے پاس ہی کرسی پر بیٹھکر سوئیٹر بُننے لگی۔ وضو سے فارغ ہو کر وہ جائے نماز پر آکھڑے ہوئے ابھی نیت باندھنے ہی لگے تھے کہ پیچھے سے خوشبو کا ایک لپٹا آیا۔ مُڑکر دیکھا۔ نسرین بیٹھی کچھ بُن رہی تھی۔ وہ پھر بڑبڑانے لگے۔ میرا مطلب ہے

یعنی ابھی تو وقت ہے۔ کافی وقت ہے ابھی یہ پاس ہی تو مسجد ہے"۔ یہ کہکر اُنھوں نے جُوتا پہنا اور پیشتر اسکے کہ نسرین کچھ کہے، باہر نکل گئے۔ اسکے بعد نُھیں پتہ نہیں کہ کیا ہوا۔ وہ بھاگے بھاگے چوگان سے نکل گئے۔ کھیلتے ہوئے بچّوں کو دیکھے بغیر آگے چلے گئے۔ ڈیوڑھی خالی پڑی تھی۔ وہاں نھُیں ہوش آیا۔ سوچنے لگے۔ پھر نہ جانے وہ مسجد کے دروازے پر کیسے پہنچگئے۔ دروازے میں احسان علی کو دیکھکر محلے والے اُنکی طرف متوجہ ہوگئے۔ ایک بولا: "اُسکو بھُولا نہ جانئے جو صبح گیا گھر واپس آئے شام" دوسرا کہنے لگا: "آخر کبھی نہ کبھی غلاظت کا احساس ہو ہی جاتا ہے"۔ یہ سُنکر معاً وہ مُڑے جیسے وہاں سے بھاگ جانا چاہتے ہوں عین اسوقت باباجی آگئے۔ احسان علی کو پکڑلیا "اگر واپس نہیں جایا کرتے احسان علی"۔ وہ اُنھیں گھسیٹ کر مسجد میں لے آئے اس بات پر اُنھیں اطمینان سا ہوگیا بولے "یہ دیکھو میں تو نہیں آیا لایا جارہا ہوں"۔ "چلو یونہی سہی" باباجی نے کہا۔ تیسرا بولا "آخر کوئی نہ کوئی بہانہ یا وسیلہ بن ہی جاتا ہے نئی بہو کے قدم کو دُعا دو بھئی" چوتھے نے کہا۔ "ورنہ کہاں احسان علی کہاں مسجد" اگر مسجد کا امام وقت تنگ سمجھ کر کھڑا نہ ہو جاتا تو نہ جانے کیا کیا باتیں ہوتیں اسوقت۔

رات کو کھانے کے بعد نسرین نے نھُیں کے کمرے میں اپنا بستر جما دیا۔ اور پھر آپ چارپائی پر بیٹھکر اطمینان سے سوئٹر بُننے لگی حُقّہ پیتے ہوئے وہ کچھ سوچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بار بار نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتیں۔ سامنے فرش پر نسرین کی خوبصورت سُرخ چپلی اُنکی آنکھوں تلے ناچتی۔ کمرہ خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ اُف وہ بار بار اپنی ناک سکیڑتے کیسی واہیات بُو تھی"۔ "ہاں وہ میری کتاب" "وہ آپ ہی آپ کتاب؟" نسرین کی آواز کمرے میں گونجی "میں دیتی ہوں آپکی کتاب"۔

"نہیں نہیں" وہ چلائے "میں خود لے لوں گا" وہ اٹھ بیٹھے لیکن نسرین پہلے ہی الماری تک پہنچ چکی تھی۔

"لاحول ولاقوۃ" بے اختیار اُنکے مُنھ سے نکل گیا۔ دُور ہی رُک گئے جیسے آگے بڑھنے سے ڈرتے ہوں۔ "وہ نیلی وہ بائیں طرف والی" وہ چلائے۔ "وہاں رکھدو" انھوں نے دُور سے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں"۔

اُنکی آنکھوں نے کتاب کے لفظ ناچنے لگے۔ حاشیہ سرک سرک کر دائیں سے بائیں طرف جا پہنچتا اور پھر بائیں سے دائیں چلنا شروع کر دیتا۔ لفظوں کی قطاریں چلنے لگتیں اور پھر دفعتاً ایک جگہ ڈھیر ہو جاتیں۔ دُور محلے والیاں ڈھولک بجا رہی تھیں سامنے نسرین کس انداز میں بیٹھی تھی۔ کیا واہیات طریقے سے بیٹھی ہے اُنھوں نے سوچا کیا نمائشی انداز میں۔ "اوہ" وہ پھر چونکے "کیا پھٹنے نائی کی ماں نہیں آئی" وہ گویا کتاب سے پوچھنے لگے "کوئی کام ہے کیا؟" نسرین نے پوچھا۔ "نہیں نہیں" وہ گھبرا گئے "ویسے وہ سونے کو تو آئیگی نالیاں" "اسکی کیا ضرورت ہے" نسرین بولی "میں جو ہوں"۔ "اوہ" وہ ازسرِنو گھبرا گئے "میں جو ہوں ہیں جو ہوں" دُور محلے والیاں ڈھولک کیتھا گا رہی تھیں۔

"اوہ گیارہ بجگئے"۔ اُنھوں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں"۔ نسرین نے جواب دیا۔ "وقت ہی نہیں گذرتا"۔

"وقت ہی نہیں گذرتا وقت ہی نہیں گذرتا" گھڑی کراہنے لگی۔

وہ اُٹھ بیٹھے اور بیخبری میں حمام کے سامنے بیٹھکر وضو کرنے لگے۔

رات کو وہ گھبرا کر اُٹھے۔ کمرے میں چھوٹی سی بتی جل رہی تھی۔ چاروں طرف عجیب سی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے نسرین سوئی ہوئی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے پاؤں صنائی سے

باہر نکلے ہوئے تھے۔ "چینی چینی" کسی نے تمسخر سے اُنکے کان میں کہا۔ سرہانے پر کالے بالوں کا ڈھیر لگا تھا۔ سرہانے تلے پتلی پتلی اُنگلیاں پڑی تھیں جنپر روغن چمک رہا تھا۔ "فضول" اُنھوں نے مُنہ بنایا۔ اُٹھ بیٹھے اور باہر نکل گئے۔ صحن میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ دُور محلے والیاں گا رہی تھیں ۔۔ بال گوری دے پھیر کالے۔ نہ جانے کیوں اُنھوں نے محسوس کیا جیسے اُنکی زندگی کی تمام تر رنگینی ختم ہو چکی تھی۔

اندر آکر وہ سوچنے لگے "ہوں تو دو بجے ہیں"۔ "وقت گذرتا ہی نہیں"۔ گھڑی چلانے لگی جائے نماز کو دیکھکر اُنھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اُنھوں نے سوچا۔ حمید نے کسقدر فحش غلطی کی ہے بیوقوف اُنھوں نے نسرین کی طرف دیکھکر سوچا۔ اور پھر ان جانے میں جائے نماز پر کھڑے ہو گئے۔ اسوقت انھیں نماز گویا یاد ہی نہ تھی۔ میرے اللہ میرے دل سے آوازیں آرہی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دیں۔ رُکوع کے بغیر وہ سجدے میں گر گئے۔

عین اسوقت شاداں چاچی کیساتھ کوٹھے سے نیچے اُتری۔ "چُپ" شاداں زیرلب بولی۔ "وہ سوچ رہے ہونگے۔ آج تو چچا احسان سے وہ مذاق کر کے رہونگی کہ یاد کریں گے"۔ چاچی ہنس پڑی بولی "تجھے بھی تو ہر سمے شرارتیں ہی سُوجھتی ہیں"۔ "اور وہ کیا لحاظ کرتے ہیں میرا" شاداں نے کہا۔

"ہائیں" اُنھیں سجدے میں پڑے دیکھ کر شاداں نے اپنا سینہ سنبھالا "ہیں مرگئی یہاں تو تہجد ادا کی جا رہی ہے"۔ "نہ جانے بہو نے کیا جادو کر دیا ہے"۔

"سچ" چاچی نے ہونٹ پر اُنگلی رکھ لی۔ "اور یہ دیکھو وطن سوری سے جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو"۔

احسان علی چونک کر اُٹھ بیٹھے۔ اُنکے گال آنسوؤں سے تر تھے۔ "ہائے میرے اللہ"۔ شاداں نے پھر اپنے آپکو سنبھالا۔ احسان علی نے اُنھیں دیکھا تو دفعتاً منھ ڈھیلا پڑ گیا۔ چہرے پر جھریاں چھا گئیں جیسے یک لخت وہ بُوڑھے ہو گئے ہوں۔ "احسان علی"۔ شاداں نے چیخ سی ماری۔

احسان علی نے مُنھ پھیر لیا۔ ایک ہچکی نکل گئی۔ اور وہ سجدے میں گر پڑے۔ اُنھوں نے محسوس کیا گویا چینی کا نازک سا کھلونا ریزہ ریزہ ہو کر ڈھیر ہو گیا ہو۔

عزّت

سرلا دیوی

صفحات :- ۱۰

جہاں اوشا کا بھائی رہتا تھا۔ وہ جگہ شہر سے بالکل الگ تھلگ تھی تیس ہزاری سے کچھ دُور آگے ایک پہاڑی سی تھی۔ اُسکے نیچے کچھ کوارٹرز بنے ہوئے تھے یہ کوارٹرز رائے بہادر موہن لال نے دو دو کمروں کے بنوا کر بے گھر لوگوں پر بڑا احسان کر رکھا تھا۔ کوارٹروں کے بالکل پاس سے ایک سڑک کُتوں کے ہسپتال کو جاتی تھی۔ اگرچہ اُسمیں کُتوں کا نہیں بلکہ جنھیں کتے کاٹتے اُنکا علاج ہوتا تھا۔ کوارٹروں کے بالکل مقابل ایک پتی ستی ہنومان جی کا مندر تھا آس پاس سے یا ان کوارٹروں میں سے کوئی بھی مندر میں آتا جاتا نہیں تھا، حالانکہ ان کوارٹروں میں رہنے والے سب ہندو تھے۔ خدا جانے وہ اس مندر میں کیوں نہیں جاتے تھے لیکن شہر کے بیچ بسنے والے دھنی سیٹھ اکثر وہاں بھینٹ چڑھانے آیا کرتے تھے۔ ہر منگل کے دن خاصہ میلہ سا لگتا تھا، کہتے ہیں کہ مندر کے باوا رام کشن جی بھگوان کو پہنچے ہوئے تھے اور وہ

مُنہ مانگی مُرادیں دیتے تھے۔ خاصکر کہ جن سیٹھ ساہوکاروں کے گھر اولاد نہیں ہوتی تھی اور جنکو اپنا گھر بچے کے بنا مرگھٹ دکھائی دیتا تھا باوا رام کشن جی اُنکی عورتوں کو ایک چُٹکی راکھ کی دیکر سُونے گھروں کو آباد کر دیتا تھا بس ایک چُٹکی راکھ کی ... اس پر بات تو دھرم کی یہ تھی کہ باوا رام کشن دن بھر ہنومان جی کے مندر کے ساتھ والی کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ وہ اکیلے میں عورتوں کا مُنہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ عورت گناہ کی جڑ اور مایا کا روپ ہوتی ہے اسلئے بیچاری عورتوں کو راکھ کی چُٹکی لینے اُس اندھیری کوٹھڑی میں جانا پڑتا تھا۔ نہ باواجی اُنکا مُنہ دیکھیں نہ عورتیں اُنکا۔ قدرت خدا کی کہ چُٹکی میں اتنی کرامت ہوتی تھی کہ سیٹھانیوں کی گودیں پورے نو مہینے کے بعد ایک تندرست بچہ کھیلنے لگتا۔ عورتیں ہاتھ جوڑ کر کہتیں "دھن دھن باوا رام کشن جی سوبر سن جیئیں۔

ہنومان جی کی مُورتی سے زیادہ باوا رام کشن جی کی پوجا ہوتی تھی۔ عورتیں آرتی اُتارتیں قیمتی چڑھاوے چڑھاتیں، باجے گاجے کیساتھ چاندی کے چھپر باوا رام کشن جی کیلئے لیکر آتیں۔ بھجن منڈلیاں باواجی کے گیت گانے بُلائی جاتیں جو گاتی بجاتی کواٹروں کے سامنے سے گذرتی تھیں اسلئے کواٹروں میں رہنے والوں کو کافی دقت محسوس ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت اپنے دروازے بند رکھتے، جو ذرا کھاتے پیتے تھے اُنھوں نے دروازوں پر چقیں لٹکا لی تھیں اور وں نے ٹاٹ کے پردے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سڑک سے یہ گذرتا ہوا ہجوم گھر میں بیٹھی ہوئی اُنکی عورتوں کو دیکھے، دوسرے اُنھیں باوا رام کشن کی انمول چُٹکی کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اُن کی عورتیں آگے ہی بچے دینے میں ایکدوسری کا ریکارڈ توڑنے پر تُلی ہوئی تھیں۔

اوشا کا بھائی انبالے سے تبدیل ہو کر دلّی آیا تھا۔ ایک تو پچاس روپے تنخواہ، اُسپر اتنا بڑا کنبہ۔ روٹی ہی مشکل سے چلتی تھی تو بیچارہ چھتیں کہاں سے لاتا۔ اوشا کی ماں بھی ہر وقت دروازہ بند رکھتی اِس گھُٹے گھُٹے ماحول میں اوشا کا جی گھبراتا لیکن ماں کہتی بیٹی پردیس کا معاملہ ہے، سڑک کے کنارے گھر ہے، جتنا پردہ ہو اُتنا ہی اچھا ہے اوشا خاموش ہو جاتی۔ ان کوارٹروں کے پچھواڑے ایک ایک کمرے کے سنگل کوارٹرز بھی بنے ہوئے تھے۔ وہ بھی ہر وقت چھتوں کے اندر لیٹے لیٹے رہتے۔ اوشا نے سوچا پچھواڑے کی طرف تو کوئی آتا جاتا نہیں، پھر نہ معلوم کیوں ان لوگوں کو اندھیرے میں رہنا پسند ہے۔

کچھ ہی دنوں کے اندر اوشا کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ وہ سوچتی یہ گھر ہے یا جیلخانہ اسکا دل چاہتا کہ ان بند دروازوں کو توڑ ڈالے کسی سے بات کرے، کسی سے کھیلے۔ کبھی کبھی اُسے اپنے بھائی پر بڑا غصہ آتا کہ وہ اُسے کہیں گھُمانے کیوں نہیں لیجاتا لیکن اُسکا بھائی کرتا بھی کیا۔ صبح آٹھ بجے دفتر جاتا اور رات کو دیر سے گھر آتا بے چارے کو کپڑے تک بدلنے کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ پھر بہن کو سیر کیسے کراتا۔

شام کا وقت تھا۔ اوشا کا جی بہت ہی اُداس تھا۔ اُس نے اوڑھنی سنبھالی اور یوں ہی مکان کے پچھواڑے چلی گئی۔ اُسکی حیرانی کا ٹھکانہ نہ رہا جب اُس نے دیکھا کہ ایک کمرے پر سے چق اُٹھی ہوئی تھی اور ایک خوبصورت لڑکی سفید ساڑی پہنے کھڑی نظر آ رہی تھی۔ پھر اُسکی حیرت خوشی میں تبدیل ہو گئی اور اُسکا جی چاہا کہ اُس لڑکی سے بات چیت کرے۔ یوں تو ان کوارٹروں میں بہت سی لڑکیاں رہتی تھیں لیکن نہ معلوم کیوں اوشا کا دل اُن سے گھبراتا تھا۔ وہ لڑکیاں دن بھر یونہی اُوٹ پٹانگ باتیں

کرتی رہتی تھیں لیکن یہ لڑکی اوشا کو اُن سب سے مختلف نظر آئی۔ لڑکی اُسکو دیکھ کے مُسکرائی۔ اوشا بھی مُسکرادی۔ پھر دونوں ایکدوسرے کے نزدیک آگئیں۔

لڑکی بولی "میرا نام ایملی ہے۔ ہم لوگ ابھی پندرہ دن ہوئے اس کوارٹر میں آئے ہیں میں پہاڑ گنج گورنمنٹ سکول میں ٹیچر ہوں"۔

اوشا نے کہا "میں نے پہلے تو آپکو کبھی نہیں دیکھا۔ آپ سکول سے گھر کسوقت لوٹتی ہیں؟"۔

"شام کو چار بجے میرا سکول چھٹتا ہے اور پھر میں ٹیوشن کرنے چلی جاتی ہوں"

"تو پھر آپ رات کو گھر لوٹتی ہونگی؟"

"جی ہاں، کوئی آٹھ بجے کے قریب"۔

اس تھوڑی سی بات چیت سے ہی وہ دونوں ایکدوسرے کے قریب آگئیں۔

ایملی کا رنگ بہت صاف تھا، رخسار گلابی اور جسم گداز۔ اُسکے حُسن میں صبح بنارس کی دلکشی تھی، اور ہونٹوں پر ہر وقت اک مُسکراہٹ کھیلتی تھی۔ اُسکے آنے سے ان کوارٹروں میں بسنے والے نوجوانوں کی تو مانو کایا پلٹ ہوگئی تھی۔ اب چھتوں کے اندر زندگی حرکت کرنے لگی تھی اور چھتیں بھی ہر وقت پڑی نہیں رہتی تھیں۔ ہر نوجوان سلیقے سے کپڑے پہنتا، زور سے قہقہے لگاتا اور ہمیشہ بال سنوار کے گھر سے باہر نکلتا۔ جب وہ صبح پڑھانے سکول جاتی تو اکثر نوجوان اُسکے استقبال کیلئے کھڑے ملتے، آہیں بھرتے، سیٹیاں بجاتے، ایکدوسرے کے گلے میں باہیں ڈالدیتے لیکن ایملی دوسری لڑکیوں کی طرح اُن نوجوانوں کو دیکھ کر جھجکتی نہیں تھی۔ وہ بے نیازی

سے گذر جاتی اس سے اُنکے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ سمجھتے تھے کہ عیسائی لڑکیاں چٹکیاں بجاتے بغل میں آجاتی ہیں۔ وہ چلاّتے "ذات کی عیسائی" اور نخرے دیکھو" اور پھر دھیرے سے کہتے "حرامزادی!"

کوارٹروں میں رہنے والے ہندو بوڑھے اس عیسائی فیملی کے آجانے سے بہت ناخوش تھے۔ اس سے ایکطرف تو اُنھیں اپنے لڑکوں کے بگڑ جانے کا اندیشہ تھا، پھر وہ چھوت چھات کے بڑے قائل تھے۔ انکی عورتیں ہمیشہ ساڑی کو پنڈلی پر سے اُوپر اُٹھا چلتی تھیں کہ کسی ناپاک چیز سے اُنکا دامن نہ چھو جائے چاہے جسم ننگا ہو جائے لیکن چھوت چھات زندہ باد!

ایملی کی ماں بھی کونسی کم تھی۔ وہ خود بھی ہندوؤں، مسلمانوں اور حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ عیسائیوں سے بھی میل ملاپ نہیں رکھتی تھی کسی برادری والے کو اپنے خاندان کا حقہ پینے کو نہیں دیتی تھی۔ اگر کوئی چیز بھولے بھٹکے پڑوس سے آبھی جاتی تو وہ بچوں کو کھانے نہیں دیتی۔ ایک کونے میں رکھدیتی اور جب حلالخور آتا تو اُسے دے دیتی۔ وہ ہر وقت یہ جتانے کی کوشش میں لگی رہتی کہ تم لوگ کون ہوتے ہو پرہیز کرنیوالے، میں خود تم لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتی بات دراصل یہ تھی کہ ایملی کی ماں ذات کی براہمن تھی چھوت چھات پر ایمان رکھنے والی کٹر براہمن۔ بچپن ہی میں وہ ایک براہمن سبھا کی تھی لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جوانی میں ایملی کے باپ پر وہ بُری طرح ریجھ گئی اور براہمنوں کی تاریخی چھوت چھات، ہٹ دھرمی اور نفرت دھری کی دھری رہ گئی اور وہ گھر بار چھوڑ اُس اچھوت کیساتھ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور خود بھی عیسائی بن کے اچھوت ہو گئی تھی۔

آیملی اور آوشا کی آپس میں خوب گہری دوستی ہوگئی جب بھی وقت ملتا وہ سر جوڑ کے بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔ جب سے ایملی نے اوشا کو بتایا تھا کہ آج چھ سال سے نوکری کر کے وہ اپنے ماں باپ کا پیٹ پال رہی ہے تو اوشا کے دل میں اُسکے لیئے بڑی ہمدردی اور قدر پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن محلے والے اُن کی دوستی سے جلنے لگے وہ کہتے کہ آخر ایک عیسائی لڑکی کے ساتھ اتنا اُٹھنا بیٹھنا کیوں۔ بات دراصل یہ تھی کہ ایملی اور کسی سے کبھی بات تک نہ کرتی تھی۔

یُوں ہی کچھ دن بیت گئے محلے والے پہلے سے بھی زیادہ ایملی سے جلنے لگے۔ طرح طرح کی بے تُکی باتیں کر کے اُسے بدنام کرتے پھرتے۔ خاص کر کے ساتھ کی کوٹھی کے جج صاحب تو بہت ہی باتیں بناتے، کیونکہ اُنھیں بڑا دُکھ تھا کہ ایملی اُن کی طرف نگاہ اُٹھا کے کیوں نہیں دیکھتی۔ اُنھوں نے کتنی بار ایملی کو پھُولوں میں لپیٹ کر تحفے بھیجے لیکن ایملی نے ہمیشہ واپس کر دیئے۔ اُس پر ان باتوں کا قطعی اثر نہ پڑتا تھا۔ اُسے وہ اپنی سخت توہین سمجھتے اور اپنے غُصّے کو ایملی کو گندی گندی گالیاں بک کے ٹھنڈا کرتے پھر اُنھوں نے سوچ بچار کر ایک اور راستہ سوچا۔ وہ ایملی کے والد سے تعلقات بڑھانے اُس کے گھر جا کے اُٹھنے بیٹھنے لگے اس طرح وہ آنکھیں بھی سینک لیا کرتے تھے اور اپنی اسکیم بھی سوچتے رہتے۔ لیکن ایملی کو تو جج صاحب کی شکل تک سے گھن آتی تھی۔ چھوٹا سا قد، چیچک کے بدنما داغوں سے بھرا ہوا چہرہ اور چیاں سی آنکھیں جنھیں دیکھتے ہی وہ نفرت سے مُنھ پھیر لیتی۔ اُس کے دل میں تو احمد رضا کے سوا اور کسی کا دھیان بھی نہ آتا تھا۔ احمد جو مردانہ حُسن

کی مُنہ بولتی تصویر لگتا تھا، وہ اُسکا نکلتا ہوا قد، چہرے کے جمیل خدوخال اور شجاعت اور حوصلے سے معمور دل موہ لینے والی آنکھیں!

یکایک کچھ دن بیمار رہ کے ایملی کے والد کا انتقال ہوگیا یوں محلے والوں کے دل میں رہا سہا لحاظ بھی جاتا رہا۔ اب وہ کُھلم کُھلا ایملی سے مذاق کرتے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ احمد سے محبت کرتی ہے تو جیسے اُنکی مردانگی کو ٹھیس پہنچی۔ جج صاحب سب سے زیادہ تلملائے۔ ہندو محلے میں رہنے والی چھوکری اور ایک غیر محلے کے آدمی سے عشق لڑائے! اور وہ بھی مُسلمان سے!! پوچھو کہ بھئی تمھارے محلے میں کیا مردوں کا کال پڑگیا ہے؟

جج صاحب نے اپنی اسکیم کو اب عملی جامہ پہنانے کی ٹھانی۔ آخر شہر کے جج تھے بڑے اثر و رسوخ والے آدمی تھے۔ بھلا یہ کونسی بڑی بات تھی ــــ ایملی اسکول سے نکالدی گئی اُسکا محبوب احمد کچھ دنوں کیلئے اپنے وطن پاکستان گیا ہوا تھا۔ اور اُسکی ماں سخت بیمار تھی۔ ایملی نے آوشا سے ۲۰ روپے اُدھار لئے۔ ماں کیلئے دوا اور گھر کیلئے راشن لائی لیکن یہ سب کتنے دن چلتا۔ جج صاحب کی عنایت اُسکے شامل حال تھی اسلئے کسی دوسری جگہ جلد نوکری ملنے کی اُمید بھی نہ تھی۔ مکان کا کرایہ اور ڈاکٹر کا بل اُسکی جوانی کی طرح قابو سے باہر ہوا جارہا تھا ــــ ایملی کا سر چکرا رہا تھا۔ اُسنے اپنے آدیئے بیچ ڈالے پھر ساڑیاں بیچیں۔ اور آخر گھر میں رکھی ہوئی دو کُرسیاں بھی بیچدیں لیکن حالات نہ سُدھرے۔ ماں کو بیماری نے چھوڑا اور نہ فکروں نے ایملی کو۔

اور آج دو وقت سے ایملی نے کچھ نہ کھایا تھا۔ ماں الگ صاحب فراش تھی۔ اتنے میں جج صاحب آن پہنچے ایملی روپڑی۔ جج صاحب چند نوٹ چھوڑ گئے اور یہ کہہ گئے میں پھر آؤنگا۔ ایملی میٹھی اُن نوٹوں کو تکتی رہی تکتی رہی، بھوک، دوا، محبت ــــ محبت،

دوا اور بھوک ۔۔۔

پھر رات آگئی۔ گہری اور ایملی کے نصیب کی طرح تاریک اور اس میں احمد کی محبت کی کرن اور ایملی کی ماں کا آخری سانس دونوں ڈوب گئے۔

اوشا کے روپے ایملی نے واپس کر دیئے ہیں۔ اب وہ اوشا سے کھڑے کھڑے بھی بات نہیں کرتی بلکہ کہیں نظر بھی آجائے تو ایملی اُس سے نگاہیں چُرا لیتی ہے۔ اوشا اُسکی برہمی کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ اور یہ گتھی اور بھی اُلجھ جاتی ہے جب اوشا دیکھتی ہے کہ اب محلے کا کوئی نوجوان بھی ایملی کے راستے میں کھڑا نہیں ہوتا، کوئی اُسپر آوازہ نہیں کستا۔ کوئی اُسے دیکھ کر سینے پر بات نہیں رکھتا۔ برعکس اسکے اب تمام محلے والے اُسے اسی قدر عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں جتنی کہ جج صاحب کو۔

سردار جی

خواجہ احمد عبّاس

صفحات :- ۲۰

جب دہلی اور نئی دہلی میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم اور مسلمان کا خون سستا ہو گیا تو میں نے سوچا۔ واہ ری قسمت۔ پڑوسی بھی بلا تو سکھ۔ حق ہمسائگی ادا کرنا اور جان بچانا تو کجا نہ جانے کب کرپان بھونک دے۔ بات یہ ہے کہ میں کسی قدر سکھوں سے ڈرتا ہوں۔ کافی نفرت کرتا ہوں اور انکو عجیب الخلقت قسم کا جانور سمجھتا ہوں۔ آج سے نہیں بچپن سے۔ میں شاید چھ برس کا تھا جب پہلی بار میں نے ایک سکھ کو دیکھا تھا جو دھوپ میں بیٹھا اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ میں چلا پڑا۔ ارے وہ دیکھو! وہ دیکھو! عورت کے منہ پر کتنی لمبی داڑھی! جیسے جیسے عمر گذرتی گئی یہ استعجاب ایک نسلی نفرت میں تبدیل ہو گیا۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں جب کسی بچے کے بارے میں نامبارک بات کا ذکر کرتیں مثلاً یہ کہ اُسے نمونیا ہو گیا تھا یا اُس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو کہتیں۔ اب سے دو رکسی سکھ فرنگی کو نمونیہ ہو گیا

تھا' یا اب سے دو کرسی سکھ فرنگی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا یہ کوسنا ۱۸۵۷ء کی یادگار تھا جب ہندو مسلمانوں کی جنگِ آزادی کو دبانے میں پنجاب کے سکھ راجوں اور انکی فوجوں نے فرنگیوں کا ساتھ دیا تھا۔ مگر اسوقت تاریخی حقائق پر نظر نہیں تھی۔ صرف ایک مبہم سا خوف' ایک عجیب سی نفرت اور ایک عمیق تعصب ڈر انگریز سے بھی لگتا تھا اور سکھ سے بھی مگر انگریز سے زیادہ مثلاً جب میں کوئی دس برس کا تھا۔ ایکبار دہلی سے علیگڈھ جا رہا تھا ہمیشہ تھرڈ یا انٹر میں سفر ہوتا تھا۔ سوچا اب کی بار سیکنڈ کلاس میں سفر کر کے دیکھا جائے۔ بکٹ خرید لیا اور ایک خالی ڈبے میں بیٹھ کر گدّوں پر خوب کودا۔ باتھ روم کے آئینے میں اُچک اُچک کر اپنا عکس دیکھا سب پنکھوں کو ایک ساتھ چلا دیا۔ روشنیوں کو کبھی جلایا کبھی بجھایا مگر ابھی گاڑی کے چلنے میں دو تین منٹ باقی تھے۔ کہ لال لال مُنھ والے چار فوجی گورے آپس میں ڈیم بلیڈی قسم کی گفتگو کرتے ہوئے درجے میں گھُس آئے۔ انکو دیکھنا تھا کہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا شوق رفو چکر ہو گیا۔ اور اپنا سوٹ کیس گھسیٹتا میں بھاگا اور ایک نہایت نچھی کچھی بھرے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں آ کر دم لیا۔ یہاں دیکھا تو کئی سکھ اڑھیاں کھولے کچھے پہنے بیٹھے تھے مگر میں اُن سے ڈر کر درجہ چھوڑ کر نہیں بھاگا۔ صرف اُن سے ذرا فاصلہ پر بیٹھ گیا۔

ہاں تو ڈر سکھوں سے بھی لگتا تھا اور انگریزوں سے اُن سے زیادہ مگر انگریز انگریز تھے اور کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ جو میں بھی پہننا چاہتا تھا۔ اور ڈیم بلیڈی فول والی زبان بولتے تھے۔ جو میں بھی سیکھنا چاہتا تھا۔ اسکے علاوہ وہ حاکم تھے اور میں بھی چھوٹا موٹا حاکم بننا چاہتا تھا۔ وہ کانٹے چھُری سے کھانا کھاتے تھے اور میں بھی

کانٹے چھری سے کھانا کھانے کا خواہاں تھا تاکہ دنیا مجھے بھی مہذب اور متمدن سمجھے مگر سکھوں سے جوڑ لگتا تھا وہ حقارت آمیز تھا۔ کتنے عجیب الخلقت تھے یہ سکھ جو مرد ہو کر بھی سر کے بال عورتوں کی طرح لمبے لمبے رکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انگریزی فیشن کی نقل میں سر کے بال مُنڈانا کچھ مجھے بھی پسند نہیں تھا۔ اور ابا کے اس حکم کے باوجود کہ ہر جمعہ کو سر کے بال خشخشی کرائے جائیں میں نے بال خوب بڑھا رکھے تھے تاکہ ہاکی اور فٹ بال کھیلتے وقت بال ہوا میں اُڑیں جیسے انگریزی کھلاڑیوں کے ابا کہتے یہ کیا عورتوں کی طرح پٹے بڑھا رکھے ہیں مگر ابا تو تھے ہی پُرانے دقیانوسی خیالات کے۔ اُنکی بات کون سُنتا تھا۔ اُنکا بس چلتا تو سر پر اُسترا چلوا کر بچپن میں ہی ہمارے چہروں پر داڑھیاں بندھوا دیتے . . . . ہاں اس پر یاد آیا کہ سکھوں کے عجیب الخلقت ہونے کی دوسری نشانی اُن کی داڑھیاں تھیں۔ اور پھر داڑھی داڑھی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ابا کی داڑھی جسکو نہایت اہتمام سے نائی فرنچ کٹ بنایا کرتا تھا یا تایا ابا کی داڑھی جو نوکیلی اور چونچدار تھی۔ مگر یہ بھی کیا کہ داڑھی کو کبھی قینچی لگے ہی نہیں۔ جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھتی رہے۔ بلکہ تیل اور دہی اور نہ جانے کیا کیا مَلکر بڑھائی جائے۔ اور جب کئی فٹ لمبی ہو جائے تو اسمیں کنگھی کی جائے۔ جیسے عورتیں سر کے بالوں میں کرتی ہیں . . . عورتیں یا مجھ جیسے سکول کے فیشن ایبل لڑکے! اسکے علاوہ دادا جان کی داڑھی بھی کئی فٹ لمبی تھی۔ اور وہ بھی اسمیں کنگھی کرتے تھے۔ مگر دادا جان کی بات اور تھی۔ آخر وہ . . . . میرے دادا جان ٹھیرے اور سکھ پھر سکھ تھے۔

میٹرک کرنیکے بعد مجھے پڑھنے لکھنے کیلئے مُسلم یونیورسٹی علیگڑھ بھیجا گیا

کالج میں جو پنجابی لڑکے پڑھتے تھے اُنکو ہم دہلی اور یوپی والے نیچ۔ جاہل اور اُجڈ سمجھتے تھے۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ نہ کھانے پینے کی تمیز تہذیب و تمدن چھو نہیں گئے تھے گنوار لٹھ۔ یہ بڑے بڑے لسی کے گلاس پینے والے بھلا کیوں ڈے دار فالودے اور پلٹن کی چائے کی لذت کیا جانیں۔ زبان نہایت ناشائستہ۔ بات کریں تو معلوم ہو لڑ رہے ہیں۔ اسی تسی۔ ساڈے تہاڈے . . . لاحول ولاقوۃ میں تو ہمیشہ ان پنجابیوں سے کتراتا تھا۔ مگر خدا بھلا کرے ہمارے وارڈن صاحب کا کہ اُنھوں نے ایک پنجابی کو میرے کمرہ میں جگہ دیدی میں نے سوچا چلو جب ساتھ رہنا ہی ہے تو تھوڑی بہت حد تک دوستی ہی کر لی جائے۔ کچھ دنوں میں کافی گاڑھی چھننے لگی۔ اُسکا نام غلام رسول تھا۔ راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ کافی مزے دار آدمی تھا۔ اور لطیفے خوب سُناتا تھا۔

اب آپ کہینگے کہ ذکر شروع ہوا تھا سردار صاحب کا یہ غلام رسول کہاں سے ٹپک پڑا مگر اصل میں غلام رسول کا اس قصے سے قریبی تعلق ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ جو لطیفے سُناتا تھا۔ وہ عام طور سے سکھوں کے بارے میں ہوتے تھے جنکو سُن سُنکر مجھے پوری سکھ قوم کی عادات و خصائل اُنکی نسلی خصوصیات اور اجتماعی کیریکٹر کا بخوبی علم ہو گیا تھا۔ بقول غلام رسول کے :۔

سکھ تمام بیوقوف اور بدھو ہوتے ہیں۔ بارہ بجے تو اُنکی عقل بالکل خبط ہو جاتی ہے۔ اسکے ثبوت میں کتنے ہی واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں مثلاً ایک سردار جی دن کے بارہ بجے سائیکل پر سوار امرت سر کے ہال بازار سے گذر رہے تھے۔ چوراہے پر ایک سکھ کانسٹیبل نے روکا اور پوچھا "تمھاری سائیکل کی لائٹ کہاں ہے"۔ سائیکل سوار سردار جی گڑگڑا کر بولے "جمعدار صاحب ابھی ابھی بجھ گئی ہے۔ گھر سے

جلا کر تو چلا تھا۔ اسپر سپاہی نے چالان کرنے کی دھمکی دی۔ ایک راہ چلتے سفید داڑھی والے سردار جی نے بیچ بچاؤ کرایا۔ چلو بھئی کوئی بات نہیں۔ لائٹ بجھ گئی ہے تو اب جلالو! اور اسی قسم کے سینکڑوں قصے غلام رسول کو یاد تھے۔ اور انھیں جب وہ پنجابی مکالموں کیساتھ سُناتا تھا تو سُننے والوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ اصل میں اُنکو سُننے کا مزہ پنجابی میں ہی تھا۔ کیونکہ اُجڈ سکھوں کی عجیب و غریب حرکتوں کو بیان کرنے کا حق کچھ پنجابی جیسی اُجڈ زبان ہی میں ہو سکتا ہے۔ سکھ نہ صرف بیوقوف اور بدھو تھے بلکہ گندے تھے۔ جیسا ایک ثبوت تو غلام رسول (جسنے سینکڑوں سکھوں کو دیکھا تھا) یہ تھا کہ وہ بال نہیں مُنڈاتے تھے۔ اسکے علاوہ برخلاف ہم صاف ستھرے غازی مسلمانوں کے جو ہر اتوار کے جمعے کے جمعے غسل کرتے ہیں یہ سکھ کچھا باندھ سب کے سامنے نل کے نیچے بیٹھکر نہاتے تو روز ہیں۔ مگر اپنے بالوں اور داڑھی میں نا جانے کیا کیا گندی اور غلیظ چیزیں ملتے ہیں۔ مثلاً دہی۔ ویسے سر میں یہ بھی لائم جیوس گلسرین لگاتا ہوں۔ جو کسی قدر گاڑھے گاڑھے دودھ سے مشابہ ہوتی ہے مگر اُسکی بات اور ہے۔ وہ ولایت کی مشہور پرفیومر فیکٹری سے نہایت خوبصورت شیشی میں آتی ہے اور دہی کسی گندے سندے حلوائی کی دوکان سے۔

خیر جی ہمیں دوسروں کے رہنے سہنے کے طریقوں سے کیا لینا مگر سکھوں کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ لوگ اکھڑ پن، بدتمیزی اور مار دھاڑ میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی جُرأت کرتے تھے۔ اب دنیا جانتی ہے کہ ایک اکیلا مسلمان دس ہندوؤں یا سکھوں پر بھاری ہوتا ہے مگر پھر یہ سکھ مُسلمانوں کے رعب کو نہیں مانتے تھے۔ کرپانیں لٹکائے اکڑا اکڑا کر مونچھوں پر بلکہ داڑھی پر بھی تاؤ دیتے چلتے تھے۔ غلام رسول

کہتا، انکی ہیکڑی ایکدن ہم نکالیں گے کہ خالصہ جی یاد ہی تو کریں گے۔

کالج چھوٹے کئی سال گذر گئے۔ طالبعلم سے میں کلرک اور کلرک سے ہیڈ کلرک بن گیا۔ علیگڑھ کا ہوسٹل چھوڑ نئی دہلی میں ایک سرکاری کوارٹر میں رہنا سہنا اختیار کر لیا۔ شادی ہوگئی۔ بچے ہو گئے۔ مگر کتنی ہی مدت کے بعد مجھے غلام رسول کا وہ کہنا یاد آیا۔ جب ایک سردار صاحب میرے برابر کے کوارٹر میں رہنے کو آئے ـــــ یہ راولپنڈی سے بدلی کرا کر آئے تھے۔ کیونکہ راولپنڈی کے ضلع میں غلام رسول کی پیشینگوئی کے بموجب سرداروں کی ہیکڑی اچھی طرح سے نکالی گئی تھی۔ مجاہدوں نے اُنکا صفایا کر دیا تھا۔ بڑے سُورما بنتے تھے۔ کرپانیں لئے پھرتے تھے۔ بہادر مسلمانوں کے سامنے اُنکی ایک نہ بنی۔ اُنکی داڑھیاں مُونڈ کر اُنکو مسلمان بنایا گیا تھا۔ زبردستی اُنکا ختنہ کیا گیا تھا۔ ہندو پریس حسبِ عادت مسلمانوں کو بدنام کرنے کیلئے یہ لکھ رہا تھا کہ سکھ عورتوں اور بچّوں کو بھی مسلمانوں نے قتل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اسلامی رُوایات کے خلاف ہے۔ کوئی مسلمان مجاہد کبھی عورت یا بچے پر ہاتھ نہیں اُٹھاتا رہیں عورتوں اور بچّوں کی لاشوں کی تصویریں جو چھاپی جا رہی تھیں وہ یا تو جعلی تھیں اور یا سکھوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کیلئے خود اپنی عورتوں اور بچّوں کو قتل کیا ہوگا۔ راولپنڈی اور مغربی پنجاب کے مسلمانوں پر یہ بھی الزام لگایا گیا تھا۔ کہ اُنھوں نے ہندو اور سکھ لڑکیوں کو بھگایا تھا۔ حالانکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کی جوانمردی کی دھاک بیٹھی ہے! اور اگر نوجوان مسلمانوں پر ہندو اور سکھ لڑکیاں خود ہی لٹو ہو جائیں تو اُنکا کیا قصور ہے کہ وہ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں اُن لڑکیوں کو اپنی پناہ میں لے لیں ہاں تو سکھوں کی نام نہاد بہادری کا بھانڈہ پھوٹ گیا تھا۔ بھلا اب تو

لاہور میں کرپان نکالکر مسلمانوں کو دھمکیاں دے، پنڈی سے بھاگے ہوئے سردار اور اُسکی خستہ حالی کو دیکھکر میرا سینہ عظمتِ اسلام کی روح سے بھر گیا۔

ہمارے پڑوسی سردار جی کی عمر کوئی ساٹھ برس کی ہوگی۔ داڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی۔ حالانکہ موت کے مُنھ سے بچکر آئے تھے مگر یہ حضرت ہر وقت دانت نکالے ہنستے رہتے تھے جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دراصل کتنا بیوقوف اور بیحیا ہے شروع شروع میں اُنھوں نے مجھے اپنی دوستی کے جال میں پھنسانا چاہا۔ آتے جاتے زبردستی باتیں کرنا شروع کردیں نہ جانے سکھوں کا کونسا تہوار تھا۔ اُسدن پرشاد کی مٹھائی بھی بھیجی (جو میری بیوی نے فوراً مہترانی کو دیدی) پر میں نے زیادہ مُنھ نہ لگایا۔ کوئی بات ہوئی سُوکھا سا جواب دیدیا اور بس۔ میں جانتا تھا کہ سیدھے مُنھ دو چار باتیں کرلیں تو یہ پیچھے ہی پڑجائیگا۔ آج باتیں تو کل کام گفتار۔ گالیاں تو آپ جانتے ہی ہیں سکھوں کی دال روٹی ہوتی ہے۔ کون اپنی زبان گندی کرے۔ ایسے لوگوں سے تعلقات بڑھاکر۔ ہاں ایک اتوار کی دوپہر کو میں اپنی بیوی کو سکھوں کی حماقت کے قصّے سُنا رہا تھا۔ اسکا عملی ثبوت دینے کیلئے عین بارہ بجے میں نے اپنے نوکر کو سردار جی کے ہاں بھیجا کہ پوچھکر آئے کیا بجا ہے اُنھوں نے کہلوادیا بارہ بجکر دو منٹ ہوئے ہیں۔ میں نے کہا بارہ بجے کا نام لیتے گھبراتے ہیں یہ اور ہم خوب ہنسے۔ اسکے بعد میں نے کئی بار بیوقوف بنانے کیلئے سردار جی سے پوچھا کیوں سردار جی بارہ بجگئے، اور وہ بے شرمی سے دانت پھاڑکر جواب دیتے جی اسادے ہاں چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں۔ اور یہ کہکر خوب ہنسے گویا یہ بڑا مذاق ہوا۔

مجھے سب سے زیادہ ڈر بچوں کی طرف سے تھا۔ اوّل تو کسی سکھ کا اعتبار نہیں کب

بچے ہی کے گلے پر کرپان چلادے۔ پھر یہ لوگ راولپنڈی سے آئے تھے۔ ضرور دل میں مسلمانوں کیلئے کینہ رکھتے ہونگے۔ اور انتقام لینے کی تاک میں ہونگے۔ میں نے بیوی کو تاکید کردی تھی کہ بچے ہرگز سردار جی کے کوارٹر کی طرف نہ جانے دیئے جائیں۔ یہ بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں چند روز کے بعد میں نے دیکھا کہ سردار کی چھوٹی لڑکی موہنی اور انکے پوتوں کیساتھ کھیل رہے ہیں۔ یہ بچی جسکی عمر مشکل سے دس برس کی ہوگی سچ مچ موہنی ہی تھی۔ گوری چٹی۔ اچھا ناک نقشہ۔ بڑی خوبصورت کمبختوں کی عورتیں کافی خوبصورت ہوتی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ غلام رسول کہا کرتا تھا۔ کہ اگر پنجاب سے سکھ مرد چلے جائیں اور اپنی عورتوں کو چھوڑ جائیں تو پھر حوروں کی تلاش میں جانیکی ضرورت نہیں۔ ہاں تو جب میں نے بچوں کو سردار جی کے بچوں کیساتھ کھیلتے دیکھا تو میں انکو گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ اور خوب پٹائی کی۔ پھر میرے سامنے کم سے کم اُن کی ہمت نہ ہوئی کہ اُدھر کا رُخ کریں۔

بہت جلد سکھوں کی اصلیت پوری طرح ظاہر ہوگئی۔ راولپنڈی سے تو ڈرپوکوں کی طرح پٹ کر بھاگ کر آئے تھے۔ پر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو اقلیت میں پاکر اُن پر ظلم ڈھانا شروع کردیا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو جامِ شہادت پینا پڑا۔ اسلامی خون کی ندیاں بہہ گئیں ہزاروں عورتوں کو برہنہ کرکے جلوس نکالا گیا۔ جب سے مغربی پنجاب سے بھاگے ہوئے سکھ اتنی بڑی تعداد میں دہلی میں آنے شروع ہوئے تھے۔ اس وبا کا یہاں تک پہنچنا یقینی ہوگیا تھا۔ میرے پاکستان جانے میں ابھی چند ہفتے کی دیر تھی۔ اسلئے میں نے اپنے بڑے بھائی کیساتھ اپنے بیوی بچوں کو ہوائی جہاز سے کراچی بھیجدیا۔ اور خود خدا پر بھروسہ کرکے ٹھہر رہا۔ ہوائی جہاز میں

سامان تو زیادہ نہیں جا سکتا تھا۔ اسلئے میں نے ایک پوری ویگن بُک کرالی مگر جس دن سامان چڑھانے والے تھے اُسدن سُنا کہ پاکستان جانے والی گاڑیوں پر حملے ہو رہے ہیں۔ اسلئے سامان گھر میں ہی پڑا رہا۔

پندرہ اگست کو آزادی کا جشن منایا گیا۔ مگر مجھے اِس آزادی میں کیا دلچسپی تھی میں نے چھٹی منائی اور دن بھر لیٹا ڈان اور پاکستان ٹائمز کا مطالعہ کرتا رہا۔ دونوں میں اس نام نہاد آزادی کے چیتھڑے اُڑائے گئے تھے۔ اور ثابت کیا گیا تھا کہ کسطرح ہندوؤں اور انگریزوں نے مل کر مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کی سازش کی تھی۔ وہ تو ہمارے قایدِ اعظم کا اعجاز تھا کہ پاکستان لیکر ہی رہے اگرچہ انگریزوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے دباؤ میں آکر امرتسر کو ہندوستان کے حوالے کر دیا۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ امرتسر خالص اسلامی شہر ہے۔ اور یہاں کی سُنہری مسجد جو (Goldan mosque.) کے نام سے دنیا میں مشہور ہے . . . نہیں وہ تو گوردوارہ ہے اور (Golden Temple.) کہلاتا ہے۔ سنہری مسجد تو دہلی میں ہی سُنہری مسجد ہی نہیں جامع مسجد بھی۔ لال قلعہ ہے۔ نظام الدین اولیاء کا مزار، ہمایوں کا مقبرہ صفدر جنگ کا مدرسہ۔ غرض چپے چپے پر اسلامی حکومت کے نشان پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی آج اُسی دہلی بلکہ کہنا چاہئے شاہجہان آباد پر ہندو سامراج کا جھنڈا بلند کیا جا رہا تھا۔ 'روے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونبار' . . . اور یہ سوچکر میرا دل بھر آیا کہ دہلی جو کبھی مسلمانوں کا پایۂ تخت تھا۔ تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا ہم سے چھین لیا گیا تھا۔ اور ہمیں مغربی پنجاب اور سندھ بلوچستان وغیرہ جیسے اُجڈ اور غیر متمدن علاقوں میں زبردستی بھیجا جا رہا ہے۔ جہاں کسی کو شستہ اُردو زبان

بھی بولنی نہیں آتی۔ جہاں شلواریں جیسا مضحکہ خیز لباس پہنا جاتا ہے جہاں ہلکی پھلکی پاؤ بھر میں بیس چپاتیوں کی بجائے دو دو سیر کی نانیں کھائی جاتی ہیں پھر میں نے اپنے دل کو مضبوط کر کے سمجھایا کہ قائدِ اعظم اور پاکستان کی خاطر یہ قربانی تو ہمیں دینی ہوگی۔ مگر پھر بھی دلّی چھوڑنے کے خیال سے دل مرجھایا ہی رہا ...

شام کو جب میں باہر نکلا اور سردار جی نے دانت نکال کر کہا: کیوں بابو جی تم نے آج کچھ کھشی نہیں منائی؟ تو میرے جی میں آئی کہ اس کی داڑھی میں آگ لگا دوں ہندوستان کی آزادی اور دل میں سکھا شاہی آخر رنگ لا کر ہی رہی۔ اب مغربی پنجاب سے آئے ہوئے Refugees کی تعداد دو ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔ یہ لوگ دراصل پاکستان کو بدنام کرنے کیلئے اپنے گھر بار چھوڑ کر وہاں سے بھاگے تھے۔ یہاں آکر گلی کوچوں میں اپنا ڈونڈورا پیٹتے پھرتے تھے۔ کانگرسی پراپیگنڈہ مسلمانوں کے خلاف زوروں پر چل رہا تھا۔ اور اس بار کانگرسیوں نے چال یہ چلی کہ بجائے کانگرس کا نام لینے کے راشٹریہ سیوک سنگھ اور شہیدی دل کے نام سے کام کر رہے تھے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ ہندو چاہے کانگرسی ہوں یا مہاسبھائی۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ چاہے دنیا کو دھوکا دینے کی خاطر وہ بظاہر گاندھی اور جواہر لال نہرو کو گالیاں ہی کیوں نہ دیتے ہوں۔

ایکدن صبح کو خبر آئی کہ دہلی میں قتلِ عام شروع ہو گیا۔ قرولباغ میں مسلمانوں کے سینکڑوں گھر پھونک دیئے گئے۔ چاندنی چوک میں مسلمانوں کی دکانیں لٹ گئیں اور ہزاروں کا صفایا ہو گیا۔ یہ تھا کانگرس کے ہندو راج کا نمونہ۔ خیر میں نے سوچا کہ دلّی تو مدت سے انگریزوں کا شہر رہا ہے۔ لارڈ مونٹ بیٹن یہاں

رہتے ہیں۔ کمانڈر انچیف یہاں رہتا ہے۔ کم سے کم یہاں وہ مسلمانوں کو تھوڑا ایسا ظلم نہ ہونے دینگے۔ یہ سوچکر میں دفتر کی طرف چلا۔ کیونکہ اُسدن مجھے پروویڈنٹ فنڈ کا حساب کرنا تھا اور دراصل اسی لئے میں نے پاکستان جانے میں دیر کی تھی۔ ابھی گول مارکٹ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ دفتر کا ایک ہندو بابو ملا۔ اُس نے کہا: "یہ کیا کر رہے ہو۔ جاؤ واپس جاؤ۔ باہر نہ نکلنا۔ کناٹ پلیس میں بلوائی مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔" میں واپس بھاگ آیا۔

اپنے سکوٹر میں پہنچا ہی تھا کہ سردار جی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ کہنے لگے "شیخ جی! فکر نہ کرنا جبتک ہم سلامت ہیں تمھیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔" میں نے سوچا اسکی داڑھی کے پیچھے کتنا مکر چھپا ہوا ہے۔ دل میں تو خوش ہے چلو اچھا ہوا مسلمانوں کا صفایا ہو رہا ہے ..... مگر زبانی ہمدردی جتا کر مجھ پر احسان کر رہا ہے۔ بلکہ شاید مجھے چڑانے کیلئے یہ کہہ رہا ہے۔ کیونکہ سارے سکوٹر میں بلکہ اس تمام سڑک پر میں تن تنہا مسلمان تھا۔

پر مجھے ان کافروں کا رحم و کرم نہیں چاہیئے۔ میں سوچکر اپنے کوارٹر میں آگیا۔ "میں مارا بھی جاؤنگا تو دس بیس کو مار کر۔" سیدھا اپنے کمرے میں گیا جہاں پلنگ کے نیچے میری دونالی شکاری بندوق رکھی تھی۔ جب سے فساد شروع ہوئے تھے میں نے کارتوس اور گولیوں کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ پر وہاں بندوق نہ ملی۔ سارا گھر چھان مارا۔ اُسکا کہیں پتہ نہ چلا۔

"کیوں حضور کیا ڈھونڈھ رہے ہیں آپ؟" یہ میرا وفادار ملازم ممدو تھا

"میری بندوق کیا ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اُس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اُسے معلوم ہے۔ شاید اُس نے کہیں چھپائی ہے یا چُرائی ہے۔

"بولتا کیوں نہیں"۔ میں نے ڈانٹ کر کہا۔

تب حقیقت معلوم ہوئی کہ ممدو نے میری بندوق چُرا کر اپنے چند دوستوں کو دے دی تھی۔ جو دریا گنج میں مسلمانوں کی حفاظت کے لئے ہتھیاروں کا ذخیرہ جمع کر رہے تھے۔

"کئی سو بندوقیں ہیں سرکار ہمارے پاس۔ سات مشین گنیں۔ دس ریوالور اور ایک توپ۔ کافروں کو بھُون کر رکھ دیں۔ بھُون کر"۔

میں نے کہا "دریا گنج میں میری بندوق سے کافروں کو بھُون دیا گیا تو اس میں میری حفاظت کیسے ہوگی۔ میں تو یہاں نہتا کافروں کے نرغے میں پھنسا ہوا ہوں۔ یہاں مجھے بھُون دیا گیا تو کون ذمّے دار ہوگا؟" میں نے ممدو سے کہا۔

وہ کسی طرح چھُپتا چھُپاتا دریا گنج تک جائے اور وہاں سے میری بندوق اور سو دو سو کارتوس لے کر آئے۔ وہ چلا تو گیا مگر مجھے یقین تھا کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

اب میں گھر میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ سامنے کارنس پر میری بیوی اور بچوں کی تصویریں خاموشی سے مجھے گھور رہی تھیں۔ یہ سوچکر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہ اب اِن سے کبھی ملاقات ہوگی بھی یا نہیں۔ لیکن پھر یہ خیال کر کے اطمینان بھی ہوا کہ کم سے کم وہ تو خیریت سے پاکستان پہنچ گئے تھے۔

کاش میں نے پروویڈنٹ فنڈ کا لالچ نہ کیا ہوتا۔ اور پہلے ہی چلا گیا ہوتا۔ پر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے ....

'ست سری اکال' ... 'ہر ہر مہادیو'

دُور سے آوازیں قریب آرہی تھیں۔ یہ بلوائی تھے۔ یہ میری موت کے ہرکارے تھے۔ میں نے زخمی ہرن کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا جو گولی کھا چکا ہو اور جس کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوں۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ کوارٹر کے کواڑ پتلی لکڑی کے تھے۔ اور ان میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر میں بند ہو کر بیٹھ بھی رہا تو دو منٹ میں بلوائی کواڑ توڑ کر اندر آسکتے تھے۔ 'ست سری اکال' 'ہر ہر مہادیو'

آوازیں اور قریب آرہی تھیں۔ میری موت قریب آرہی تھی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سردار جی داخل ہوئے۔ 'شیخ جی تم ہمارے کوارٹر میں آجاؤ۔ جلدی کرو۔' بغیر سوچے سمجھے اگلے لمحے میں سردار جی کے برآمدے کی چکوں کے پیچھے تھا۔ موت کی گولی سن سے میرے سر پر سے گذر گئی۔ کیونکہ میں وہاں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک لاری آکر رُکی اور اُس میں سے دس پندرہ نوجوان اُترے۔ اُن کے لیڈر کے ہاتھ میں ایک ٹائپ کی ہوئی فہرست تھی۔ 'کوارٹر ۸ شیخ برہان الدین' اُس نے کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے حکم دیا۔ اور یہ غول کا غول میرے کوارٹر پر ٹوٹ پڑا۔ میری گرہستی کی دنیا میری آنکھوں کے سامنے اُجڑ گئی۔ لُٹ گئی۔ کرسیاں، میزیں صندوق، تصویریں، کتابیں، دریاں، قالین، یہاں تک کہ میلے کپڑے۔

ہر چیز لاری پر پہنچا دی گئی۔

ڈاکو!

لٹیرے!!

قزاق!!!

اور یہ سردار جی جو بظاہر ہمدردی جتا کر مجھے یہاں لے آئے تھے۔ یہ کون سے کم لٹیرے تھے۔

باہر جا کر بلوائیوں سے کہنے لگے ٹھہریئے صاحب! اس گھر پر ہمارا حق زیادہ ہے ہمیں بھی اس لوٹ میں سے حصہ ملنا چاہیئے اور یہ کہکر انھوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو اشارہ کیا۔ اور وہ بھی لوٹ میں شامل ہو گئے۔ کوئی میری پتلون اٹھائے چلا آرہا تھا۔ کوئی سوٹ کیس۔ کوئی میری بیوی اور بچوں کی تصویریں بھی لا رہا تھا۔ اور یہ سب مالِ غنیمت سیدھا اندر کے کمرے میں جا رہا تھا۔

اچھا ہے سردار زندہ رہا تو مجھ سے بھی سمجھوں گا۔ پر اس وقت تو میں چوں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ فسادی جو سب کے سب مسلح تھے مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھے۔ اگر انھیں کہیں معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں . . . .

'ارے اندر آؤ جی تسی'

دفعتاً میں نے دیکھا کہ سردار جی ننگی کرپان ہاتھ میں لئے مجھے اندر بلا رہے ہیں۔ میں نے ایک بار اس دڑھیل چہرے کو دیکھا جو لوٹ مار کی بھاگ دوڑ سے اور بھی خوفناک ہو گیا تھا۔ اور پھر کرپان کو جس کی چمکیلی دھار مجھے دعوت دے رہی تھی بحث کرنے کا موقعہ نہیں تھا۔ اگر میں کچھ بھی بولا اور بلوائیوں نے

سُن لیا تو ایک گولی میرے سینے کے پار ہو گی۔ کرپان اور بندوق میں سے ایک کو پسند کرنا تھا میں نے سوچا ان دس بندوق باز بلوائیوں سے کرپان والا بڈھا بہتر ہے۔ میں کمرے میں چلا گیا جھجکتا ہوا خاموش۔

'اِیتھے آ جی اوس اندر آؤ'۔

میں اور اندر کے کمرے میں چلا گیا۔ جیسے بکرا قصائی کے ساتھ ذبح خانے میں داخل ہوتا ہے۔ میری آنکھیں کرپان کی دھار سے چندھیا رہی تھیں۔

'یہ لو جی اپنی چیزیں سنبھال لو' یہ کہہ کر سردار جی نے وہ تمام سامان میرے سامنے رکھ دیا۔ جو انھوں نے اور اُن کے بچّوں نے جھوٹ مُوٹ کی لُوٹ میں حاصل کیا تھا۔

سردارنی بولیں 'بیٹا ہم تو تیرا کچھ بھی سامان نہ بچا سکے' میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

اِتنے میں باہر سے کچھ آوازیں سُنائی دیں۔ بلوائی میری لوہے کی الماری کو باہر نکال رہے تھے۔ اور اُس کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

'اِس کی چابیاں مل جائیں تو سب معاملہ آسان ہو جاتا'۔

'چابیاں تو اس کی پاکستان میں ملیں گی۔ بھاگ گیا نا ڈرپوک کہیں کا مسلمان کا بچہ تھا تو مقابلہ کرتا'۔

ننھی موہنی میری بیوی کے چند رشیتی قمیضیں اور غرارے نہ جانے کس سے چھین کر لا رہی تھی کہ اُس نے یہ سُنا۔ وہ بولی "تم بڑے بہادر ہوا

شیخ جی ڈرپوک کیوں ہونے لگے۔ وہ تو کوئی بھی پاکستان نہیں گئے۔'

'نہیں گیا تو یہاں سے کہیں منھ کالا کر گیا۔'

'منھ کالا کیوں کرتے۔ وہ تو ہمارے ہاں!۔۔۔

میرے دل کی حرکت ایک لمحے کیلئے بند ہوگئی۔ بچی اپنی غلطی کا احساس کرتے ہی خاموش ہوگئی۔ مگر ان بلوائیوں کیلئے یہی کافی تھا۔

سردار جی پر جیسے خون سوار ہوگیا۔ اُنھوں نے مجھے اندر کے کمرے میں بند کر کے کُنڈی لگا دی۔ اپنے بیٹے کے ہاتھ میں کرپان دی۔ اور خود باہر نکل گئے۔ باہر کیا ہوا یہ مجھے ٹھیک طرح معلوم نہ ہوا۔ تھپیڑوں کی آواز۔ پھر موہنی کے رونے کی آواز۔ اور اُس کے بعد سردار جی کی آواز۔ پنجابی گالیاں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ کسے گالیاں دے رہے ہیں اور کیوں۔ میں چاروں طرف سے بند تھا۔ اِسلئے ٹھیک سُنائی نہیں دیتا تھا۔

اور پھر۔۔۔ گولی چلنے کی آواز۔۔۔ سردارنی کی چیخ۔

لاری روانہ ہونے کی گڑگڑاہٹ۔ اور پھر تمام سکوت پر جیسے سناٹا چھا گیا جب مجھے کمرے کی قید سے نکالا گیا تو سردار جی پلنگ پر پڑے تھے۔ اور اُن کے سینے کے قریب سفید قمیض خون سے سُرخ ہو رہی تھی۔ اُن کا لڑکا ہمسائے کے گھر سے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر رہا تھا۔

'سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟' میری زبان سے نہ جانے یہ الفاظ کیسے نکلے میں مبہوت تھا۔ میری برسوں کی دنیا۔ خیالات محسوسات۔ تعصّبات کی دنیا کھنڈر ہوگئی تھی۔

'سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟'

'مجھے کرجہ اُتارنا تھا بیٹا!'

'قرضہ؟'

'ہاں! راولپنڈی میں تمہارے جیسے ہی ایک مسلمان نے اپنی جان دیکر میری اور میرے گھر والوں کی جان اور اجّت بچائی تھی'

'کیا نام تھا اُسکا سردار جی؟"

'غلام رسول'۔

'غلام رسول' اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے ساتھ قسمت نے دھوکا کیا ہو۔ دیوار پر لٹکے ہوئے گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کئے۔ ایک۔ ..... دو..... تین..... چار..... پانچ۔

سردار جی کی نگاہیں گھنٹے کی طرف پھر گئیں۔ جیسے مُسکرا رہے ہوں اور مجھے اپنے دادا یاد آ گئے جن کی کئی فٹ لمبی داڑھی تھی۔ سردار جی کی شکل اُن سے کتنی ملتی تھی۔ چھ..... سات..... آٹھ..... ..... نو.....

جیسے وہ ہنس رہے ہوں۔ اُن کی سفید داڑھی اور سر کے کھُلے ہُوئے بالوں نے چہرے کے گرد ایک نورانی ہالہ سا بنایا ہوا تھا۔

دس..... گیارہ..... بارہ۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں 'جی اساں دے ہاں تو ۲۴ گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں'۔

پھر وہ نگاہیں ہمیشہ کیلئے بند ہو گئیں۔

اور میرے کانوں میں غلام رسول کی آواز دُور سے بہت دُور سے آئی
'میں کہتا نا تھا کہ بارہ بجے ان سکھوں کی عقل غائب ہو جاتی ہے۔ اور یہ کوئی
نہ کوئی حماقت کر بیٹھتے ہیں۔ اَب ان سردار جی ہی کو دیکھو نا ——— ایک
مسلمان کی خاطر اپنی جان دے دی'

پر یہ سردار جی نہیں مرے تھے۔ میں مرا تھا!۔

چُڑیل

احمد ندیم قاسمی

صفحات :- ۲۶

جی ہاں، ہے تو عجیب سی بات مگر بعض سچّی باتیں بھی تو عجیب ہوتی ہیں۔
دن بھر وہ برساتی نالوں میں سے چقماق کی جھولیاں چُنتی ہے، اور رات کو انھیں آپس میں بجاتی ہے۔ اور جب اُن سے چنگاریاں جھڑنے لگتی ہیں تو زور زور سے ہنستی ہے، اور پھر اُس کی ہنسی شدید ہونے لگتی ہے۔ قہقہے چیخوں میں بدل جاتے ہیں اور چیخیں گریہ میں۔ اور جب آدھی رات کو یہ آوازیں سُنتے ہیں اور کروٹیں بدلتے ہوئے کہتے ہیں "تو ہم پر رحمتیں برساخاتون"، تو آسمان پر ستارے جھٹکنے لگتے ہیں جھیل کی سطح سے چمٹے ہوئے چاند کو لطیف جھونکے لاتعداد دفوں کی قطاروں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور ہوائیں گھنی بیریوں میں سے سمٹ سمٹ اور لچک لچک کر نکلتی ہوئی گنگنانے لگتی ہیں۔ اور یہ گنگناہٹ سنسناتے ہوئے سناٹے کا روپ دھار کر پہاڑیوں اور وادیوں پر مسلط ہو جاتی ہے اور صرف تبھی ٹوٹتی ہے جب پو پھٹے گلابی کنکوے سے

بٹی ہوئی ڈھیریوں پر ایک سایہ سا منڈلانے لگتا ہے۔

اول اول جب وہ ان ڈھیریوں پر آئی تو جیت کے مہینے کی ایک رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ آسمان پر بادلوں کی جنگ جاری تھی اور برساتی نالے گرج رہے تھے کسی کھوہ میں ایک گڈریا دُبکا بیٹھا تھا۔ یہ قریب سے گذری تو گڈریا "چُڑیل، چُڑیل" پکارتا چیختا، چلاتا، کنکر اُڑاتا اندھیرے میں جذب ہو گیا۔ دوسرے روز چرواہوں نے بہت دُور سے اُسے ڈھیریوں پر چقماق چُنتے دیکھا تو گڈریے کے وادیلا میں سچائی کی رمق نظر آئی۔ گھروں کے صدر دروازوں پر تعویذ لٹکائے گئے دہقانوں کے چھپروں کے اردگرد پیر جی کا دم کیا ہوا پانی چھڑکا جانے لگا۔ اور نمبردار نے مولوی جی کو عین وسط میں بٹھا کر کہا کہ یہاں تین مرتبہ قرآن مجید پڑھ کر پھونکو اور پیٹ بھر حلوہ ۔۔۔۔۔۔ سنتا سنگھ جو راولپنڈی کے فسادوں کا حال سُنکر گھر کی چار دیواری میں بند ہو کر رہ گیا تھا، باہر آیا۔ اور مکان کے قفل پر سیندور چھڑک کر اندر بھاگ گیا۔ اور لالہ چونی لال نے اڑوس پڑوس کے پنڈتوں کو فوراً جمع کیا اور ایک بھجن منڈلی قائم کر دی۔ ہُو حق کے ورد اور رام نام کے جاپ سے گاؤں بھڑوں کے چھتے کی طرح سرسرانے لگا۔ اس روز مدرسہ بھی بند رہا۔ کیونکہ گاؤں نے اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو کلیجوں ہی سے چمٹائے رکھا۔ اور مدرسے کے برآمدے میں بیٹھ کر چُڑیل کی باتیں کرتے رہے۔

مگر چند ہی دنوں کے بعد مراد نے گاؤں بھر میں یہ خبر پھیلا دی کہ وہ چُڑیل نہیں۔

"چُڑیل نہیں"۔ مولوی جی نے پوچھا تھا۔ "ارے بھئی تمھیں کیا معلوم کہ

کہ سکندر اعظم کے زمانے میں کالی ڈھیری کی چوٹی پر ایک ہندوستانی چڑیل نے ایک یونانی کی کھوپڑی توڑ کر اُسکا گودا نگل لیا تھا۔ جب سے اس ڈھیری پر کسی نے قدم نہیں رکھا، اور اکثر دیکھا گیا ہے، خود ہمنے دیکھا ہے، کہ طوفانی راتوں میں ڈھیری پر دیئے جلتے ہیں اور تالیاں بجتی ہیں اور ڈراؤنے قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں، دادا سے پوچھ لو۔"

دادا جسے قرآن مجید کی کئی آیات کے ترجمہ سے لیکر ابابیلوں کی چونچ اور گدھ کی آنکھوں کے مرکب سے ایک اکسیری سرمے کا نسخہ تک یاد تھا۔ بولا "کون نہیں جانتا، کوئی ماں کا لال کالی ڈھیری پر چڑھ کر تو دکھائے، کہتے ہیں اکبر بادشاہ دلّی سے صرف اِسلئے یہاں آیا تھا، کہ اس چوٹی کا راز معلوم کرے، مگر مارے ڈر کے پلٹ گیا تھا۔"

مراد بولا۔ "میری بات بھی تو سُنو۔"

"ہاں ہاں بھئی"۔ دادا نے کہا۔ "سچ مچ مراد کی بات بھی تو سنو، ہمارے تمھارے جیسا نادان تو نہیں کہ سُنی سُنائی ہانک دیگا۔ پڑھا لکھا ہے، انگریز کو اُردو پڑھاتا رہا ہے فوج میں ــــ کہو بھئی مُراد۔"

اور مراد بولا۔ "وہ چڑیل نہیں، بلا کی خوبصورت عورت ہے۔ اتنے لمبے اور گھنے بال ہیں اسکے، کہ معلوم ہوتا ہے اسکے بدن پر گاڑھے دُھوئیں کا ایک لہراتا ہوا سا خول چڑھا ہوا ہے، اور رنگ تو اس غضب کا ہے کہ چاند کی کرنوں کی ایسی کی تیسی۔ آنکھیں بادامی ہیں پتھر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھے تو چٹخا کے دھر دے پلکیں اتنی لمبی اور ایسی شان سے کھڑی ہوئی کہ تیر کمان یاد آجائیں ــــ اور دادا ــــ"

"کہتے جاؤ، کہتے جاؤ" دادا مسکرا رہا تھا۔
مولوی جی نے تسبیح پر سینکڑا ختم کر لیا تھا۔
اور مراد بولا "دادا ـــ اسکے دونوں ابروؤں کے درمیان ایک نیلی سی بندیا بھی ہے!"
"ارے!" دادا جیسے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور مولوی جی نے تسبیح کو مٹھی میں مروڑ کر ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔
"میں نہیں کہتا تھا کہ وہ کالی ڈھیری کی چڑیل ہے جس نے یونانی سپاہی کی کھوپڑی کا کٹورا بنا کر [illegible] ہندو عورت ہی کا نشان تو ہے"
"خدا لگتی کہتے ہو مولوی جی" دادا نے (۱) مولوی جی کی بات کاٹ کر ہی ہے۔ نقل پر ٹھو شکرانے [illegible]
"[illegible] چڑیل نہیں [illegible] کی آواز [illegible] اعتماد تھا "اگر چڑیلیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں تو میں ابھی کالی ڈھیری پر جانے کیلئے تیار ہوں [illegible] میرا دل کہتا ہے کہ وہ چڑیل نہیں"
"تو پھر کون ہے آخر؟" دادا نے لوگوں کی آنکھوں میں دبکے ہوئے سوالوں کو زبان سے ادا کر دیا۔
"ہو گی کوئی" مراد بولا "مگر دادا سچ کہتا ہوں، ایران بھی دیکھا اور عراق بھی اور مصر بھی۔ کہیں کشمیری سیب کی سی رنگت تھی تو کہیں ہے چنبیلی کی سی۔ لیکن یہ گندم کا سا، ندی کنارے ریت کا سا، سنہری سنہری رنگ۔ یہ ہمارے ہندوستان ہی میں ملتا ہے"

"ہندوستان میں اور بھی تو بہت کچھ ہے۔" نمبردار کا بیٹا رحیم جو لاہور کے ایک کالج میں پڑھتا تھا اور ایسٹر کی چھٹیاں گذارنے گاؤں میں آیا تھا۔ بھاری بھاری کتابوں کی اوٹ سے بولا۔ "یہاں بنگال کے گلے سڑے ڈھانچے بھی ہیں۔ اور بہار کے یتیم بھی ہیں، اور سارے ہندوستان کی وہ بیوائیں بھی ہیں، جنکے آبرو کے رکھوالوں پر مشرق و مغرب کے میدانوں میں گدھوں، مچھلیوں اور کیڑوں نے ضیافتیں اڑائیں اور جنکے لہو کی پچھوا نے فاشزم کا فانوس بجھایا۔ اور جنکے خون کی حدت نے کئی اور کافوری شمعیں روشن کیں اور پھر ہندوستان میں تمھارے امرتسر، راولپنڈی اور ملتان بھی تو ہیں۔ جہاں صرف اس لئے عورتوں کی آبروریزی کی جارہی ہے کہ اُنکے ماتھے پر نیلی سی بندیا ہے۔ اور جہاں بچوں کو ــــ"

"نہیں نہیں بھئی۔" دادا بولا۔ "بچوں کو نہیں۔ بچوں کو ابھی تک کسی نے کچھ نہیں کہا۔"

"بچے نہ سہی۔" رحیم کی آواز کانپنے لگی۔ "مگر کیا بندیا والی عورتیں اور کڑے والے نوجوان اور جنیو والے بوڑھے، انسان نہیں ہیں؟ کیا وہ کسی اور سیارے سے ٹپک پڑے ہیں؟ کیا اُن کی اُمیدیں اور اُمنگیں اور ولولے مر چکے ہیں؟ کیا اُنکے سینوں میں دل اور دلوں میں ــــ"

ایک نوجوان دہقان نے احتجاج کیا۔ "بات گندمی رنگ کی ہو رہی تھی ملک جی۔"

"اور میں کہہ رہا تھا۔" رحیم بولا۔ "کہ گندمی رنگ کے علاوہ اور بھی تو بہت کچھ ہے دنیا میں۔ افریقہ کا حبشی ہے، امریکہ کا انڈین ہے۔ ہندوستان کا اچھوت ہے

"دیکھو بھئی رحیم" دادا نے لجاجت سے کہا۔ "اصل میں بات ہو رہی تھی اُس چڑیل کی۔" اور دادا نے ڈھیریوں کی طرف دیکھا جن پر مغربی اُفق پر چھائی بدلیوں کی جھریوں میں سے ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعیں شفق میں نہا کر اُترآئی تھیں۔ "بات سے بات یوں نکلتی ہے ملک میرے، کہ چڑیل کا ذکر آیا۔ مراد نے کہا کہ وہ عورت ہے، اور عورت بھی ایسی کہ دیکھو تو خدا یاد آجائے۔ اور وہاں سے بات چلی اُسکے رنگ کی، اور رنگ تمہیں بنگال اور بہار لے گیا — اچھا بتاؤ، دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟"

"چار" حیران رحیم بولا۔

"چار اور چار؟"

"آٹھ"

"بس ٹھیک ہے" بوڑھا بولا۔ "یہ ہیں تم پڑھے لکھوں کی باتیں۔ ہم بیچارے گنوار، ہم یہ باتیں کیا جانیں۔ ہاں تو مراد تم کہتے ہو چڑیل سانچے میں ڈھلی ہوئی عورت ہے۔ اچھا تو اب یہ بتاؤ کہ اسکے بعد تمھاری آنکھ کھل گئی تھی نا؟"

ایک قہقہہ پڑا اور مراد خفا ہو کر بولا۔ "خواب کی باتیں نہیں دادا یقین نہ آئے تو کل چلو میرے ساتھ، پھر سے جوان نہ ہو جاؤ، تو مونچھیں کتر لینا میری۔"

"مونچھیں تو خیر تم نے پہلے سے کتر رکھی ہیں۔" دادا نے کہا۔ "مگر دیکھو ابھی کیوں نہ چلیں سب کے سب؟"

لیکن مراد نے کہا کہ عورت کا رات کا ٹھکانا اسے معلوم نہیں، اور پھر اس نے اس عجیب و غریب انکشاف کو کھول کر بیان کیا۔ "بات یوں ہوئی کہ گھاس ختم ہو گئی تھی اور ادھر اتری ڈھلان پر کسی بدذات نے رات کی رات وہ ہاتھ صاف کیا ہے

کہ ایک تنکا بھی ملا ہو تو قسم ہے، تم جانتے ہو کہ نوکری سے واپس آکر میں نے وارث سے ایک بیگہ زمین خریدی تھی نہیں چھپی ڈھیریوں میں۔ سو میں نے کہا کہ چڑیل میری ہی تاک میں تو ہوگی نہیں چپکے سے جاؤنگا اور کسی نشیب سے گھاس کاٹ کر بھاگ نکلونگا۔ درانتی کے علاوہ کلہاڑی بھی ساتھ لیتا گیا ـــــ اب کرنا خدا کا کیا ہوا کہ میں پگڈنڈی چھوڑ کر دبے پاؤں لپکا جا رہا تھا کہ اچانک ایک جھاڑی کے پیچھے سے وہ یوں اُٹھی جیسے حقے کا کش لگانے سے چلم پر شعلہ ابھرتا ہے، کلیجہ دھک سے رہ گیا ـــــ وہ بے تحاشہ بھاگی اور جھاڑی سے پرے ڈھلان پر سے اُتر گئی ـــــ وہ جہاں نورے کے ریوڑ پر بھیڑیئے نے حملہ کیا تھا ـــــ بس وہیں ـــــ اچھا تو جب وہ بھاگی ہے تو میں نے اُسکے پاؤں کی طرف دیکھا جو بالکل سیدھے تھے میری تمھاری طرح ـــــ اور چڑیلوں کے پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں نا؟"

"ہاں بھئی چڑیلوں کے پاؤں تو اُلٹے ہوتے ہیں۔" مولوی جی دلچسپی لے رہے تھے

"اور پھر دادا۔ اُسکے گھنے بال یوں اُڑے جیسے ـــــ جیسے کوئی سُرخ بچہ گھنگور گھٹا کے ایک لمبوترے سے ٹکڑے میں دھاگا ڈالکر اُسے اُڑاتا پھرے"

"انسان بن انسان"۔ دادا بگڑ گیا۔ "بھوت پریت کی باتیں نہ کر۔ بادل کا ٹکڑا اُڑاتا پھرے! ابے سیدھی طرح یوں کیوں نہیں کہتا کہ ـــــ جیسے دھوئیں کی لہر یا سیاہ ریشم کا ڈھیر"

مولوی جی بول اُٹھے "اور وہ ماتھے کی بندیا؟ ـــــ وہ بھول گئے؟"

"مگر مولوی جی" مراد نے فریاد کی۔ "مسلمان اور عیسائی اور پارسی سبھی

عورتیں بندیا لگاتی ہیں شہروں میں۔ ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور پھر بندیا یا کڑے یا عنیو یا مسواک سے بیچاری انسانیت پر تو کوئی آنچ نہیں آتی۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔"

دادا بولا۔" سچ مچ مولوی جی۔ وہ آپکو وہاب مجذوب تو یاد ہوگا جسکے سر پر ہمنوں کی سی اتنی لمبی چُٹیا تھی۔ اور ماتھے پر تلک لگاتا تھا اور قرآن مجید کا حافظ تھا اور کنوئیں میں اُتر کر خدا کو یاد کرتا تھا!"۔

مولوی جی نے کہا۔" ہاں بھئی۔ وہاب مجذوب کسے یاد نہیں۔ وہ نہ ہوتا تو اُس سال علاقہ قحط کی لپیٹ میں آجاتا، مگر اُس نے ایکبار عصا اُٹھا کر اسے آسمان میں جیسے چھوڑ دیا۔ اور وہ بارش ہوئی۔ وہ بارش ہوئی کہ ندیاں نالوں میں نالے دریاؤں میں بدل گئے تھے۔"

"کون جانے یہ بھی کوئی مجذوب عورت ہو!" دادا نے کہا، تب لوگوں کے چہروں پر سنجیدگی چھا گئی، اور مراد نے حالات کے اس نئے پلٹے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُٹھ کر جانا چاہا۔

"بھئی پورا قصہ تو سُناؤ۔" لوگوں نے تقاضہ کیا۔

اور وہ بولا۔" چلو نہیں سُناتے۔ جُھوٹ تھا سب کچھ، اُسکے بعد آنکھ کُھل گئی میری ـــ بس؟ ـــ اب تشفی ہوگئی ہوگی تم سب کی۔"

دادا نے بھی ہجوم کے بدلتے ہوئے تیور بھانپ لئے تھے۔ بولا" بھئی بات سے بات نکل آئی تھی ورنہ ـــ"

ایکدم سب لوگ چِلّا اُٹھے۔" اب اس قصّے کو ختم بھی کرو چچا ـــ ہاں تو

مراد بھیا، پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا مراد بناوٹی ناراضامندی سے بولا۔ "بس میں اُسکے پیچھے پیچھے گیا اور — اور جب نشیب میں اُترا تو کیا دیکھتا ہوں، کہ وہ چقماق کے ٹکڑوں کی اتنی بڑی ڈھیری سی لگائے بیٹھی ہے، — چُپ چاپ۔ پلکیں تک نہیں جھپکتیں اسکی — اور جب مجھے دیکھا تو اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اور چلانے لگی۔ "چلے جاؤ۔ چلے جاؤ، مجھے چھوؤ نہیں — مجھ سے دُور رہو چلے جاؤ۔" اور وہ ہاتھوں میں مُنہ چھپا کر زیادہ شدّت سے رونے لگی — میں نے اپنی پوٹلی کھول کر کہا۔ "یہ کھانا رکھے جا رہا ہوں تمھارے لئے" — اور پھر میں چلا آیا۔

لوگ گلیوں میں بکھر گئے، اور دوسرے روز فجر کی نماز کے بعد مولوی جی نے نمازیوں کو روک کر کہا۔ "یہ ضروری نہیں کہ ولی اور قطب، ابدال اور مجذوب صرف مردوں میں سے اُٹھیں۔ عورتیں بھی تو انسان ہیں، اگرچہ اس مجذوب عورت کے ماتھے پر بندی کا نشان ہے، مگر کون جانے کہ یہی نشان اُسکی بزرگی پر دال ہو — اس مجذوب عورت کو ہمارے علاقے میں اُتار کر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا ہے اسلئے بھائیو، اسکی قدر کرو۔ اسکی خدمت کرو۔ اور یقین کرو کہ —" اور اُن کی آواز فرطِ گریہ سے بھّرا کر گھُٹ گئی، اور وہ رسمی سی دعا مانگ کر چادر سے آنکھیں پونچھتے منبر پر سے اُتر آئے۔

اُسی روز مولوی جی سے مشورہ کر کے ذیلدار نے چوپال پر پنچایت بُلائی اور فیصلہ ہوا کہ باری باری ہر شخص اُسے خوراک پہنچایا کرے۔ تین چار سو گھروں کا گاؤں ہے، مدتوں کے بعد دوسری باری آئیگی۔ جب ایسے لوگ کہیں ظاہر ہوتے ہیں تو

مطلب یہ ہوتا ہے کہ سنبھل جاؤ، خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔"

رحیم سنبھل کر بولا "مگر ابا جان۔ ایک عورت کیلئے اسقدر اہتمام! اور ہندوستان کے وہ کروڑوں باشندے جنکے پاس کھانے کو ایک ٹکڑا نہیں تن ڈھانکنے کو ایک دھجی نہیں ـــــ انکے بارے میں کیا سوچا ہے آپنے؟"

"کیوں بے مراد" مولوی جی نے رحیم کی بات کاٹ دی "کپڑے تو پہن رکھے ہیں نا اُس نے؟"

"جی ہاں اُستاد جی"۔ مُراد بولا۔ "ہیں تو سہی مگر ذرا ـــــ میرا مطلب ہے ـــــ زرا واجبی سے ہیں۔"

"اِن لوگوں کو لباس کی کیا پروا" مولوی جی نے تسبیح کی گردش تیز کردی جو ساری ننگ دھڑنگ انسانیت کو ڈھانپنے نکلے ہوں، جنکی لَو صرف خدا سے لگی ہے، اور جنکا بستر گھاس اور چھت آسمان ہے، اور تارے چراغ ہیں اور پھول ساتھی ہیں اور ـــــ"

"اور چیتھڑوں کے ٹکڑے ـــــ ڈھیروں کے ڈھیر" مراد بولا۔

ادھر سے رحیم چلّایا "اور آندھیاں اور سیلاب اور بجلیاں۔ جُھلساتی ہوئی دُھوپ اور مہاوٹ کی راتیں۔"

مگر رحیم کی طرف کسی نے توجہ نہ کی، اور گاؤں والے مجذوب عورت کے پاس ہر روز صبح و شام کھانا پہنچانے کی سکیم پر یُوں عمل کرنے لگے، جیسے وہ کچھ عرصہ پہلے تھانیدار کیلئے انڈے اور جنگل کے داروغہ کیلئے گھی اور صاحبِ ضلع کیلئے شہد کے مرتبان مہیا کرتے تھے۔

مسجدیں خلافِ معمول نمازیوں سے بھری رہنے لگیں۔ گاؤں پر ایک ہیبت افزا سناٹا چھایا رہنے لگا۔ اور عورتیں راتوں کو سونے سے پہلے رو رو کر دعائیں مانگتیں "ماں تم جو ویران ڈھیریوں پر رہتی ہو، اور گلابی چقماق جمع کرتی ہو، اور سنسان گھاٹیوں میں گھومتی ہو۔ تم جس نے دنیا پر لات مار کر صرف اپنے پیدا کرنے والے کی ذات سے لَو لگا رکھی ہے۔ تم ہمارے کھیتوں پر باراشیں برساؤ اور ہماری اولاد پر رحمتیں چھڑکو۔"

چند ہی مہینوں میں مجذوب عورت نے دیہاتیوں کے ذہنوں میں جو حیثیت اختیار کر لی جو گاؤں کی مسجد یا پنگھٹ یا مدرسے کی تھی۔ آہستہ آہستہ نواحی دیہات سے بھی لوگ آنے لگے۔ اور مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر اور ان ڈھیریوں کی طرف رُخ کر کے منتیں ماننے لگے "میرا لڑکا خیریت سے واپس آئے۔" "میری بیٹی کی بیماریاں دُور ہو جائیں۔" "میرے بیلوں کے کھُر ٹھیک ہو جائیں ——" اور پھر بڑے دنوں کی چھٹیوں میں جب رحیم گاؤں آیا تو بولا "یہ دعا کیوں نہیں مانگتے کہ ملک کے آزاد ہو جانیکے بعد ہم لوگ آزاد قوموں کی طرح زندہ رہنا سیکھیں، اور جمے ہوئے لہو کی تہوں کو اپنے ذہنوں پر سے کھرچ دیں جنھوں نے ہماری انسانیت کو چھپا رکھا ہے۔ نہ جانے غیروں کی بندگی کا کلنک ہمارے ماتھوں پر سے کب مٹیگا! —— نہ جانے ——" مگر دادا نے اُسے ہمیشہ کی طرح ٹوک دیا۔ "بھولے بچے فرشتوں نے ہم لوگوں کو سجدہ کیا تھا، اب ان سجدوں کی سزا ہمیں کو تو بھگتنا ہے، بندگی ہماری قسمت میں ہے بچے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو دادا" رحیم کا سارا علم اُسکے حلق میں آکر پھنس گیا "تم کیا جانو کہ ہم نے آزادی کو اپنے ہی لہو میں بھگو کر پلید کر دیا ہے، اور یہ

عمل ابتک جاری ہے، ابتک ہمارے گھروں اور سڑکوں اور کھیتوں پر لاشیں بکھری پڑی، اور بچے کچلے پڑے ہیں۔ اور عورتوں کے جسموں پر عصمت کی ایک دھجی تک باقی نہیں، تم کیا جانو دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔"

دادا ہار ماننے والا کب تھا۔ "وہی کچھ ہو رہا ہے جو یہ مجذوب عورت ہمیں روز دکھاتی ہے، چقماق ٹکرا رہے ہیں، چنگاریاں جھڑ رہی ہیں اور اسوقت تک جھڑتی رہینگی جب تک سب چقماق گھس نہیں جاتے۔"

"چقماق بھی گھس جاتے ہیں دادا؟" مراد نے بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔

"ابے گھستے نہیں تو ٹوٹتے ضرور ہیں۔" دادا اپنے نظریے کے محور کے گرد برابر گھوم رہا تھا۔

اور اچانک مراد نے دور بھوری پہاڑیوں پر نظریں دوڑائیں۔ اور وہ اپنے ذہن میں الٹی زقند بھر کر پھر سے ایک شریر بچہ بن گیا ـــــ وہ ہمجولیوں کے ہمراہ چقماق تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ چوٹیوں سے اتر کر وہ ڈھلانوں پر گھوما۔ اور وہاں سے وادیوں میں اتر آیا۔ برساتی نالوں کے گول گول پتھروں میں پھنسے ہوئے چقماق چنتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ یہ پہاڑ اور وادیاں اپنے آتشیں خزانے لٹا چکی ہیں۔ ان گلابی قاشوں کے سوا جو اس کی اور اسکے ساتھیوں کی جھولیوں میں تھیں۔ گھاٹیوں پر دور دور تک بکھرے ہوئے پتھر گلابی اور اودے رنگ سے خالی ہیں، زمین کی کوکھ کا شعلہ بجھ چکا ہے اور یخ بستہ کہر چاروں طرف سے سمٹا آرہا ہے، اسے جکڑ رہا ہے۔ اسے بھینچ رہا ہے۔

"مراد" دادا نے اسے جھنجھوڑا۔ "قاہرہ کی گلیاں تو یاد نہیں آرہیں؟"

"نہیں دادا" مراد نے لمبے لمبے پٹوں سے ڈھکے ہوئے سر کو جھٹکایا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ یہ مجذوب عورت سارا دن چقماق سے چقماق بجاتی رہتی ہے مگر ان گھاٹیوں پر اتنے چقماق کہاں سے آئے کہ گھسیں بھی، ٹوٹیں بھی اور ختم بھی نہ ہوں"۔

"سچ مچ" دادا بولا "چقماق تو ختم ہو جائینگے"۔

ذیلدار نے آگے بڑھ کر کہا۔ "بھئی سچ مچ اگر چقماق ختم ہو گئے تو"۔

اور ذیلدار کی بات کئی زبانوں کی مسافتیں طے کرتی مولوی جی کے کانوں میں جا گھسی اور انھوں نے نماز کے بعد مقتدیوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"یا ایّہا المومنین! اللہ تعالیٰ اجل شانہٗ نے ہر کسی کو الگ الگ کام سپرد کر رکھے ہیں۔ تم ہل چلاتے ہو اور اناج پیدا کرتے ہو۔ یہ فقیر تقصیر پر ور دگار بے ہمتا کے احکام سناتا ہے اور تمھیں اپنی عاقبت سنوارنے کو کہتا ہے۔ اور وہ مجذوب عورت جس نے کسی خدائی اشارے سے ہماری پہاڑیوں کو نوازا۔ دن بھر چقماق رگڑتی اور چنگاریاں برساتی ہے دنیا داروں کیلئے اُسکا یہ شغل بے معنی ہے لیکن اصل میں ان مجذوبوں کی ہر حرکت میں کروڑوں آسمانی راز چھپے ہوتے ہیں۔ مجھ سے پوچھو کہ جب میں چلہ کاٹ رہا تھا، تو میرے قریب ایک مجذوب آکر بیٹھ گئے، چالیس دن بیٹھے رہے، اور جانتے ہو کیا کرتے رہے؟ زمین کے ایک ڈبے میں کنکر بجاتے رہے۔ دن رات وہ اس ڈبے کو بجاتے اور بچوں کی طرح روتے اور جس روز انھوں نے ڈبے کو زمین پر پٹخ دیا تو جانتے ہو کیا ہوا؟ سنہ چودہ کی لام شروع ہو گئی"۔

"سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ دیہاتیوں نے پہلو بدلے۔

"اور اب میرے بزرگو! میرے دوستو! یہ مجذوب عورت چقماق سے چقماق بجاتی ہے اور چنگاریاں برساتی ہے۔ نہ جانے کیا کچھ ہونیوالا ہے۔ مگر قبل اسکے کہ کچھ ہو، ہمیں کوشش کرنی چاہیئے، کہ خاتون ہم سے مایوس ہوکر کسی اور طرف نہ نکل جائے تم جانتے ہو کہ ہماری پہاڑیوں پر اکا دکا ہی چقماق نظر آتے ہیں، اور یہ ختم ہو جائینگے اور اسطرح رحمت کی بارش ختم ہو جائیگی — اور میرے بھائیو! یہ عورت تو خدا کا خاص کرم ہے، ورنہ ہم گنہگار کس لائق ہیں — ہم بدبخت جو جانتے ہیں کہ مسجد کے تیل کا کنستر پرسوں ختم ہو چکا ہے۔ مگر —"

مولوی جی تیل کے کنستر کے بارے میں بہت سی باتیں کرتے رہے مگر سب لوگوں کے دلوں میں چقماق جمع کرنے کی دُھن سما چکی تھی۔ اور یہ بات گاؤں گاؤں گھوم گئی کہ مجذوب عورت کو چقماق کے ڈھیر چاہئیں۔ اور پھر چند ہی دنوں کے بعد علاقے بھر کے لوگ سروں پر چقماق بھری ٹوکریاں رکھے۔ گدھوں پر چقماق کی بوریے لادے اس گاؤں میں آنکلے اور جب مسجد کے صحن کے ایک کونے میں چقماق کی ایک پہاڑی سی اُبھر آئی تو پنچایت نے مل کر فیصلہ کیا کہ کل ان پتھروں کو اونٹوں پر لاد کر چپکے سے گھاٹی میں پھینک آنا چاہیئے۔

"تم لوگ" رحیم نے تیز تیز چلتے ہوئے دادا اور مراد کو گلی کے موڑ پر روک لیا۔ "تم اُجڈ لوگ —"

دادا نے بھڑک کر کہا۔ "اور تمھارا ابا مہا اُجڈ ہوا کہ گاؤں بھر کا سردار رہا — خفا نہ ہونا بھئی۔ غریبی اُجڈپنا نہیں، غریبوں کو اُجڈ نہ کہا کرو۔ سمجھے؟ اگر میں پڑھا لکھا ہوتا تو سچ کہتا ہوں صوبے کی لاٹ صاحبی تو کہیں نہیں گئی تھی۔"

"سُنو تو دادا" رحیم بولا "تمھیں تو ہمیشہ مذاق کی سُوجھتی ہے تم ـــ تم سادہ مزاج لوگ ہو، تم ابتک خان بہادروں اور نواب زادوں کیلئے خون کے بنک ہو ـــ تم اب تک ـــ"

"بھئی کچھ کہنا ہے تو کہہ بھی چکو" دادا جھلا گیا "کیسی کاٹی کتری باتیں کرنے لگے ہو انگریزی پڑھ کے"

"مراد!" رحیم نے رُخ بدلا "میں تم سے باتیں کر رہا ہوں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم پر غیر ملکی حکومت اور حکومت کے کارندوں نے اتنے ظلم توڑے ہیں، کہ تمھیں ذرا سی بھی پناہ مل جائے تو یہ سمجھتے ہو کہ عرش کے دریچے کھُل گئے ـــ تم ساری عمر رئیسوں اور سیٹھوں کی سجائی ہوئی نمائش گاہوں میں بکاؤ پڑے رہو اور ہزار ہزار بار بکتے رہے ہو، اور جب تمھیں کہیں سے ایک تعویذ ملتا ہے تو یوں سمجھتے ہو جیسے قسمت کی نکیل تمھارے ہاتھ میں آگئی"

"بھئی رحیم" مراد بیقرار ہو گیا "دادا اور میں سارباتوں کے ہاں جا رہے ہیں، ساتھ ہی چادروں کا انتظام کرنا ہے تاکہ لوگ چقماق پہنچا کر آئیں تو گاؤں کیطرف سے انکی دعوت ہو جائے سمجھے؟ ـــ ہم ذرا جلدی میں ہیں، تم لاہور کب جا رہے ہو؟"

رحیم نے تیوری چڑھا کر کہا "یہ پاگل عورت تمھیں کہیں کا نہ رکھے گی ـــ"

پاگل عورت! ـــ دادا اور مراد رحیم کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی لپٹ کر مسجد کی محراب کو چُوم رہے تھے۔

دوسرے روز صبح سویرے اُونٹوں کی ایک قطار کو مسجد کی گلی میں لایا گیا، اُونٹوں کے گھٹنوں پر بندھے ہوئے گھنگروؤں اور گلے میں لٹکتی ہوئی گھنٹیوں کی

جھنجھناہٹوں سے سارا گاؤں چونک اُٹھا۔ مولوی جی نے فوراً گھنگرو اور گھنٹیاں اُتار لینے کا حکم دیا، کیونکہ ــــ "میرے بھائیو۔ ایک تو گھنگرو گھنٹی مکروہ ہیں، دوسرے انکی آواز سے مجذوب عورت کو تکلیف ہوگی۔ تمہیں ہم نمائش کیلئے نہیں جارہے یہ چھاق تو معمولی چیز ہے۔ نہ جانے آگے چل کر ہمیں کیا کیا قربانیاں دینا پڑیں۔"

فوراً گھنگرو اور گھنٹیاں اُتار لی گئیں۔ اور یہ چُپ چاپ قافلہ ڈھیریوں کی طرف چلا، دادا اور مُراد قافلہ سالاروں کی حیثیت سے آگے جارہے تھے اور باتیں کررہے تھے۔

"دادا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر اس بزرگ عورت نے ہمیں ٹھکانہ کرلیا تو ہمارا گاؤں اچھا خاصہ قصبہ بنجائیگا، اور چہل پہل ہوجائے گی۔"

"ہولے ہولے" دادا نے سرگوشی کی۔ "کسی نے سُن لیا تو بات چل نکلے گی اور کوئی منچلا شیرینیاں جمع کرنے یہیں کہیں کسی ڈھیری پر اڈہ جمالیگا۔"

"ٹھیک ہے دادا" مراد بولا "مگر کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ یہ عورت آئی کہاں سے؟"

"اللہ نے بھیجی۔"

"اللہ نے تو بھیجی، مگر کہاں سے بھیجی!"

"کہیں سے بھی بھیجی ہو۔ ہمیں اس سے کیا۔ ہمیں آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے؟"

اور مراد نے چُپ سادھ لی۔

جب قافلہ ڈھیریوں کے قدموں میں پہنچا، تو سورج اپنا سارا سونا لُٹا چکا تھا۔ زمین کو جاڑا اکڑنے لگا تھا۔ اور جھاڑیوں کے پتے ٹھٹھر کر گول مول ہونے

لگے تھے۔ ڈھیریاں جیسے اُونگھ رہی تھیں اور یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے دھرتی کی ان سنگین چھاتیوں سے ساری زندگی نچڑ چکی ہے۔

"اُف کیسا ہول سا آنے لگا ہے" دادا بولا "تم یہاں کیسے آتے رہے ہو مراد؟"

اور مراد نے پلٹ کر غور سے ساربانوں کی طرف دیکھا، جنکے مُنہ کھُلے تھے اور جنکے کانوں کی مُندریں جیسے ذکر باری میں جھُوم رہی تھیں، اور اُنکے قدم یُوں ادب سے اُٹھتے تھے جیسے کانچ کے فرش پر چل رہے ہیں۔

مراد نے کئی عجیب سے پھرتے راستوں سے قافلے کی رہنمائی کی اور پھر ایک برساتی نالے کے عین وسط میں چقماق کا ایک سرپلند شعلہ بھڑکا سب کے سب چپکے سے پلٹے، دُور سے دادا نے آواز دی "چلو بھئی مُراد"

اور مراد پکارا "آیا دادا آیا" اور وہ چٹانوں کے بے ہنگم موڑوں پر اُگی ہوئی جھاڑیوں پر بیٹھے ہوئے سبز رنگ کے ٹڈوں کو چونکاتا خاتون کی تلاش کرنے لگا گہرے ٹھنڈوں میں جھانکا۔ برساتی نالوں کے خموں میں بھٹکتا پھرا۔ اور جب ہر طرف جگنو چمکنے لگے اور کہیں دُور سے ایک ٹٹیری اندھیرے میں بلبلائی تو وہ چقماق کے ڈھیر کے پاس آکر پوری طاقت سے پکارا "خاتون!" اسکی آواز چار طرف تالیاں پیٹتی۔ اندھیرے میں گرجتی، پہاڑیوں سے ٹکراتی نشیبوں میں گر گئی اور جواب میں اسے بہت سے کیڈروں کی آوازیں سُنائی دیں۔ جو شاید اسکی آواز سے چونک اُٹھے تھے۔ "خاتون!" وہ پکارا۔ اور پہاڑیوں نے اُسکی آواز کو ہوا میں اُچھال دیا۔ دیر تک فضا جھنجھناتی رہی۔ کیڈروں کی چیخیں تیز تر ہو گئیں اور آس پاس کی جھاڑیوں میں آہستہ آہستہ خاموش ہو گئے۔

حیران اور مایوس ہو کر وہ گاؤں کو پلٹا، اسوقت چوپال پر ایک ہجوم اکٹھا تھا الاؤ کا ایک شعلہ ناچ رہا تھا اور دہقانوں کے سنجیدہ چہروں پر ہراس اور احترام کے ملے جُلے جذبات نے آسیب بکھیر رکھا تھا، مراد نے چوپال پر قدم رکھا تو ہجوم چونکا الاؤ کا شعلہ کمان کی طرح لچک گیا اور دادا پکارا "کیسے عجیب سے لڑکے ہو تم ہم تو سوچ رہے تھے کہ تمھاری تلاش میں چند جوانوں کو بھیجیں مگر کالی ڈھیری سب کے دماغوں پر سوار ہے۔ رحیم میاں کی ہمت بھی جواب دے گئی ہے۔ تم کہاں تھے اب تک ؟"

"وہ چلی گئی ہے کہیں"۔ مراد نے یہ الفاظ پھینک سے دیئے، جیسے وہ دیر سے اُسکے لبوں سے لٹک رہے تھے۔

"کون ؟" دادا کا مُنہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔

"خاتون ؟"

"چلی گئی ؟"

سب پکار اُٹھے "کہاں" ؟

"نہ جانے کہاں"۔

"تم نے اُسے پکارا"۔

"کئی بار"۔

"کہاں کہاں ڈھونڈا"۔

"کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا"۔

"چلی گئی !" ـــــ دادا بے جان سا ہو کر دیوار سے لگ گیا۔

چوپال کے دروازے پر کھڑا ہوا ایک لڑکا تیر کی طرح لپکا اور مسجد کے صحن میں جا کر پکار اُٹھا "مجذوب عورت چلی گئی"۔

"چلی گئی!" نمازی پکار اُٹھے۔

اور پھر آن کی آن میں سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ مسجد کے چراغوں کی چمک سے فق چہروں پر جناتی زردی چھٹی ہوئی تھی۔ دیر تک چہ میگوئیاں ہوتی رہیں! اور آخر متفقہ فیصلہ ہوا کہ کل فجر کی نماز کے بعد سب گاؤں والے ڈھیریوں پر جائیں۔ ایک ایک چٹان ایک ایک جھاڑی کو چھان ماریں، اور اگر خاتون نہ ملے تو دُور تک اس کا کھوج لگائیں! اسکا پیچھا کریں۔ اُسے واپس لے آئیں۔ ورنہ یقین کر لو کوئی ایسا عذاب ٹوٹیگا کہ صدیوں تک اس گاؤں کے کھنڈروں میں کوئی قدم تک نہ رکھیگا"۔

اس رات ہر گھر میں دیئے جلتے رہے، عورتیں تسبیحوں پر درود شریف کا ورد کرتی رہیں! اور مرد دیر تک مسجد میں بیٹھے ذکر الٰہی میں مصروف رہے۔ چوپال کے حقے ٹھنڈے پڑ گئے اور دہقان گٹھڑیوں کیطرح کھٹولوں اور پیال پر سمٹے سکڑے بیٹھے رہے۔ اور جب صبح ہوئی تو مولوی جی مسجد سے باہر آئے۔ گاؤں بھر نے نہایت عاجزی سے دعا کیلئے ہاتھ اُٹھائے اور داد اور مراد کی قیادت میں ایک انبوہ ڈھیریوں کیطرف بڑھا۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ آئی تھیں، ننھے بچے گلیوں میں حواس باختہ سے کھڑے تھے، مولوی جی جگہ جگہ پلٹ پلٹ کر کہتے گئے "اللہ کو یاد کرو اور دعائیں مانگو کہ مجذوب عورت ہمیں مل جائے۔ وہ نہ ملی تو ایک ایسا زلزلہ آئیگا کہ سمندر خشکیوں پر چڑھ دوڑیں گے اور یہ ڈھیریاں جزیرے بنجائینگی۔ اسلئے اللہ کو یاد کرو۔ اللہ کی راہ میں قربانیاں دو اور اللہ کے گھر کو شام کے بعد اندھیرا نہ رہنے دو۔ پرسوں سے"۔

ڈھیریوں کے قدموں پر پہنچ کر ہجوم دادا اور مراد کے مشورے کے مطابق ٹولیوں میں بٹ گیا۔ بکھرتے ہوئے لوگوں کو دونوں دیر تک ہدایات دیتے رہے اور پھر اُس گھاٹی کی طرف چل کھڑے ہوئے جہاں ایکدن پہلے اُنھوں نے چقماق کا ایک مینار سا اُبھارا تھا۔ مینار اسی حالت میں تھا اور گلابی سنگریزوں پر انتظار کی سی کیفیت طاری تھی۔

"وہ جا چکی ہے دادا۔" مراد نے چقماق کے ڈھیر کے پاس رُک کر کہا۔ "وہ جا چکی ہے۔ اب وہ یہاں نہیں آئیگی۔"

"مگر تم نے کالی ڈھیری کو بھی دیکھا؟" دادا نے گھنائونی سی اونچی پہاڑی کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔

"دیکھا نہیں، مگر پکارا ضرور تھا۔" مراد بولا۔ "اور دادا میری پکار خالی خولی پکار نہیں تھی۔ میں میری روح رچی ہوئی تھی۔"

دادا چونکا۔ "روح رچی ہوئی تھی۔" وہ مراد کو گھورنے لگا۔

"ہاں دادا۔" مراد نے ایک چقماق اُٹھا کر مٹھی میں بند کر لیا۔ "اب کہ وہ چلی گئی ہے تمھیں بتا ہی دوں کہ میں نے اُسے ۔۔۔ میں نے اُسے ۔۔۔" مراد کی آواز بھرا گئی۔ پلٹ کر وہ کہیں دور دیکھنے لگا۔ اور پھر چقماق کو ڈھیر پر گرا کر بولا۔ "دادا! تم حیران ہوگئے؟"

دادا کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "میرے خیال میں اب لوٹ چلیں تو بہتر ہے۔ وہ جا چکی ہے۔ اُسے چلے جانا چاہیئے تھا۔"

مراد نے حیرت سے دادا کی طرف دیکھا۔ "کیا محبت کرنا گناہ ہے دادا؟"

دادا نچلے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر کچھ سوچتا رہا۔

"دادا" مراد پکارا۔ اور بوڑھے کو خاموش پا کر آگے بڑھ گیا۔
"مراد" بہت دیر کے بعد دادا نے اُسے آواز دی۔ مگر مراد کالی ڈھیری کا کافی حصہ طے کر چکا تھا۔
"مراد" دادا وحشت زدہ سا ہو کر مراد کی طرف بھاگا "دیکھو مراد سکندر کے زمانے سے لیکر اب تک اس ڈھیری پر کوئی نہیں گیا۔ چڑیل کی روح ہماری کھوپری کا گودا تک نوچ لیگی، وہ وہاں موجود ہے۔ وہ سینکڑوں صدیوں سے وہاں موجود ہے۔ مراد ۔۔۔ مراد"
مگر مراد مشتاق کو وہ نوردوں کی طرح لپکا چلا گیا۔ اور دادا اُسے پکارتا رہا۔ اور پہاڑیاں گونجتی ہیں آس پاس بکھرے ہوئے لوگ۔ دادا کی طرف بھاگے۔ اور جو ایک ہجوم کالی ڈھیری کے قدموں میں جمع ہو گیا، تو دادا بولا "اب وہ نہیں آئیگا۔ مجذوب عورت نے ہمسے یہ پہلی قربانی لی ہے۔۔۔ مگر دوستو کتنی بڑی قربانی۔ مراد کی قربانی!" وہ اچانک بچوں کی طرح رونے لگا۔ اور پھر جلی بھنی چٹانوں کا رُخ کر کے بلبلایا "مراد۔ او مراد"
"اب وہ نہیں آئیگا۔ مولوی جی بولے۔ "ابھی سکی کھوپری چٹخنے کی آواز آئیگی اور"
"مولوی" دادا یوں گرجا جیسے اُسنے مولوی جی کو کوئی زبردست گالی دیدی ہے۔ ہجوم دم بخود رہ گیا۔ اب دادا پھر سے رونے لگا "وہ آئیگا۔ مُراد آئیگا۔" آنکھیں پھیر کر اس نے کالی بھنگ چٹانوں کی طرف دیکھا اور پھر سر جھٹک کر بولا "نہیں۔ وہ اب نہیں آئیگا"
کافی دیر تک لوگ دادا کو سمجھاتے رہے کیونکہ اسپر دیوانگی سی طاری تھی۔ سکی

آنکھیں اُجڑی گئی تھیں اور اُسکے ہونٹ کچھ اس انداز میں کُھلے تھے، جیسے وہ برسوں کا پیاسا ہے مولوی جی نے تسبیح کو بے تحاشہ گھماتے ہوئے دادا کے جسم پر کئی بار اپنا آنچل برسایا۔ اور بکھرے ہوئے لوگ جمع ہوتے رہے اور مشورے ہوتے رہے کہ مراد کو کالی ڈھیری سے کیسے اُتارا جائے۔

"کیسے اُتارا جائے!" رحیم ہجوم میں سے پکارا۔ دادا کو اگر مراد سے اتنی ہی محبت ہے تو ہمت کرے۔ ہم تو بھئی کوئی اچھی سی موت مریں گے قوم کی خاطر اپنی جان دینگے سکندر کے زمانے کی چڑیل کے ہاتھوں میں اپنی کھوپڑی کو گیند کیوں بننے دیں!"

"تم میں سے خدا کی ذات پر کس کو یقین ہے؟" دادا کسی ایسے جذبے سے پکارا کہ اُسکی گردن کی رگیں پھول گئیں اور داڑھی کے بال اکڑ گئے۔

"ہم سبکو اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ کی ذات پر یقین ہے۔" مولوی جی نے تسبیح کو مٹھی میں سمیٹ کر سارے گاؤں کی نمائندگی کی۔

"خدا کی ذات بڑی کہ چڑیل کی؟" دادا جیسے ہجوم کا امتحان لے رہا تھا۔

مولوی جی غصّے اور طنز سے ہنسے۔ "یہ کفر کا کلمہ ہے دادا! سنبھل کر بولو۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ خداوند تعالیٰ سب سے بڑے ہیں۔"

"تو پھر چلو۔" اُسنے سپہ سالاروں کیطرح باہیں ہوا میں لہرائیں اور وہ کالی ڈھیری پر چڑھتے ہوئے بولا۔ "خدا کی ذات پر بھروسا ہے تو چلو میرے ساتھ۔"

"ارے!" مولوی جی نے تسبیح رولنا شروع کر دی۔

"دماغ چل گیا ہے۔" رحیم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

گاؤں والے ایک لمحہ کیلئے خاموش رہے اور پھر یکبارگی پکار اُٹھے۔ "دادا"

مگر دادا آگے بڑھتا چلا گیا۔

"دادا" گاؤں والوں کی پکار بلند تر ہو گئی۔

اور دادا چٹانوں کے کناروں کو جکڑتا، سوکھی ٹہنی جھاڑیوں کو تھامتا لپکا چلا گیا اور پھر اچانک ہجوم کے قدموں تلے کنکر چیخ اٹھے۔ لوگ ڈھیری کی طرف لپکے۔

"دادا" وہ چلائے "ہم بھی آ رہے ہیں دادا" ــــ دادا نے پلٹ کر دیکھا۔ ہجوم اسکی طرف بڑھ رہا تھا۔ البتہ مولوی جی سر جھکائے تنہا کھڑے تھے اور ہجوم کو کھلی آنکھوں سے گھور رہے تھے اور تسبیح رواں دواں تھی ــــ اور رحیم مولوی جی اور ہجوم کے درمیان ڈھیری چڑھنے کی بیوں کوشش کر رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار اسکے قدموں نے کنکر نکوس کیا ہو۔

ہجوم دادا کے پاس پہنچا ہی تھا کہ چوٹی پر سے آواز آئی "دادا"۔

یہ آواز فضا میں چکراتی ہوئی ہر طرف گونج گئی اور مولوی صاحب ایک بچے کی طرح بک کر ایک چٹان پر چڑھ گئے اور رحیم نے طے کی ہوئی مسافت اٹھے قدموں سے پھر سے طے کر لی۔

"دادا" جیسے کالی ڈھیری کی چوٹی پکاری

اور دادا نے نہایت مشکل سے جواب دیا۔ "مرا دیتا"۔

"وہ نہیں گئی ــــ وہ یہیں ہے" آواز آئی۔

اور ہجوم یہ سنکر اس تیزی سے چوٹی کی طرف بھاگا کہ لڑھکتے ہوئے پتھروں سے بچنے کیلئے مولوی جی برساتی نالے کے کنارے تک ہٹ گئے اور رحیم اس تیزی سے چوٹی کی طرف بڑھا جیسے چٹانوں اور جھاڑیوں پر سے تیرتا ہوا جا رہا ہے۔

آن کی آن میں ہجوم چوٹی پر جا پہنچا اور پھر یوں تھم گیا جیسے اسکے سامنے

یکایک ایک دیوار اُبھر آئی ہے سب کی آنکھیں پتھرا گئیں اور چہرے فق ہو گئے۔
سامنے مُراد ایک روتے ہوئے نوزائیدہ بچے کو بازوؤں پر اُٹھائے کھڑا تھا اور وہ کہہ رہا تھا "تم حیران ہو رہے ہو دادا؟ پر اس میں حیرانی کی کونسی بات ہے۔ یہ تو ایک نیا انسان ہے۔ پچھلے چیت کی حیوانیت نے اُسے جنم دیا ہے۔ یہ تو منوں بہے ہوئے لہو کا جوہر ہے۔ تم ایک دوسرے کو مبارکباد کیوں نہیں کہتے۔ دیوانی انسانیت کی کوکھ سے نکلے ہوئے اس نئے انسان کو تم ہاتھوں ہاتھ کیوں نہیں لیتے اور تم یہاں میرے پاس آکر اور اس چوٹی پر کھڑے ہو کر ساری دنیا کو یہ کیوں نہیں بتاتے کہ دھرتی کی اُجڑی ہوئی مانگ کا سیندور پھر سے چمک اُٹھا ہے — دادا — دادا"

"مگر اس عورت کے ماتھے پر تو بندیا کا نشان تھا" نیچے سے مولوی جی نے ایک اعتراض اُچھالا اور مُراد پکارا "مگر بچے کا ماتھا تو چاند کا ٹکڑا ہے"۔

"چڑیلوں کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں" مولوی جی نے جیسے ساری دنیا کو سرزنش کی ہجوم یکدم دادا کی قیادت میں رحیم سمیت نیچے کی طرف پلٹا۔ اور مُراد انسانیت کی نئی نویلی امانت کو اپنے ہاتھوں پر بلند کر کے پکارا "کیا تم میں ایک انسان بھی ایسا نہیں جو اس نئے انسان کو اپنی دھرتی کی جنت میں بسالے؟ — اگر نہیں تو یاد رکھو کہ جنت سے نکالا ہوا انسان اپنی ایک نئی دھرتی اور ایک جنت بسانے پر بھی قادر ہے — اور یہ جنت تمہاری جنت کے کھنڈروں پر اُبھرے گی۔ سُنتے ہو — ارے سُنتے ہو؟"

جواب میں چٹانیں تالیاں پیٹتی رہ گئیں۔

بابو گوپی ناتھ

سعادت حسن منٹو

صفحات :— ۲۴

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار اخبار ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا میں اسوقت لیڈر لکھ رہا تھا سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا۔

"منٹو صاحب بابو گوپی ناتھ سے ملئے"

میں نے اٹھکر اُس سے ہاتھ ملایا سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ "بابو گوپی ناتھ تم ہندوستان کے نمبر ون رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے لوگوں کا۔ ایسی ایسی کنٹی نیوٹنی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلہ لکھا تھا۔ آپ نے منٹو صاحب بس خورشید نے کار خریدی ــــ اللہ بڑا کارساز ہے کیوں بابو گوپی ناتھ ہے نا انٹی کی پنٹی پوہ"

عبدالرحیم سینڈو کا باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا کنٹی نیوٹنی، دھڑن تختہ، اور پنٹی کی پو ایسے الفاظ اسکی اپنی اختراع تھے جنکو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا میرا تعارف کرانیکے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا جو بہت مرعوب نظر آرہا تھا "آپ ہیں گوپی ناتھ — بڑے خانہ خراب — لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں۔ ماتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے"

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے اپنے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا "نمبر ون بیوقوف ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ انھیں مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں میں صرف باتیں کر کے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں بس منٹو صاحب یہ سمجھ لیجئے کہ بڑے اینٹی فلوجسٹین قسم کے آدمی ہیں — آج شام کو انکے فلیٹ پر تشریف لائیے۔

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا چونک کر کہا "ہاں ہاں ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب"

"کیوں سینڈو کیا آپ کچھ اسکا شغل کرتے ہیں؟"

عبدالرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا "اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں — تو منٹو صاحب آج شام کو ضرور آئیگا — میں نے بھی پینی شروع کر دی ہے اس لئے کہ مفت ملتی ہے"

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتہ بتا دیا جہاں میں حسب وعدہ شام کو ۶ بجے کے قریب پہنچ گیا تین کمروں کا صاف ستھرا فلیٹ تھا جسمیں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں

موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں تہمد پوش پنجاب کا ٹھیٹ سائیں گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔ سینڈو نے اُسکے بارے میں کہا "آپ بابو گوپی ناتھ کو انگل ایڈوائز ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جائیے آپ۔ ہر آدمی جسکی ناک بہتی ہو یا منہ میں سے لعاب نکلتا ہو پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش پہنچا تا ہے۔ یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہوئے ہیں کیونکہ انھیں وہاں کوئی اور بیوقوف ملنے کی اُمید نہ تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور سکاچ وسکی پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو۔۔۔۔"

غفار سائیں یہ سُنکر مسکراتا رہا۔

دوسرے مرد کا نام تھا غلام علی۔ لمبا تڑنگا جوان، کسرتی بدن، مُنہ پر چیچک کے داغ۔ اسکے متعلق سینڈو نے کہا "یہ میرا شاگرد ہے اپنے اُستاد کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اسپر عاشق ہوگئی۔ بڑی بڑی کٹنی نیوٹنیاں ملائی گئیں اسکو پھانسنے کیلئے مگر اس نے کہا ڈوآر ڈائی میں لنگوٹ کا پکّا رہوں گا۔ ایک تکیئے میں پیتے ہوئے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہوگئی بس اُسی دن سے یہ اُسکے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ ہر روز کریون اے کا ایک ڈبہ اور کھانا پینا مقرر ہے"۔

یہ سُنکر غلام علی بھی مُسکراتا رہا۔

گول چہرے والی ایک سُرخ و سفید تندرست عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی کشمیر کی کبوتری ہے جسکے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے ایسا لگتا تھا کٹے

ہوئے ہیں مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں، چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بیدار مغز اور تجربہ کار ہے۔ سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا "زینت بیگم ـــــ بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ ناٹکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اُڑے۔ مقدمہ بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک عیش کرتی رہی۔ آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اُسے یہاں لے آئے ـــــ دھڑن تختہ!"

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگرٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سُرخ تھیں جس سے کافی بیحیائی مترشح تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اسکی طرف اشارہ کیا گیا اور سینڈو سے کہا "انکے متعلق بھی کچھ ہو جائے"

سینڈو نے اس عورت کی ران پر زور سے ہاتھ مارا۔ اور کہا "جناب یہ ہے ٹین پٹوٹی فل فل نوٹی مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم ـــ آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا دو برس میں ہی میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوالیا ہے تاکہ میرا دل لگا، اسکو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن ہیں ملتا ہے۔ ہر روز شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے مگر ویسے ٹٹ فار ٹیٹ قسم کی عورت ہے"۔

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا "بکواس نہ کر" اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔ سب سے متعارف کرانیکے بعد سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیئے۔ میں نے کہا "چھوڑو یار۔ آؤ کچھ اور

باتیں کریں۔"

سینڈو چلایا "وسکی اینڈ سوڈا بوائے ــــ وسکی اینڈ سوڈا ــــ بابو گوپی ناتھ لگاؤ ہاتھ سبزے کو" بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک بلندہ نکالا اور۔ ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لیکر اسکی طرف دیکھا اور اُسے کھڑکھڑا کر کہا۔ "او گاڈ ــ او میرے ربّ العالمین وہ دن کب آئیگا۔ جب میں لب لگا کر سو سو کے نوٹ یوں نکالا کرونگا ــــ جاؤ بھئی غلام علی دو بوتل جانی واکر سٹل گوئنگ سٹرانگ لے آؤ۔"

بوتلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسبِ معمول عبدالرحیم سینڈو نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے چلایا۔

"دھرتی تختہ منٹو صاحب وسکی ہو تو ایسی ہو حلق سے اُتر کر پیٹ میں انقلاب زندہ باد کہتی چلی گئی ہے ــــ جیو بابو گوپی ناتھ۔ جیو ــــ"

بابو گوپی ناتھ بیچارہ خاموش رہا۔ کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس شخص کی اپنی کوئی رائے نہیں۔ دوسرا جو بھی کہے مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں میں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو کے اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دورانِ گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اسکا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ کہ وہ کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ چنانچہ میں نے

اُسے ایکبار کہا۔ "بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

وہ چونک پڑا "جی . . میں . . . . ہیں . . . نہیں تو" یہ کہکر وہ مسکرایا۔ اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی "اُن حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں ـــ اور ہمیں سوچ کیا ہوگی"۔

سینڈو نے کہا "بڑے خانہ خراب ہیں یہ منٹو صاحب" "بڑے خانہ خراب ہیں ـــ لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جسکے ساتھ بابو صاحب کی کنٹی نیوٹنی نہ رہ چکی ہو . . . ."

بابو گوپی ناتھ نے یہ سنکر بڑے بھونڈے انکسار کیساتھ کہا "اب کہاں میں وہ دم نہیں رہا منٹو صاحب"۔ اسکے بعد واہیات گفتگو شروع ہوگئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی۔ کون نٹنی تھی، کون کس کی نوچی تھی نتھنی اُتارنے پر بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار سینڈو غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی، اٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں مطلب تو میں سمجھتا رہا مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اُسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ہلکی وسکی کا اُس نے ایک گلاس بھی پیا بغیر کسی دلچسپی کے سگرٹ پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ اُسے تمباکو اور اُس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگرٹ اسی نے پیئے۔ بابو گوپی ناتھ سے اُسے محبت تھی۔ اسکا پتہ مجھے کسی بات سے بھی نہیں ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اسکا کافی خیال تھا۔ کیونکہ صرف زینت کی آسائش

کیلئے ہر سامان مہیا تھا لیکن ایک بات مجھے بہت محسوس ہوئی کہ ان دنوں میں کچھ عجیب سا کھچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایکدوسرے کے قریب ہونے کی بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار ڈاکٹر حمید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اُسے مورفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پیگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اُٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کیلئے بھیجا گیا۔ سینڈو نے جب اپنی دلچسپ بکواس کچھ عرصہ کیلئے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جواب نشے میں تھا۔ زینت کی طرف دیکھا عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا "منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپکا کیا خیال ہے؟"

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہدیا "بڑا نیک خیال ہے" بابو گوپی ناتھ خوش ہو گیا "منٹو صاحب ہے ہی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا جانِ من مرکان بنوا دوں ــــ جواب کیا دیا معلوم ہے آپکو؟ ــــ کیا کرونگی مکان لیکر .... میرا اور کون ہے؟ .... منٹو صاحب موٹر کتنے میں آجائے گی؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم نہیں"

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا "کیا بات کرتے ہیں آپ منٹو صاحب۔ آپکو اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلئے میرے ساتھ زینو کیلئے موٹر لیں گے میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبے میں موٹر ہونی ہی چاہیئے"

زینت کا چہرہ ردِ عمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ ہمہ تن جذبات ہو کر

اُس نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب آپ بڑے لائق آدمی ہیں ہیں تو بالکل گدھا ہوں ـــ لیکن آپ مجھے بتائیے کہ میں آپکی کیا خدمت کر سکتا ہوں کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپکا ذکر کیا۔ میں نے اُسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس ـــ مجھ سے گستاخی ہوگئی ہو تو معاف کر دیجیگا ـ بہت گناہگار آدمی ہوں ـــ وسکی منگاؤں آپکے لئے اور؟"

میں نے کہا "نہیں نہیں بہت پی چکے ہیں"۔

وہ اور زیادہ جذباتی ہوگیا "اور پیجئے منٹو صاحب" یہ کہکر اُس نے جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلندہ نکالا۔ ایک نوٹ جُدا کرنے لگا لیکن میں نے سب نوٹ اُسکے ہاتھ سے لے لئے اور واپس اُسکی جیب میں ٹھونس دیئے "سو روپے کا ایک نوٹ غلام علی کو دیا تھا۔ اسکا کیا ہوا؟" مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہوگئی تھی بابو گوپی ناتھ سے کتنے آدمی جونک کی طرح اس غریب سے چمٹے ہوئے تھے میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مُسکرا کر کہنے لگا "منٹو صاحب اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام علی کی جیب میں سے گر پڑ گیا ـ ـ ـ ـ" بابو گوپی ناتھ نے پورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دُکھ کیساتھ اطلاع دی کہ ہوٹل میں سے کسی حرامزادے نے اُسکی جیب میں سے سو روپے نکال لئے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھکر مُسکرایا سو روپے کا ایک نوٹ جیب میں سے نکالا اور غلام علی کو دیکر کہا "تو جلدی کھانا لیکر آؤ"۔ پانچ چھ ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اسکے بہت سے حالات

معلوم ہوئے جو بیحد دلچسپ تھے۔

پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چُغد ہے غلط ثابت ہوا۔ اسکو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو اغفار سائیں۔ غلام علی اور سردار وغیرہ جو اسکے مصاحب بنے ہوئے تھے مطلبی انسان ہیں۔ وہ اُن سے جھڑکیاں گالیاں سب سُنتا تھا لیکن کبھی غصّے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا۔ "منٹو صاحب میں نے آجتک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔ جب بھی مجھے کوئی رائے دیتا ہے میں کہتا ہوں سُبحان اللہ۔ وہ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں لیکن میں نہیں عقلمند سمجھتا ہوں۔ اسلئے کہ اُنمیں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بیوقوفی کو شناخت کرلیا جس سے اُنکا اُلّو سیدھا ہو سکے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے اُن سے کچھ محبت سی ہوگئی ہے۔ میں اُنکے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے۔ جب میری دولت ختم ہوجائیگی تو میں کسی تکئے میں جا بیٹھونگا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار یہی دو جگہیں ہیں۔ یہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائیگا۔ اسلئے کہ جیب خالی ہونے والی ہے لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں کسی ایک کے مزار پر چلا جاؤنگا۔"

میں نے اُن سے پوچھا۔ "رنڈی کے کوٹھے اور تکئے آپکو کیوں پسند ہیں؟"

کچھ دیر سوچکر اُس نے جواب دیا۔ "اسلئے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لیکر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اسکے لئے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔"

میں نے ایک اور سوال کیا۔ "آپکو طوائفوں کا گانا سُننے کا شوق ہے۔ کیا آپ

موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں؟" اُس نے جواب دیا "بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے۔ کیونکہ میں کن سری سے کن سری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں۔ منٹو صاحب گانے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب میں سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزہ آتا ہے۔ نوٹ نکالا اسکو دکھایا۔ وہ اسے لینے کیلئے ایک ادا کیساتھ اٹھی پاس آئی تو نوٹ اپنی جیب میں اُڑس لیا اُس نے جھک کر باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے ایسی بہت سی فضول باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو بہت پسند ہیں۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں۔"

بابو گوپی ناتھ کا میں شجرۂ نسب تو نہیں جانتا لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنئے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اسے دس لاکھ روپے کی جائداد ملی۔ جو اُس نے اپنی خواہش کے مطابق اُڑانا شروع کر دی بمبئی آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سَو سوا سَو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔

زینو کیلئے اُس نے فیٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا لیکن شاید تین ہزار میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی نفنگے ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی لیکن اُسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی یہی وجہ تھی کہ وہ دوسروں کی نسبت میرا زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایکروز شام کے قریب جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے شفیق کو دیکھکر سخت حیرانی ہوئی محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ جائیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے۔ کچھ اپنی جدت طراز گائکی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت لیکن اسکی زندگی کا ایک حصہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ تین باہم سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانیسے پہلے اسکا تعلق اُنکی ماں سے تھا۔ یہ بھی بہت کم مشہور ہے کہ اسکو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصہ میں مرگئی تھی! سلئے پسند نہیں تھی کہ اسمیں طوائفوں کے سے غمزے اور عشوے نہیں تھے لیکن یہ تو خیر ہر شخص جو محمد شفیق طوسی سے واقفیت رکھتا ہے، جانتا ہے چالیس برس کی عمر میں یہ اس زمانے کی عمر ہے، بینکڑوں طوائفوں نے اُسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا اُس نے پہنا عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اُس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کیلئے خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں، محمد شفیق کے گانے میں اُس کی بذلہ سنج طبیعت میں جسمیں میراثیوں کے مزاج کی جھلک تھی۔ بہت ہی کشش تھی وہ کوشش کے بغیر اُنکو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا میں نے جب اُسے ہنس ہنس کر زینت سے باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اسلئے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتہً یہاں پہنچا کیسے صرف سینڈو اُسے جانتا تھا۔ مگر اُنکی بول چال تو ایک عرصہ سے بند تھی لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اُسے لایا تھا۔ دونوں میں صلح صفائی ہوگئی تھی۔

بابو گوپی ناتھ ایک کرسی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا میں نے شاید اس سے پہلے ذکر

نہیں کیا وہ سگرٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سُنا رہا تھا۔ جسمیں زینت کسی قدر کم اور سردار زیادہ دلچسپی لے رہی تھی شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا۔ "بسم اللہ۔ . . بسم اللہ۔ . . آپکا گذر بھی اس وادی میں ہوتا ہے؟"

سینڈو نے کہا۔ "تشریف لائیے یہاں عزرائیل صاحب۔ دھڑن تختہ!" میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی۔ لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار اس نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے خلیفے اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی جسپر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو سادہ لوح۔ صاف ستھری۔

شفیق کیساتھ مجھے اسکی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اول تو اسمیں بھونڈا پن تھا۔ اسکے علاوہ کچھ یوں کہیئے کہ اس بات کا اسمیں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی شفیق اور سینڈو اُٹھکر باہر گئے تو میں نے بڑی بے رحمی کیساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا۔ کیونکہ فوراً اُسکی آنکھوں پہ موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ اور روتی روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اُٹھکر تیزی سے اُسکے پیچھے چلا گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ

کچھ کہا لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا "آیئے منٹو صاحب" کہکر مجھے اپنے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گیا۔

زینت پلنگ پر بیٹھی تھی میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی میں اور بابو گوپی ناتھ دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنجیدگی کیساتھ کہنا شروع کیا۔ "منٹو صاحب مجھے اس عورت کے ساتھ بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے میں حضرت غوثِ اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں، میرا مطلب ہے اس پیشہ کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹ کر کھاتی رہیں لیکن اس نے ایک زائد پیسہ کبھی مجھ سے نہ لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا۔ تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گروی رکھ کر گذارہ کیا۔ میں جیسا کہ آپ سے ایکدفعہ کہہ چکا ہوں۔ بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونیوالا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسکی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اسکو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کو دیکھو جو کچھ وہ کرتی ہیں سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں کل مجھے بھکاری ہونا ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولتمند کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسو گی تو کام نہیں چلیگا لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سُنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہی میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اُس نے کہا۔ بمبے لیجاؤ اسے۔ مجھے معلوم تھا اُس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبے میں اُسکی دو جاننے والی طوائفیں ایکٹرس بنی ہوئی ہیں لیکن میں نے سوچا بمبے ٹھیک ہے ـــــ دو مہینے ہو گئے ہیں۔ اسے یہاں لائے ہوئے سردار کو

لاہور سے بلایا ہے کہ اسے سب گُن سکھائے۔ غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ میاں مجھے کوئی نہیں جانتا اسکو یہ خیال تھا کہ بابو کی بے عزتی ہوگی میں نے کہا تم چھوڑو اسکو بمبے بہت بڑا شہر ہے لاکھوں رئیس ہیں میں نے تمھیں موٹر بھی لے دی ہے۔ کوئی اچھا سا آدمی تلاش کرلو۔ . . منٹو صاحب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میری دلی خواہش یہ ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ اچھی طرح ہوشیار ہو جائے میں اسکے نام آج ہی دس ہزار روپیہ جمع کرنے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ دس دنوں کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہوئی سردار سکی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لیگی ـــــ آپ بھی اسے سمجھائیے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے۔ سردار اسے ہر روز اپولو بندر لیجاتی ہے لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اسکے متعلق؟"

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن بابو گوپی ناتھ نے خود ہی کہا: "اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے خوبصورت بھی ہے ـــ کیوں زینو جانی ـــ پسند ہے تمھیں؟"

زینو خاموش رہی۔

بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبے لانے کی غرض و غایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دُور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بمبے میں کسی اچھے مالدار آدمی کی داشتہ بنجائے۔ یا ایسے طریقے سیکھ جائے جن سے وہ مختلف

آدمیوں سے وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو جائے۔

زینت سے اگر چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا لیکن چونکہ اُسکی نیت تھی اسلئے اُسنے زینت کے مستقبل کیلئے ہر ممکن کوشش کی اسکو ایکٹرس بنانے کیلئے جعلی ڈائرکٹروں کی دعوتیں کیں۔ گھر میں ٹیلیفون لگوا دیا مگر اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی قریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا کئی راتیں بھی اُس نے زینت کیساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایکروز افسوس اور رنج کیساتھ کہا "یہ شفیق صاحب تو خالی خولی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسہ دیکھئے لیکن بیچاری زینت سے چار چادریں چھ تکئے کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سُنا ہے آجکل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں"۔

یہ درست تھا۔ الماس نذیر جان پٹیالے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اُس نے زینت سے لئے تھے مجھے معلوم ہے۔ الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کیساتھ لڑ کر اُس نے زہر کھا لیا تھا۔

محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلیفون کیا کہ اُسے ڈھونڈ کر لائیے میں نے اُسے تلاش کیا لیکن کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایکروز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی بہت پریشانی کے عالم میں تھا جب میں نے اُس سے کہا زینت بلاتی ہے تو اُس نے جواب دیا۔ مجھے یہ پیغام اور ذریعے سے بھی مل چکا ہے آجکل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت

بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس کہ وہ بیحد شریف ہے۔ ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

شفیق سے جب مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کیساتھ پھر اپولو بندر جانا شروع کر دیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکلوں سے کئی گیلن پٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا حالات اُمید افزا ہیں۔ کیونکہ انمیں سے ایک آدمی نے جو ریشمی کپڑوں کی مل کا مالک تھا۔ زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کرونگا۔ ایک مہینہ گزر گیا لیکن وہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایکروز جانے کس کام سے میں ہارنبی روڈ سے جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی کار کھڑی دکھائی دی پچھلی نشست پر محمد یٰسین بیٹھا تھا۔ نگینہ ہوٹل کا مالک میں نے اُس سے پوچھا۔ "یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟"

یٰسین مسکرایا۔ "تم جانتے ہو موٹر والی کو؟"

میں نے کہا "جانتا ہوں"

"تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی — اچھی لڑکی ہے" یٰسین نے مجھے آنکھ ماری میں مُسکرا دیا۔

اسکے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ زینت سے یٰسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام کو اپولو بندر سے ایک آدمی لیکر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑ کر نگینہ ہوٹل سے چلا گیا لیکن ہوٹل کے مالک کیساتھ زینت کی دوستی ہوگئی۔ بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا۔

کیونکہ اس پندرہ دن کی دوستی میں لیسین نے زینت کو بہت سی قیمتی ساڑھیاں لے دی تھیں بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کہ کچھ دن اور گذر جائیں زینت اور لیسین کی دوستی پکی ہو جائے تو وہ لاہور واپس چلا جائے مگر ایسا نہ ہوا۔

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ اسکی جوان لڑکی مورییل سے لیسین کی آنکھ لڑ گئی چنانچہ زینت بیچاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور لیسین اسکی موٹر میں صبح شام موریل کو گھماتا رہتا۔ بابو گوپی ناتھ کو اسکا علم ہونے پر بہت دکھ ہوا اُس نے مجھ سے کہا منٹو صاحب یہ لوگ کیسے ہیں بھئی دل اُچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو لیکن زینت بھی عجیب ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی ـــ میاں تمھیں اگر اس کرسچین لڑکی سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کا بندوبست کرو میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو؟ میاں کیا کروں منٹو صاحب بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے ـــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیئے اُسے"

لیسین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا:

بہت دنوں تک کوئی نئی بات ظہور پذیر نہ ہوئی ایکدن ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ غلام علی اور غفار سائیں کیساتھ لاہور چلا گیا ہے روپے کا بندوبست کرنے کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو چکے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اُسے چند مکان بیچنے ہیں۔

سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی سینڈو کو پالسن مکھن کی دونوں نے متحدہ کوشش کی اور ہر روز دو تین آدمی پھانس کر لے آتے۔ زینت سے کہا گیا

کہ بابو گوپی ناتھ واپس نہیں آئیگا۔ اسلئے اُسے اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ سو سوا سو روپے روز کے ہو جاتے جنہیں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔ میں نے ایکدن زینت سے کہا "یہ تم کیا کر رہی ہو۔؟"

اُس نے بڑے اطمینان سے کہا "مجھے کچھ نہیں معلوم بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں۔"

جی چاہا کہ دیر تک پاس بیٹھ کر اسے سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو ٹھیک نہیں۔ سینڈو اور سردار اپنا اُلّو سیدھا کرنے کیلئے تمہیں بیچ بھی ڈالینگے مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اُکتا دینے والی حد تک بے سمجھ، بے اُمنگ اور بے جان عورت تھی اس کم بخت کو اپنی زندگی کی قدر و قیمت ہی معلوم نہیں تھی جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والیوں کا سا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اُسے دیکھ کر۔ سگریٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلیفون سے حتیٰ کہ اس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ ماہم گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اُسے پورا پتہ بتا دیا اُس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا، جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے بتا دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کروا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ اب کے دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اُس نے بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور میں چھوڑ آیا تھا۔ ٹیکسی

نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا کہ میں بھی اسکے ساتھ چلوں۔
قریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا "سینڈو"۔
سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے مُنہ سے صرف اتنا نکلا: "دھڑن تختہ"۔
بابو گوپی ناتھ نے اُس سے کہا آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو۔
لیکن سینڈو نے کہا: "آپ ٹیکسی کو ایک طرف کھڑا کیجئے۔ مجھے آپ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔"
ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا۔ سینڈو اُسے کچھ دُور لے گیا۔ دیر تک اُن میں باتیں ہوتی رہیں۔ بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اُس نے کہا "واپس چلو"
بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ جب ہم دادر کے پاس پہنچے تو اُس نے کہا۔
"منٹو صاحب زینو کی شادی ہونے والی ہے"
میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کس سے؟"
بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا۔ "حیدر آباد سندھ کا ایک دولت مند زمیندار ہے۔ خدا کرے وہ خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہے۔ جو میں وقت پر آن پہنچا جو روپے میرے پاس ہیں ان سے زینو کا جہیز بن جائے گا ــــ کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟"
میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہ تھا میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیدر آباد

سندھ کا متمول زمیندار ہے جو حیدر آباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز یہ اپنے پرانے مُربّی غلام حسین (یہ اس زمیندار کا نام تھا) کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارات کی ——

غلام حسین کی پُرزور فرمائش پر اُس نے غالب کی غزل ؎

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُسکو سُنائے نہ بنے

گا کر سُنائی۔ غلام حسین سوجان سے اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ کو پکّا کر دیا۔ شادی طے ہوگئی ——

بابو گوپی ناتھ بہت خوش تھا۔ ایکدفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ وہاں غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خوشی دوبالا ہوگئی۔ مجھ سے اس نے کہا۔ "منٹو صاحب خوبصورت جوان اور بڑا لائق آدمی ہے میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخش کے حضور میں دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی۔ بھگوان کرے دونوں خوش رہیں"

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کا زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیئے۔ پانچ ہزار نقد دیئے۔

شادی باندرہ کے بنگلہ میں ہوئی۔ مندرجہ ذیل آدمی شریک ہوئے۔

محمد شفیق طوسی۔ محمد یٰسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل۔ سینڈو۔ میوزک ٹیچر میں اور بابو گوپی ناتھ۔ دُلھن کی طرف سے سینڈو وکیل تھا۔

ایجاب وقبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا۔
غلام حسین سرج کا نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اسکو مبارکباد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ میں نے اُسے پہلی دفعہ دیکھا۔ کافی وجیہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اُس کے مقابلے میں چھوٹی سی ٹیبر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں میں خورد و نوش کا جو سامان ہوتا ہے وہ بھی بابو گوپی ناتھ نے کیا۔ دعوت سے جب سب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے ہاتھ دُھلوائے۔ جب میں ہاتھ دُھلانے کے لئے آیا تو اُس نے مجھے بچوں کے انداز میں کہا: "منٹو صاحب آپ ذرا اندر آئیے اور دیکھئے زینو دلھن کے لباس میں کیسی لگتی ہے"۔

میں پردہ ہٹا کر کمرہ کے اندر داخل ہوا۔ زینت سُرخ زربفت کی شلوار اور کُرتا پہنی ہوئی تھی۔ دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اَپ تھا۔ حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک بہت بُری لگتی ہے مگر زینو کے ہونٹ سجے ہوئے تھے۔ اُس نے شرما کر مجھے آداب کیا تو بہت پیاری لگی۔ جب میں نے دوسرے کونے میں مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو بے اختیار مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہا: "یہ کیا مسخرہ پن ہے؟"۔

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا۔ "آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان"۔ اُس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

مجھے غلطی کا احساس بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر آیا۔ بڑے

پیار کے ساتھ اُس نے زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دُکھ کے ساتھ کہا "منٹو صاحب میں سمجھا تھا آپ بڑے سمجھ دار اور لائق آدمی ہیں۔ زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ تو لیا ہوتا"

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اُسے مجھ سے تھی زخمی نظر آئی۔ لیکن بیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں۔ اُس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا "خدا تمھیں خوش رکھے زینو۔ خدا تمھیں خوش رکھے"

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ انمیں ملامت تھی۔ بہت ہی دُکھ بھری ملامت ـــــ اور چلا گیا۔

بھوک

سہیل عظیم آبادی

صفحات :- ۱۴

بھوک نے جب کروٹ لی تو آنتوں کیساتھ ہی رآمو کے دل و دماغ میں بھی ہلچل مچگئی وہ سوچنے لگا اب کیا کرنا چاہیئے۔ بھوکے رہنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ فاقہ کو چار شام تو ہو چکے صبح ہوگی تو پانچواں ہوگا تین دن سے کام ڈھونڈ رہا ہوں لیکن کام نہیں ملتا۔ اب صبح ہوتے ہی کام کہاں سے ملجائیگا اور اگر کام ملا بھی تو کسکے بدن میں اتنا بوتا ہے جو کر سکے، کام ہوگا کیسے؟ وہ بھوک سے تلملا رہا تھا۔ اُسکے دماغ میں صرف ایک بات تھی "کھانا کہاں سے ملیگا؟" اُسکے دل میں صرف ایک خواہش تھی کچھ بھی ہو مگر پیٹ بھر کھانا ملے۔ اُس نے سوچا اگر صبح بھی کوئی کام نہ ملا تو وہ کہیں سے کوئی چیز اُٹھا کر بھی کھالیگا۔ یا بھیک ہی مانگ کر مل جائے یا میونسپلٹی کے ٹین ہی کے اندر ملے ـــــ مگر یکایک اُسکے دل میں اُمید کی روشنی پھیل گئی۔ اُسے یقین ہوگیا کہ کل اُسے کوئی کام ضرور ہی ملجائیگا

اُس خیال کے آتے ہی معلوم ہوا کہ جیسے اُسکے بدن میں کھوئی ہوئی طاقت واپس آرہی ہے۔ وہ دوسرے دن کے بارے میں سوچنے لگا، سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ ہاٹ جائیگا۔ وہاں بہت سی عورتیں ترکاریاں خریدنے آتی ہیں اُنمیں سے کوئی نہ کوئی اپنا بوجھ پہنچانے کیلئے ضرور ہی کہیگا۔ پھر وہاں سے مارکٹ جائیگا وہاں بہت سے بابو لوگ اور میم صاحب پھل یا ترکاریاں خریدنے آتے ہیں۔ اُن سے کچھ مزدوری ملجائیگی۔ یا اور کوئی دوسرا کام۔ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اُسکو کوئی کام ضرور ہی ملجائیگا اور اتنی مزدوری بھی ملجائیگی جس سے پیٹ بھر کھانا کھا سکے گا۔ اِس خیال ہی سے وہ خوش ہوگیا، معلوم ہوا کہ جیسے اُسکا پیٹ بھر گیا اُس نے دل ہی دل میں کہا: "ایشور بڑا انصاف ور ہے۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا پھر میں بھوکا کیوں رہوں گا؟"

تھوڑی ہی دیر میں اُسکی بھوک پھر جاگ اُٹھی۔ اور وہ تلملا گیا۔ دوسرے دن کے بارے میں اُسکی جتنی اُمیدیں بندھی تھیں وہ آہستہ آہستہ مٹنے لگیں جیسے نیند ٹوٹنے کے بعد خواب فراموش ہونے لگتا ہے۔ وہ سوچنے لگا روز ہی اسی طرح اُمید بندھتی ہے مگر پوری کبھی نہیں ہوتی۔ دن بھر پائپ سے پانی پی پی کر پیٹ کی آگ بجھانی پڑتی ہے لیکن آخر کیا کیا جائے۔ اس روز روز کے اُپاس سے چھٹکارا کیسے ملے؟ جینے پر اتنا کا کتنا اتنا بڑا قصور کیا ہے جو یہ سزا ہے۔ دنیا میں سب ہی آدمی کچھ نہ کچھ گناہ کرتے ہیں لیکن سب تو بھوکے نہیں مجھی پر یہ عذاب کیوں؟ گناہ تو سبھی آدمی کرتے ہیں۔ مگر کسی کو تکلیف کسی کو آرام وہ کیوں دیتا ہے؟ مگر اُسکا دماغ اُلجھ کر رہ گیا اُس نے دل ہی دل میں کہا: ایشور بڑا انصاف ور ہے،

وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ باقی دنیا میں آدمی تو ہر طرح کے ہوتے ہی ہیں یہی تو دنیا کی سوبھا ہے ـــ مگر اُسکی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ نراس ہونے کی کوئی وجہ نہیں صبح ہوگی تو دیکھا جائیگا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور پانی کے نل کی طرف بڑھا کہ چلکر پانی پیئے۔ مگر جب نل کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ پانی آنا بند ہوگیا ہے۔ اُسکا جی سن سے ہوگیا، سر چکرا گیا، وہ نل کو پکڑے کھڑا رہا۔

آخر رامو تھوڑی دیر کے بعد سر جھکائے اور کچھ سوچتا ہوا نل کو چھوڑ کر ہٹا۔ اُسکا ہر قدم ڈھیلا پڑ رہا تھا۔ مگر دماغ میں ہلچل تھی شاید اُسکے دل میں ایسی ہلچل کبھی نہ مچی ہوگی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُسکی مصیبت سے کسطرح بچے؟ فٹ پاتھ پر سونے سے کسطرح چھٹکارا پائے۔ اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کے طور پر کہا۔ اب اس زندگی سے نکلنا ضرور ہے اور..... کل ہی صبح اُٹھکر زندگی بالکل بدلی ہوئی ہوگی۔ وہ یہی باتیں سوچتا اور اپنے آپکو سمجھاتا آگے بڑھتا گیا۔ اُسکا ارادہ پکا ہو چکا۔ اُس نے یہانتک سوچ لیا کہ اگر کل بھی اُسے بھوکا رہنا پڑے تو پھر وہ "جے ماں" کہکر گنگا میں کود پڑیگا۔ اس فیصلہ کے بعد وہ سوچنے لگا کہ ترکیب کیا کی جائے؟ نوکری ـــ نوکری کہاں ملتی ہے۔ مزدوری ـــ مزدوری تو ہر روز ہی ڈھونڈنا پھرتا ہے ـــ پھر؟؟۔

اُس نے بہت سی باتیں سوچ لیں۔ بہت سی ترکیبیں اُسکے دماغ میں ایک ہی وقت آگئیں جیسے زمین پر دانہ دیکھکر کبوتر اُتر پڑے ہیں۔ مگر پھر ایک ہی بار سب کی سب غائب بھی ہوگئیں۔ صرف ایک ترکیب اُسکے دماغ میں جم کر رہگئی اور یہی آخری ترکیب تھی۔ خوشی سے نہیں بالکل مجبور ہوکر دیر تک وہ ایک عجیب

عالم میں رہا۔ دل کہتا یہ بڑی بُری بات ہے! اس دنیا میں سزا بدنامی اور مرنے پر بھی سزا۔ دماغ کا جواب ہوتا۔ ہزار بُرا سہی مگر اب اسکے سوا کوئی چارہ بھی نہیں آخر دل کی ہار ہوئی۔ دماغ جیت گیا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ چوری کریگا۔

پھر دل و دماغ میں کھینچ تان شروع ہوئی۔ مگر اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر چوری کر کے بچ نکلا تو کچھ دنوں کھانے اور رہنے کا بھی سامان ہو جائیگا۔ اور اگر پکڑا گیا تو بھی گھاٹے میں نہیں رہیگا۔ پولس کے لپٹر تھپٹر کے بعد کھانے کو مل ہی جائیگا۔ رہنے کو حوالات۔ پھر جیل کی کوٹھری کمبل اور کپڑے، واہ سب کچھ ملجائیگا۔ وہ مسکرا دیا، مگر دل نے پھر ایکبار کروٹ لی اور اُس نے آپ ہی آپ سوال کرنا اور جواب دینا شروع کیا۔ ٹھیک ہے کھانا تو مل ہی جائیگا مگر پکڑا گیا تو بڑی بے عزتی ہوگی! اور جیل گیا تو پھر واپس آکر لوگوں کو کیا مُنہ دکھائیگا؟ مگر آج چوری نہ کرنے پر کونسی بڑی عزت ہے۔ جسمیں بٹہ لگجائے جیل میں یہ شہر، یہ بازار کہاں؟ مگر باہر رہ کر تو اسکا بھی موقع نہیں — کچھ بھی ہو کسی طرح سہی لیکن وہاں پیٹ بھر کھانا تو ملیگا! اُسکا ارادہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔

وہ چوری کرنے کا پکّا ارادہ کر چکا تھا۔ اور بدن میں طاقت بھی محسوس کرنے لگا وہ بُھوک کو بالکل بُھول گیا اُسے ذرا بھی احساس نہ رہا کہ وہ کس حال میں تھا۔ اُسکی نگاہوں میں روپیوں کا ڈھیر تھا کانوں میں روپیوں کی کھنک گونج رہی تھی۔ وہ تیزی کیساتھ قدم بڑھانے لگا اور بغیر کسی ارادے کے ایکطرف تیزی سے چلنے لگا اُسکے دماغ سے تھوڑی دیر کیلئے چوری کرنے کا خیال بھی نکل گیا اور شیخ چلّی کی طرح خیالی قلعہ بنانے لگا۔ چوری کرنیکے بعد وہ مالدار آدمی ہو جائیگا۔ بوڑھی ماں کو

آرام پہنچائیگا۔ اسی چوری کے روپے سے وہ کاروبار شروع کریگا۔ اور لوگ اسے اچھی نظر سے دیکھنے لگینگے۔ پھر بیاہ کریگا۔ اچھی سی عورت ملجائیگی۔ ابتک صرف غریبی کیوجہ سے اُسکا بیاہ نہیں ہوسکا۔ جب روپیہ ہوگا تو پچیسیوں آدمی بیٹی دینے کو تیار ہوجائینگے۔ بیاہ کے خیال سے رامو کو بڑی خوشی ہوئی۔ وہ طرح طرح کی باتیں سوچنے لگا۔ اُسکی آنکھوں میں ایک خوبصورت عورت کی تصویر پھر گئی۔ جسے شام کے وقت اُس نے موٹریں جاتے دیکھا تھا۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کو اُس عورت سے کم خوبصورت نہ چاہتا تھا۔ سوچنے لگا وہ کام کرکے واپس جائیگا۔ تھکا ماندہ، عورت ضد کرکے اچھی اچھی چیزیں کھلائیگی۔ کھانے کا تصور آتے ہی سارا خیالی قلعہ چکنا چُور ہوگیا۔ آنتیں اینٹھنے لگیں اور وہ بیچین ہوگیا۔ وہ چوری کے فیصلے کو بھول چکا تھا۔ پھر وہ ارادے کو مضبوط کرنے لگا۔ اب اُسکے حوصلے میں نئی طاقت تھی۔ اُس نے چاروں طرف نظر گھما کر دیکھا۔ ہر طرف اونچے اونچے مکانات تھے اور بجلی کی تیز روشنی ۔۔۔ کسی مکان میں گھسنے کا موقعہ بنتا تھا وہ سوچنے لگا کہ آخر چوری کہاں کی جائے؟ ۔۔۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اُسے خیال آیا شہر کے آخری حصے میں چھوٹے چھوٹے بنگلے ہیں۔ چار دیواری بھی نیچی ہے۔ سڑک پر دونوں طرف گھنے پیڑ بھی ہیں وہاں آسانی کیساتھ چوری کی جاسکتی ہے۔ وہاں کافی اندھیرا رہتا ہے۔

خوب اچھی طرح سوچنے کے بعد وہ اُسی طرف چلا، دُور سے گھنٹہ گھر کے ٹن ٹن دو بجنے کی آواز آئی۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا، وقت بھی اچھا ہے ۔۔۔ اب وہ تیزی کیساتھ قدم بڑھا رہا تھا ۔۔۔ مگر یکایک اُسے خیال آیا۔ ان بنگلوں میں کُتے پلے ہوئے ہیں ۔۔۔ یہ خیال آتے ہی وہ سہم گیا۔ ہمت ٹوٹ گئی اُسکو یقین ہوگیا کہ

بنگلے کے اندر قدم رکھتے ہی کتے اسے نوچ ڈالینگے ۔ اُسکا ارادہ ڈانواں ڈول ہوگیا بھوک نے پھر کروٹ لی اور وہ سوچنے لگا سب سے پہلے اُسے کھانے کو ملنا چاہیئے ۔ اگر بنگلے میں گیا بھی تو اسوقت کچھ کھانے کو مل نہیں سکتا ۔ بابو لوگوں کے یہاں اتنا کہاں پکتا ہے کہ باسی رہے بنگلوں میں اُسوقت کھانے کی کوئی چیز نہیں مل سکتی سب کچھ ختم ہوچکا ہوگا ۔ وہ سوچنے لگا کہ اسوقت کھانے کی چیز کہاں مل سکتی ہے آخر اسکے دماغ میں یہ بات آگئی کہ اسوقت کھانے کی کوئی چیز صرف حلوائی کی دوکان میں مل سکتی ہے ۔ یہ خیال آتے ہی معلوم ہوا کہ جیسے اسے سب کچھ مل گیا ۔ پھر وہ سوچنے لگا ۔ کہ چوری کرنے کیلئے حلوائی کی کونسی دوکان مناسب ہے ۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اُسے ایک حلوائی کی دوکان یاد آئی ۔ یہ دوکان شہر کے آخری حصے میں تھی ۔ وہاں کی آبادی بھی کم تھی ۔ راموکی چوری کرنے کی یہ جگہ ہر طرح مناسب معلوم ہوئی ۔ وہ اُسی طرف چلا ۔ اب وہ سوچ رہا تھا ۔ کسطرح دبے پاؤں دوکان میں گھسے گا ؟ کسطرح الماری کھولیگا ؟ کسطرح کھانے کی چیزوں پر ہاتھ ماریگا اور کسطرح روپیہ نکالیگا ؟ مگر وہ کبھی کبھی ڈر کر چونک سا جاتا تھا ۔ اُسکو خیال ہوتا تھا کہ شاید چوری نہ کرسکے یا پکڑ لیا جائے ۔ مگر چوری کرنے کا وہ پکّا ارادہ کرچکا تھا کبھی کبھی وہ سوچتا کاش اُسے کوئی منتر معلوم ہوتا ۔ یا مسان کی راکھ مل جاتی ، کہ تھوڑی دیر کیلئے جسے چاہتا بیہوش کردیتا ۔ پھر وہ اطمینان کیساتھ جاتے ہی منتر پڑھتا یا مسان کی راکھ کو سوئے ہوئے آدمیوں پر چھڑک کر اطمینان سے چوری کرلیتا ۔ اُسے ایک پل کیلئے ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے سب کچھ آتا ہے اور اُس نے حلوائی کو بیہوش بھی کرلیا ہے ۔ مگر اُسکا یہ خیال فوراً ہی مٹ گیا ۔ پھر اُس نے سوچا کہ کبھی کسی چور سے

مل کر وہ ضرور پوچھیگا۔ مگر تھوڑی دور جاکر اُسکا خیال یکایک اُچٹ گیا۔ دو کُتے اُسے دیکھ کر بھونکنے لگے۔ اُس نے سوچا کُتے چور کو دیکھ کر بھونکتے ہیں۔ یہ سچ ہے ـــــ چار قدم پر آگے چلکر بجلی کا کھمبا تھا۔ سڑک کی روشنی جل رہی تھی، چار پانچ آدمی فٹ پاتھ پر ٹاٹ بچھائے تاش کھیل رہے تھے۔ رامو ان لوگوں کے پاس سے ہوکر گذرا لیکن کسی نے دھیان نہیں دیا۔ ایک آدمی جلدی جلدی اپنے پتّوں کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرا آدمی ٹاٹ پر پڑے ہوئے پتّوں کو تیسرا سر اور اُنگلی ہلا ہلا کر کچھ سوچ رہا تھا۔ چوتھا اس شان سے جیسے سب کو اُس نے ایک چال میں مات دیدی ہے۔ ایک اور آدمی کسی دوسرے پتّوں کو دیکھ رہا تھا۔

ایک نے بیڑی جلائی، اور لمبا دم لگایا۔ دوسرے نے پان کی لمبی پیک پاس ہی پھینک کر کہا۔

"یہ بازی ہماری ہے چھٹو بھیّا"

چھوٹے نے جواب دیا۔ "دیکھا جائیگا"

رامو اور آگے بڑھا۔ تھوڑی دور پر ایک آدمی فٹ پاتھ پر بیٹھا گا رہا تھا۔

ـــــ "مرے دل کی لگی تو بجھی ہی نہیں رے ہاں ہاں رے، ارے ہاں ہاں رے"

ـــــ رامو جب پاس پہنچا تو اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ رامو ڈر گیا۔ مگر وہ پھر گانے لگا

ـــــ تری آنکھ میں مدھر ابھری ہے مگر۔ مرے دل کی لگی تو بجھی ہی نہیں ارے ہاں ہاں ـــــ"

پُروائی تیزی سے چل رہی تھی۔ جیٹھ کا مہینہ تھا۔ رامو کا دل بھی گانے کو چاہا۔ اُس نے گانا چاہا ـــــ "جانی جوبنا پہ نہ ـــــ مگر وہ نہیں گا سکا

کچھ گنگنا کر رہ گیا، حلق سوکھا تھا۔ آواز نکل ہی نہ سکی۔ اُسے معلوم ہوا جیسے کلیجے میں طاقت ہی نہیں۔ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری، اور گلا صاف کر کے کھنکھارتا ہوا آگے بڑھا۔ یکایک اُسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ ساتھ ہی دوسرا آدمی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ غریب فٹ پاتھ پر سویا ہوا تھا۔ رامو کو اسی سے ٹھوکر لگی تھی۔ رامو نے بڑی عاجزی کیساتھ اُس سے معافی مانگ لی۔ دونوں نے ایکدوسرے سے پوچھا "تم کون ہو؟" اور میل جول ہو گیا۔ اُس نے رامو کو اپنے ٹاٹ پر بٹھا لیا۔ اور بیڑی پینے کو دی۔ رامو کا دل بھی چاہ گیا۔ اُس نے بیڑی پی مگر سر چکرا گیا۔ اُس نے بیڑی پھینکدی اور سر تھام کر بیٹھ گیا۔ دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ اُٹھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی جب اُسکی طبیعت سنبھلی تو وہ پھر آگے بڑھا۔ حلوائی کی دوکان اب بھی اُسکی نگاہوں میں پھر رہی تھی۔ اُسکا دل چاہا کہ امرتی اور بیسن کا لڈو کھائے اس خیال کے آتے ہی اُسکے مُنھ میں پانی بھر آیا۔ اب وہ ایک تین منزلہ مکان کے پاس سے ہو کر گذر رہا تھا۔ یکایک کسی نے اُسپر مکان سے تیز روشنی ڈالی۔ اُس نے نظر اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ مکان کی دوسری منزل پر ایک کھڑکی سے دو آدمی نیچے دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں بجلی کی روشنی تھی۔ اُن دونوں پر بھی روشنی پڑ رہی تھی لیکن چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر رامو نے اتنا سمجھ لیا کہ ان میں ایک مرد تھا اور ایک عورت تھی۔

عورت بولی۔ "کوئی غریب آدمی ہے، چور نہیں ہے۔"

مرد بولا۔ "تمھارا خیال ٹھیک ہے۔"

رامو آگے بڑھتا گیا۔ عورت نہ جانے کسی بات پر ہنسی۔ رامو سمجھا کہ وہ اُسپر ہنس رہی ہے۔ اُسکے دل پر چوٹ لگی۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا: "اگر میرے

پاس بھی دو منزلہ مکان ہوتا۔ روپیہ اور عورت ہوتی تو زندگی مزے سے کٹتی۔ کوئی مجھ پر ہنستا بھی نہیں۔" اُسکا دل مچل کر رہ گیا۔ وہ اور آگے بڑھا۔ کچھ دور آگے جا کر ایک اندھیری گلی سے دو چار آدمیوں کی کانا پھوسی کی آواز آئی۔ وہ رُک گیا لیکن اُسکے رُکتے ہی آواز بند ہو گئی۔ رامو بغیر سوچے سمجھے آگے بڑھ گیا اور اس راستہ پر ہو لیا جو حلوائی کی دوکان کی طرف جاتا تھا۔

تھوڑی دور جا کر وہ ایک نکڑ سے جیسے ہی مُڑا ایک موٹر کھڑی نظر آئی ایک بابو صاحب موٹر کو دھکا دے رہے تھے اور ایک عورت کھڑی تھی۔ رامو بھوک سے نڈھال تھا۔ اُسکا ایک ایک قدم رُک رُک کر اُٹھ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا بابو صاحب بولے:

"اے سنو۔ تم پیچھے سے موٹر کو دھکا دو۔ ہم تم کو انعام دے گا۔"

رامو نے اُس عورت کو دیکھا۔ دیکھتے ہی اُسے خیال آیا کہ اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر اُسے کہاں دیکھا ہے؟

بابو صاحب بولے "اے سنتا نہیں تم موٹر کو دھکا دو۔ ہم انعام دیگا۔"

رامو نے انعام کا لفظ سُنا تو اُسکے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور اُسکے مُنھ سے نکل گیا۔

"کتنا؟"

"حرامزادہ سور ــــ دو روپیہ لے گا۔"

رامو کا خون کھول گیا۔ جی چاہا کہ جو بھی ہو۔ مگر انکی ساری بابوائی نکالدے مگر غم کھا کر رہ گیا۔ انعام کے لالچ میں موٹر کو دھکا دینے کو آگے بڑھا زور لگایا۔ مگر

موٹر بڑا تھا۔ بدن میں طاقت کم۔ موٹر بال برابر بھی نہ سرکا اور رامو ہانپنے لگا تھک کر الگ کھڑا ہو گیا۔ بابو صاحب بولے "بس سالے اسی پر کتنا انعام دیں گے؟"

دونوں نے مل کر دھکا دینا شروع کیا اور کیچھ دور لے گئے۔ رامو کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ان دونوں کے جانیکے بعد رامو کو یاد آیا گاؤں کے زمیندار نے بیٹے کے بیاہ میں اس عورت کو بلایا تھا۔ وہ گانے کیلئے گئی تھی۔ . . رامو کو اُسوقت کی شیخی پر غصہ آیا اور بولا: "پتریا سالی؟" تھوڑی دیر میں موٹر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رامو پھر آگے بڑھتا چلا گیا۔ آخر اس حلوائی کی دوکان پر پہنچا جسکو اُس نے تاکا تھا ـــــ دوکان بند تھی۔ حلوائی دوکان کے سامنے ایک لمبے بنچ پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اُسکا ہاتھ زمین سے چھو رہا تھا۔ پروائی تیزی سے چل رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ حلوائی کے حلق سے خراٹے کی ہلکی ہلکی آواز نکل رہی تھی ـــــ رامو کی ہمت ٹوٹ گئی، اُسکا ارادہ بدل گیا، اُس نے سوچا چوری کرنا بُرا کام ہے۔ چاہے کیسی ہی مجبوری کیوں نہ ہو۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ حلوائی کو اُٹھا کر اُس سے کچھ مانگ لیا جائے۔ یہ بھی معمولی آدمی ہے۔ کوئی بڑا آدمی نہیں ہے جو دھتکار دیگا ـــ اُٹھا کر مانگنے سے کچھ دیدیگا ـــ مگر کہیں چوری کی اور جاگ گیا تو پھر خیریت نہیں

یہ سوچکر رامو حلوائی کے پاس گیا، چاہتا تھا کہ اُٹھائے حلوائی کے مُنہ سے دیسی شراب کی بُو آئی۔ رامو سمجھ گیا کہ یہ نشے میں چُور ہے۔ اگر اس حال میں اُٹھائیگا تو وہ ضرور خفا ہوگا تعجب بھی نہیں کہ مار پیٹ بھی کرے ـــ پھر اسکو چوری کرنے کا خیال ہوا۔ اب حلوائی کیطرف سے اُسکو اطمینان تھا۔ اُسکو یقین تھا کہ اُسکو چوری کی خبر بھی نہ ہوگی نشے میں اٹا چت ہے۔

رامو ہمت کر کے دوکان کے اوپر چڑھ گیا۔ ایک دو بار وہ اُس دوکان پر بیٹھ کر کچھ کھا بھی چکا تھا۔ اُسے ہلکا سا اندازہ بھی تھا۔ کہ کونسی چیز کہاں دھری ہے۔ اسلئے ہر طرف اندھیرا ہونے پر بھی الماری تک پہنچ گیا۔ اُس نے جیسے ہی الماری کو ہاتھ لگایا کھٹ سے آواز پیدا ہوئی۔ اسکے ساتھ ہی اندر کا کواڑ کھلا اور دھیمی آواز آئی۔

"دروازہ ادھر ہے جگن!"

رامو کے سارے بدن کا خون سوکھ گیا۔ وہ بالکل چُپ کھڑا رہ گیا تھا۔ ویسی ہی دھیمی آواز پھر آئی۔

"جگن تمھاری عادت بہت خراب ہے اتنی دیر کر دیتے ہو۔ دو بجے بہت دیر ہوئی اور تم بھٹی سے اب آرہے ہو"

مگر رامو ہلا تک نہیں۔ ڈر سے سارے بدن میں کپکپی پھیل گئی۔ پھر وہی دھیمی آواز آئی۔

"ارے آتے کیوں نہیں۔ اب ہم تمکو پیسہ نہیں دینگے"

اتنا کہکر ایک عورت دروازے سے نکل آئی۔ اور اُسکا ہاتھ پکڑ کر کمرے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"اب تم بہت راہ دکھاتے ہو"

رامو کے دماغ میں ساری باتیں آگئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ عورت کسی کے انتظار میں تھی ـــــ اور اُسے دھوکہ ہوا ہے ـــــ وہ بُوڑھا حلوائی اور یہ کڑیل جوان عورت!! تو ندیل کیسا بے پروا پاؤں پھیلائے پڑا ہے۔ وہ کمرے میں چلا تو گیا مگر ڈر رہا تھا کہ کہیں پہچان نہ لے۔ عورت اسے کمرے میں لیجا کر ایک پلنگ پر بٹھاتی

ہوئی بولی:-

"اب تکو پیسہ نہیں دینگے جگن! تم پی کر پگلے ہو جاتے ہو"

اتنا کہکر اُس نے رامو کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔ اور پیار سے اُسے اپنی طرف کھینچا۔ رامو نے اُسکی محبت کا جواب ایک چُپ میں دیا۔

عورت نے رامو کے مونڈھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

پیسہ کم تھا اسلئے خفا ہو؟ جانتے بھی ہو ہمیں زیادہ پیسہ نہیں ملتا"

رامو بہت سی باتیں سمجھ گیا۔ بوڑھا کنجوس بھی ہے۔ گھر میں روشنی بھی نہ تھی۔ وہ خوش تھا بوڑھے کی کنجوسی اُسکے لئے فائدے کی بات ثابت ہوئی۔ رامو نے سوچا آج تو خوب جاترا بنا۔ کھانے کو تو ملیگا ہی۔

عورت بھی بھاؤ میں ملی ـــ عورت کا خیال آتے ہی اُسکے سارے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ دل گدگدانے لگا۔ مگر اُسکا دل ماری میں لگا ہوا تھا۔ بھوک نے بہت جلد ہی اُسکے خیالات کو دوسری طرف لگا دیا۔ وہ اندھیرے میں آنکھ پھاڑ پھاڑ کر کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کہیں کھانے کی کوئی چیز تو رکھی نہیں ہے مگر اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہ آیا ـــ عورت نے سمجھا کہ وہ نشے میں ہے۔ بولی:-

"اسی لئے زیادہ پیتے ہو۔ ہزار بار منع کیا تم مانتے ہی نہیں آؤ۔

اتنا کہکر عورت نے پھر رامو کو اپنی طرف کھینچا۔ رامو نے مزے میں آکر اپنا سر اُسکی گود میں ڈالدیا۔ اِسمیں اُسکو بڑا مزہ آیا۔ سارے بدن میں گدگدی سی ہونے لگی۔ سانس زور زور سے چلنے لگی۔ اور عورت کی سانس کی گرمی اُسے اپنے گالوں پر محسوس ہوئی۔ اس گرمی میں لطف بہت زیادہ تھا۔ اُسکا دل چاہا کہ عورت کو

کھینچکر اپنی گودی میں لیلے۔ مگر وہ اُسیطرح اُسکی گود میں پڑا رہا۔ آخر وہ عورت اُسپر جھکنے لگی۔ رامو نے اُٹھکر اُسکو اپنی گود میں کھینچ لیا۔ عورت اُسکی گودی میں تھی اُسکا بدن بالکل ڈھیلا پڑگیا تھا۔ اُسنے اپنا ڈھیلا ڈھیلا ہاتھ رامو کی گردن میں ڈالدیا۔ رامو کا دل مچل گیا۔ اُس نے چاہا کہ اُسکو اسیطرح لئے ہوئے سوجائے۔ مگر بھوک نے پیٹ میں مچل کر بیچین کردیا۔ آنتیں اینٹھنے لگیں۔ بھوک نے سارا مزہ کرکرا کردیا۔ وہ عورت کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ مگر یہ بھی چاہتا کہ پہلے کچھ کھانے کو ملجائے۔ وہ عورت کو پلنگ پر چھوڑکر دیوانوں کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا۔ عورت بولی:۔

"آج تم بالکل بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہو جگن"۔

مگر رامو کچھ نہ بولا، بھوک سے بدحواس دیوار کے چاروں طرف ٹٹولنے لگا شاید طاق پر کھانے کی کوئی چیز مل جائے۔ ایک تھالی میں لڈو دھرے ملے۔ اُس نے اُٹھاکر کھانا شروع کیا۔ ایک دو۔

عورت یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تھالی اُس نے چھین کر الگ رکھدی۔ اور بولی:

"جانتے ہو جگن! لڈو وہ گن کر رکھتے ہیں"۔

رامو کو پھر وہ پلنگ پر بٹھاکر پیار سے اُسکی طرف بڑھی۔ مگر دو لڈو پیٹ میں پڑ چکے تھے۔ سوئی ہوئی بھوک جاگ چکی تھی۔ اُسنے عورت پر ذرا دھیان نہ دیا۔ وہ پھر لڈو کی تھالی کیطرف بڑھا۔ دو لڈو اُسکے اور بھی ہاتھ آئے۔ عورت تھالی لیکر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ رامو کو بڑا غصہ آیا۔ اُسکا جی چاہا کہ اُسے قتل ہی کردے۔ مگر وہ لڈو کھانے لگا۔ یکایک اُسکو کچھ خیال آیا۔ اور وہ اِدھر اُدھر ٹٹولنے لگا۔ ایک کونہ میں پانی کا بھرا لوٹا

رکھا تھا۔ اُس نے اُٹھا کر پینا شروع کیا۔ اتنے میں عورت واپس آئی اور دوسری تھالی لیکر چلی۔ رامو نے جھپٹ کر تھالی پر ہاتھ مارا۔ عورت بولی۔

"ارے کُل دس ہیں۔ مت لو۔"

عورت نے پلٹ کر اُس سے چھیننا چاہا لیکن رامو نے اُسے زور کا دھکّا دیا اور کمرے سے نکل کر بھاگ گیا

۵۰۳

پرتو

بلونت سنگھ

صفحات:- ۲۰

گرمی کا موسم تین بجے کا وقت اسپر مصیبت یہ کہ ڈبّے میں جدھر وہ بیٹھا تھا جُھلس دینے والی دھوپ بھی اسی طرف کی تھی۔

اسٹیشن پر جب وہ ڈبّے میں گھُسا تو اُسے بیچ والی بنچ پر آرام دہ سیٹ مل گئی تھی۔ جب گاڑی پلیٹ فارم سے باہر نکل آئی تو اُسکے سامنے والی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے مسافروں کے سروں پر سورج چمکنے لگا۔ کھڑکیاں بند کریں تو ہوا رُکتی ہے۔ کھُلی رکھیں تو دھوپ جھلستی ہے۔ ایک سفید ریش بزرگ نے جرات سے کام لیکر اُس سے کہا "بیٹا تم ادھر آجاؤ۔ مجھے سائے میں بیٹھنے دو۔ تم نوجوان ہو میں ٹھیرا بوڑھا اور کمزور..."

وہ نوجوان تھا۔ اب وہ خط بھی بنوانے لگا تھا... مگر ابھی دنیا کے گرم و سرد سے واقف نہیں تھا محض کالج کا طالبعلم تھا۔ دھوپ کی تمازت سے اُسکا چہرہ تمتما اُٹھا۔ آنکھوں میں نمی سی آگئی۔ بے رحم سورج کی سوئیوں کی مانند چبھتی ہوئی کرنوں

اور لُو کے تھپیڑوں سے یقیناً وہ بے حال ہو جاتا لیکن ایک حسین تصوّر نے اُسے سنبھالے رکھا۔ سفر بھی کم رہ گیا تھا۔

کے ایل ساہنی سے انکے پرانے تعلقات تھے۔ ساہنی ایس۔ڈی۔او تھا آجکل ایک چھوٹے سے شہر ص میں رہتا تھا۔ غالباً چار برس پہلے ان لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب رہنے کا موقعہ ملا تھا۔ دونوں گھرانے کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے تھے پھر جدا ہوئے تو سینکڑوں میل کا فاصلہ انکے درمیان حائل ہو گیا البتہ خط و کتابت جاری رہی۔ اور جب ساہنی صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ اُنکے قریب لاہور ہی میں پڑھنے کیلئے آگیا ہے تو وہ اسکے والد صاحب کو جب کبھی چٹھی لکھتے تو اس بات کا ذکر بھی ضرور کرتے بھئی! آپ دُور ہیں لڑکا تو ہمارے قریب آگیا ڈیڑھ پونے دو گھنٹہ کا رستہ ہے۔ کم از کم چھٹیوں میں تو ہمارے ہاں چکر لگا جایا کرے۔

والد صاحب نے اُسے لکھا اور وہ جانے پر آمادہ ہو گیا۔ ساہنی صاحب کے ہاں اُسکی دلچسپی سوائے پرجوت کے اور کس کے ساتھ ہو سکتی۔ جب وہ جدا ہوئے تھے تو اسوقت پرجوت کی عمر دس برس سے کچھ اوپر ہو گی وہ اس سے پانچ برس بڑا تھا۔ وہ لوگ ساتھ ساتھ کھیلتے رہے۔ نہ معلوم لاڈلی جوت کس رنگ میں دکھائی دے چھوٹی عمر میں تو وہ پیاری دکھائی دیتی تھی۔۔۔۔ لیکن ابھی وہ چودہ برس ہی کی تو ہوئی ہو گی۔ ایسا کونسا انقلاب پیدا ہو گیا ہو گا۔

شہر ص کے اسٹیشن پر گاڑی رُکی، تو سُرندر نے اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اُٹھایا۔ بھیڑ میں دھکے کھاتا اور پستا ہوا پلیٹ فارم سے باہر آیا تو عجیب بے رونقی سی دیکھی۔ لاہور والی وہ چہل پہل کہاں۔ گرد آلود بھدے مکانات سڑکوں پر

دھول اُڑتی ہوئی۔ شربت بیچنے والوں کی چیخ پکار۔ نہایت بھدے تانگے۔ اگر اُسکے پاس سوٹ کیس نہ ہوتا تو وہ تانگے کی سواری کے بجائے پیدل چلنا پسند کرتا۔

تانگے کے بعد محلے کی گلیوں کی خاک چھاننی پڑی۔ آخر ساہنی صاحب کا مکان ڈھونڈ نکالا۔ دروازہ کھٹکھٹا کر وہ باہر سے مکان کا جائزہ لینے لگا۔ کم از کم اپنے محلے کے اچھے مکانوں میں شمار ہو سکتا تھا۔ دیواروں پر رنگ و روغن نہ ہوا تھا۔ اینٹیں جو کسی زمانے میں سُرخ رنگ کی ہوئی ہونگی اب مٹیالی سی ہو گئی تھیں اور جا بجا کائی جمی ہوئی تھی۔

دروازہ کھلا اور ایک ننھی ننھی سی لڑکی نے جھانک کر دیکھا وہ اسے پہچان نہ سکا ساہنی صاحب کی پہلے ہی تین لڑکیاں تھیں سُنا تھا اور بھی پیدا ہوئی تھیں۔ بچی اُسکا مُنہ تکنے لگی۔ کوٹ پتلون پہنے اور ٹائی لگائے ایک لمبا سا نوجوان اُسکے سامنے کھڑا تھا۔

"تمھارا نام کیا ہے مُنّی؟"

"بے بی"

"بے بی"

بے بی نے سر ہلا دیا۔

"اچھا تو تمھارے بابو جی گھر میں ہیں"

"نہیں"

"بی بی جی ہیں؟"

"ہیں"

"اُن سے کہو سُرندر آئے ہیں"

منی عرف بے بی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے اندر بلا لیا گیا۔

مسز ساہنی بہت اچھی طرح ملیں۔ اُسے پلنگ پر بٹھایا۔ اور بے بی اور ایک اُس سے بڑی لڑکی پہلے تو اُسے دور سے دیکھتی رہیں پھر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگیں اجنبی ماحول میں اُس نے کچھ بے چینی سی محسوس کی۔ پھر رفتہ رفتہ مانوس ہونے لگا۔ دیسی پیمانے کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھیں تو کمرا اچھا خاصا سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ آمنے سامنے بچھے ہوئے دو پلنگ جدید ڈیزائن کے بنے ہوئے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل اور کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے رنگ برنگ کے ہلکے پھلکے کپڑوں سے جدت کی بُو آتی تھی۔

اسکے لئے شکنجبین تیار کی گئی۔ باورچی خانے سے لوٹے میں چمچ چلنے کی آواز آرہی تھی۔

جب وہ شکنجبین پی رہا تھا۔ تو مسز ساہنی اُسکے ساتھ گذرے ہوئے دنوں کی باتیں کرنے لگیں۔ اُسے اُنکے گھر کا ستھرا اور شائستہ رکھ رکھاؤ ہمیشہ سے بہت پسند تھا۔ اور تھوڑی دیر بعد اُس نے محسوس کیا کہ اُس نے وہاں آکر کوئی غلطی نہیں کی۔ اتنے میں باہر والے کمرے سے بچیوں کے دادا کی آواز آئی۔ مسز ساہنی نے ہنس کر کہا۔ "بھئی اب تم کپڑے بدل ڈالو اور ذرا آرام سے ہو بیٹھو کب تک یوں کسے کسائے رہو گے اور میں اتنے میں انکے دادا کو پانی دے آؤں۔ اب سو کر اُٹھے ہیں۔ . . . . نوکر دوپہر کو دو گھنٹے کی چھٹی لے کر چلا جایا کرتا ہے۔

یہ کہکر وہ تو باہر چلی گئیں اور وہ کپڑے بدلنے لگا۔ اسکی نگاہیں جوتوں کو

ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اُسکے دل میں شبہ نے سر اُٹھایا وہ کہیں چلی نہ گئی ہو کسی رشتہ دار کے ہاں . . . .

تھوڑی دیر بعد مسز ساہنی آگئیں اُسے دیکھ کر ہنس پڑیں "تمہد تمھیں سمجھتا ہے سلک تو خیر آجکل ملتی نہیں ورنہ سلک کا تمہد اور اچھا معلوم ہوتا ہے"

"چچی! چچا کہاں ہیں۔"

"میں نے تمھیں بتایا نہیں؟ وہ آج ہی دورے پر گئے ہیں کل تک آجائینگے تمھیں بہت یاد کرتے ہیں۔ تم نے ہمیں اپنے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی . . ."

"وہ بات یہ ہوئی ناچچی! مجھے ان چھٹیوں کا خود کوئی علم نہیں ہمارے کالج کی ایک ٹیم دہلی جارہی ہے۔ لڑکوں نے بھی ساتھ جانے کی ٹھانی کئی لڑکے ساتھ گئے ہیں۔ بڑے معرکے کا میچ ہوگا۔ اسی لئے تین روز کی چھٹیاں ہوگئیں اتوار ملاکر چار ہوجائیں گی۔ آج کالج میں چھٹیوں کا اعلان ہوا اور آج ہی میں جلدی سے تیار ہوکر ادھر چلا آیا۔

مسز ساہنی نے پھر اُسکی ماں اور بُوا کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ بہت یاد آتی تھیں نہ معلوم کب ملنا ہو لیکن اُسکے دل میں دوسری ہی بات کھٹک رہی تھی آخر نہ رہ سکا "چچی! جوت کہاں ہے!"

"ہائے ہائے تو جوت کی کوئی بات ہی نہیں ہوئی تم دونوں تو ساتھ کھیلتے رہے ہونا تمھیں اب تک یاد ہے جوت۔ وہ بھی تمھیں بہت یاد کرتی رہتی ہے کہتی ہے کہ اب تو سُرندر بھیا لاہور آگئے ہیں۔ ہم جو جی چاہے گا ان سے منگوالیا کرینگے لاہور تو بڑا شاندار شہر ہے وہاں سب کچھ مل جاتا ہے . . . ."

وہ اسے یاد کرتی تھی۔ یہ سُنکر وہ بہت خوش ہوا لیکن وہ کہاں تھی۔ چمپی اصلی بات بتلاتی ہی نہیں۔ "کیا وہ پڑھتی ہے . . ."

"ہاں ہاں پڑھنے ہی تو گئی ہے بس اب آتی ہوگی۔ بہت باتیں کرتی ہے ایک دم کو چُپ نہیں بیٹھتی۔ چھٹی کے بعد سہیلیوں سے باتیں کئے جاتی ہے۔ گھر آنا تو اُسے یاد ہی نہیں رہتا۔"

"اور چنّی بھی پڑھتی ہے؟" اُس نے جوت سے چھوٹی لڑکی کی بابت پوچھا

"ہاں پڑھتی ہے لیکن اس سال اُسے ٹائیفائڈ ہوگیا تھا۔ بچاری بہت کمزور ہوگئی تھی۔ ہمنے اُسے پڑھنے سے اُٹھالیا۔ اب اپنی بُوا کے ہاں دیہات میں گئی ہوئی ہے"

اگرچہ وہ دیگر لڑکیوں کی بابت بھی جاننا چاہتا تھا لیکن وہ بولا نہیں، چُپ چاپ چھوٹی بچیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ مسز ساہنی کچھ بھانپ کر بولی "اب ہمارے ہاں پانچ لڑکیاں ہیں خیر سے۔ بھلا پرماتما سے کوئی پوچھے کہ ہمیں اتنی لڑکیوں کا کیا اچار ڈالنا ہے۔ سب سے پہلے جوت پیدا ہوئی۔ خیر ہمنے خیال کیا پھر چنّی ہمیں کچھ تشویش ہوئی لڑکے کے منہ کیلئے ترس رہے تھے لیکن یہاں تو لڑکیوں کا تانتا بندھ گیا۔ اب ہمارے پاس فوج کی فوج ہے۔"

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اتنے میں انکی کوئی سہیلی آن پہنچیں صحن میں دیوار کا سایہ اُتر آیا تھا۔ وہ دونوں باہر جا بیٹھیں اور سُرندر ایک پُرانے رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد تیز تیز قدموں اور باریک سُریلی باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اُسنے نظر اُٹھائی کھڑکی کے آگے صحن میں ایک رنگین سا سایہ دکھائی دیا۔ اُسکا دل دھڑکنے لگا۔ شاید وہ جوت ہی تھی۔ ماں نے اُسے غالباً اُسکی آمد کی خبر سُنائی۔ اور

جوت انتظار کر رہی تھی۔ بڑی بے چینی سے ... اس نے کہانی کا پلاٹ تو نہ بنایا بس یہ طے کر لیا کہ کہانی کا مرکزی خیال کیا ہوگا ... "اچھا تو ایک تھا لڑکا ..."

"راجہ نہیں؟"

"اب اتنی بڑی ہو گئی ہو، کیا اب بھی راجہ ہی کی کہانی سنو گی؟ ... واہ ...، ایک تھا لڑکا۔"

"ہوں۔"

"وہ لڑکا پہلے تو دیہات کے اسکول میں پڑھتا رہا اور پھر ..."

"اس لڑکے کا نام کیا تھا؟"

"نام؟ اسکا نام ــــ ارون تھا ... ارون پہلے تو دیہات کے اسکول میں پڑھتا رہا۔ اور جب دسویں کا امتحان پاس کر لیا تو پھر اُسکے باپ نے اُسے لاہور میں پڑھنے کیلئے بھیجدیا ..."

"کیا اُسکا باپ بہت امیر تھا؟ ..."

"بہت ... لاہور پہنچکر وہ کالج میں داخل ہو گیا ..."

"کونسے کالج میں؟"

اب اُسے محسوس ہوا کہ یہ گڑھا ہوا قصہ بھی ذرا سوچ سمجھ کر سنانا پڑیگا۔ یہاں تو آغاز ہی میں جرح ہونے لگی ہے ... "وہ گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا ..."

"کیا وہ بہت اچھا کالج ہے؟"

"بہت ... اور ہاں بھئی مجھے بلا ضرورت مت ٹوکا کرو اسطرح میں کہانی بھول جاتا ہوں ... کیا کہہ رہا تھا میں ..."

"وہ گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا۔۔۔"

"ہاں ٹھیک ۔۔۔ اور ہوسٹل میں رہنے لگا۔"

"بورڈنگ ہاؤس میں نا؟"

"ہاں۔۔ تمھیں شاید معلوم ہو یا نہ ہو کالجوں کے لڑکے خصوصاً لاہور کے کالجوں کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ بڑے اعلیٰ کپڑے پہنتے ہیں، سگرٹ اور شراب کا شوق بھی کرتے ہیں چشمہ لگاتے ہیں سنیما دیکھتے ہیں گیت گاتے ہیں اور آہیں بھرتے ہیں۔۔۔"

"آہیں کیوں بھرتے ہیں؟۔۔۔"

"مطلب یہ ہے۔۔۔ کہ تم جانتی ہو جب آدمی جوان ہو جائے تو پھر لڑکیاں بہت اچھی لگنے لگتی ہیں"

: جوت کے رخساروں پر ہلکے گلابی رنگ کی رو دوڑ گئی۔

"اور وہ لڑکا۔۔۔ ارون۔۔۔ بچارا دیہات کا رہنے والا۔ وہ سیدھا سادا لباس پہنتا تھا۔ نہ شربت پیتا تھا نہ سوڈا۔۔ بس سمجھ لو اسے کسی بات کی کچھ خبر نہیں تھی اور اُسکے ساتھی اُسکا مذاق اُڑایا کرتے تھے اگر وہ اُنکے قریب سے گذرتا تو اُس پر آوازے کستے۔ اُسکے پائنجامے اور سیدھے سادے کرتے کی کھلی اُڑاتے۔۔۔ ارون بچارا بہت پریشان ہوا اور جب گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر گیا تو باپ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ اب ب بابو۔۔۔ ج جی۔ میں پڑھنے نہیں جاؤنگا لاہور میں۔۔۔" یہ کہکر اُسنے اپنے اُلٹے ہاتھ سے آنکھوں کو ملا۔ جیسے ارون کی نقل اُتار رہا ہو اس بات پر جوت کو بہت زور کی ہنسی آئی۔

"بدھو کہیں کا۔۔۔ اچھا پھر؟"

"باپ نے پوچھا کیوں بیٹا کیا بات ہے، اسپر اُسنے سارا قصہ کہہ سُنایا۔ چنانچہ اُسکے باپ نے اُسے چھٹیوں میں بہت اعلیٰ کپڑے سلوا دیئے اور جب سوٹ بوٹ پہنے پہنچا کالج میں تو۔۔۔"

سرندر نے کھانس کر پہلو بدلا "ہاں جوت بھئی کہانی کچھ پسند بھی ہے۔ یا میں یونہی سُنائے جا رہا ہوں . . ."

جوت کچھ شرما سی گئی۔ اُسکے اصرار کرنے پر اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کہانی پھر شروع ہوگئی۔

"ایک روز جبکہ ارون سنیما دیکھنے کیلئے گیا تو وہاں اسے وہی لڑکی دکھائی دی۔ اسوقت وہ اکیلی کھڑی تھی۔ ارون سوچنے لگا کہ گفتگو کا آغاز کیونکر کیا جائے۔ اگرچہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں محبت کا جواب محبت میں دیتی رہی تھی لیکن پھر یقینی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا ــــ انگریزی سنیما گھر میں عورتوں کے ٹکٹ کیلئے علیحدہ کھڑکی بنی ہوئی ہے۔ چونکہ اُس روز بھیڑ تھی۔ یہ بہانہ اچھا تھا۔ وہ لڑکی کی طرف بڑھا اور کہنے لگا اگر تکلیف نہ ہو تو مجھے ایک ٹکٹ لے دیجئے آج بھیڑ بہت زیادہ ہے . . . لڑکی پہلے تو جھجکی پھر اُس نے جلدی سے ٹکٹ لے کر اُسکے ہاتھ میں تھما دیا اور شرما کر آہستہ سے کہنے لگی۔ 'میرے ساتھ دو سہیلیاں ہیں اسوقت باتھ روم میں گئی ہیں۔ آتی ہی ہونگی'۔ وہ اسکا مطلب سمجھ گیا۔ اور خود ہی اُس سے پرے چلا گیا ــــ اُس روز اُسکی طبیعت بہت خوش تھی۔ اپنی معشوقہ کی میٹھی آواز اُسکے کانوں میں شہد گھولتی رہی۔ رات وہ دیر تک اُسکے تصور میں جاگتا رہا . . . ."

کچھ دیر رُک کر سرندر نے جوت کی صورت کا جائزہ لیا۔ وہ لجا رہی تھی لیکن قصے میں اُسکی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"اُس روز کے بعد باغ میں دُور ہی دُور سے درشن ہوتے رہے۔ اُس نے چاہا کہ اُس کا گھر دیکھ لے لیکن جب وہ اُن کا پیچھا کرتا تو لڑکی گھوم کر اشارے سے اُسے

منع کر دیتی۔ غالباً اُسے اپنی سہیلیوں کا خوف تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر ایکدن ایک قدم اور بڑھایا گیا۔ اُس روز شام ہو چکی تھی۔ وہ باغ میں بنی ہوئی نقلی پہاڑیوں میں ایک کے اوپر کھڑا تھا۔ ادھر سے وہ لڑکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ آتی دکھائی دی۔ وہ تعداد میں پانچ تھیں باقی چار تو کسی مسئلہ پر بڑے زور و شور سے بحث کر رہی تھیں صرف اُس کی محبوبہ چُپ چاپ اُن کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ وہ ایک موٹے سے درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ جب وہ قریب سے گذریں تو اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ پہلے تو ڈر گئی لیکن اُسے دیکھا تو شرما گئی اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی پھر بولی 'مجھے جانے دیجئے وہ دور جا کر مجھے اپنے ساتھ نہ پائیں گی تو نہ معلوم کیا سمجھیں'۔ اُس نے جلدی سے اُسے ایک مرتبہ اپنے گلے سے لگا لیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُسے بہت سی باتیں پوچھنی تھیں۔ 'آپ کب تک ستائیے گا مجھے نہ آپکا نام معلوم ہے نہ پتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لڑکی بہت جلدی میں تھی 'کوکلا نام ہے میرا اب جاتی ہوں کل پتہ کاغذ پر لکھ پھینک دوں گی دھیان سے اُٹھا لیجئے گا کسی کو پتہ نہ چلے اور میری طرف زیادہ نہ دیکھا کیجئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شک ہو جائیگا۔" یہ کہہ کر وہ اُس کے بازوؤں سے مچھلی کی طرح پھسل کر بھاگ گئی ۔ ۔ ۔ ۔"

جوت گہرے گہرے سانس لے رہی تھی اُس کی آنکھوں میں کیف انگیز غبار سا دکھائی دینے لگا۔ فضا دُھندلی سی ہوتی جا رہی تھی اور جوت اسطرح دکھائی دے رہی تھی جیسے اُس کے جسم کی تعمیر اسی دُھندلاہٹ سے کی گئی ہو جیسے وہ سُرمئی فضا میں گھل مِل کر نظروں سے اوجھل ہو جائے گی پھر اُسکے ہونٹ ہلے۔

"کیا کوکلا نے اُسے اپنا پتہ دے دیا؟"

ہل کے سائے میں

کرشن چندر

صفحات :- ۱۴

جب بیلوں کے سائے قدموں میں آگئے، اور پسینہ پاؤں تلے گرنے لگا۔ تو بختیار نے ہتھیلی کو خمیدہ کرکے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا، اور پسینہ ہتھیلی پر سے پانی کی دھار کی طرح نیچے کھیت کی بھربھری مٹی میں جذب ہوگیا۔ بیلوں کے جسم بھی پسینے میں شرابور ہوگئے تھے اور انکی گردنوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ بختیار نے دوسرے ہات سے اپنے سر سے پسینہ پونچھا، اور پھر پانی کی دھار ہتھیلی سے نیچے زمین پر جاگری۔ بختیار نے ہل کو بیلوں سے جدا کیا اور انھیں منو کے گھنے سائے میں جا کھڑا کیا، اور پھر خود بھی منو کے تنے سے ٹیک لگا کے زمین پر دراز ہوگیا۔ بیل تو کچھ دیر کھڑے ہانپتے رہے۔ پھر زمین پر بیٹھ گئے۔ اور خشک زمین اور چھوٹے چھوٹے کنکروں اور سنگریزوں میں گھاس کے تنکے تلاش کرنے لگے، انکے گرم سانس سے کئی کنکر گیلے ہوگئے اور تنکوں کی تلاش میں بیلوں نے مٹی بھی چبا ڈالی پھر بختیار ذرا

دم لے کے اُٹھا اور اُس نے مکئی کے خشک پودے اور گھاس کی بھری بیلوں کے آگے ڈالدی اور پھر منو کے تنے سے ٹیک لگا کے ترچھا لیٹ گیا۔ اُسنے تھکی تھکی نگاہوں سے دور اوپر منو کے پھیلے ہوئے چھتنارے کی طرف دیکھا جس میں سیکڑوں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ کتنا پرانا اور بوڑھا تھا یہ درخت، شاید جب سے یہ گاؤں بسا ہوگا یہ درخت یہاں پر لگا ہوگا یا شاید جب سے دنیا بنی ہے یہ درخت بھی یہاں موجود تھا۔ بہت پرانا تھا یہ درخت، کم از کم جب سے بختیار نے ہوش سنبھالا۔ اُس نے اس درخت کو اسیطرح اپنا گھنا سایہ پھیلائے دیکھا تھا۔ اسیطرح ابا نے دیکھا تھا۔ اسی طرح ابا کہتے تھے کہ ابا کے ابا نے اس درخت کو دیکھا تھا۔ وہ اوپر دیکھتے دیکھتے اُس شاخ کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا جہاں لڑکپن میں اُس نے پینگ لگائی تھی۔ اب وہ شاخ بڑھکر ڈال بنگئی تھی عظیم ڈال، ہاں اسی ڈال پر پینگ لگاتا تھا۔ وہ اور اُس کا دوست عبدالکریم بیچارہ عبدل دو سال ہوئے مر گیا تھا۔ ایکروز پولیس والے اُسے بیگار میں پکڑ کر لیگئے اور پھر اُسنے سُنا کہ عبدل نے وہیں تھانے میں دم دیدیا۔ سُنا ہے کہ تھانیدار نے اُسے بہت بُری طرح پیٹا تھا۔ اللہ جانے یہ تھانے والے اتنے ظالم کیوں ہوتے ہیں تھانیدار پر مقدمہ بھی چلا تھا۔ مگر وہ بری ہو گیا بھلا حاکم لوگوں کے خلاف کیا چارہ جوئی ہو سکتی ہے۔ عبدل کی بیوہ کم عقل تھی۔ جو تھانے والوں سے لڑی آخر اُسے بھی گاؤں چھوڑنا پڑا۔ بڑی اچھی لڑکی تھی وہ۔ سُنا ہے راولپنڈی میں جا کے کنجری بنگئی ہے کیسی قسمت خراب تھی بیچاری کی۔ اُسکی شادی بختیار سے ہو رہی تھی لیکن عبدل کو اتنی محبت تھی اُس سے کہ بختیار نے خود کہہ سُنکر اپنی شادی منسوخ کرادی تھی۔ اگر عبدل خوددار تھا تو بختیار بھی کم نہ تھا، عبدل کے بیٹے کو بختیار نے اپنے بیٹوں کی طرح پالا، اور آج فکرو

اُسکے گھر کا ایک فرد تھا اور جب اُسکی شادی مرجانی سے ہو جائیگی تو اُسکے دوست کی روح اُس سے کتنی خوش ہوگی۔ بختیار کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا جیسے وہ منو کی شاخوں میں اپنے مرحوم دوست کی شبیہہ دیکھ رہا ہو۔ وہ اور عبدل کتنی دور تک اونچے اُن شاخوں تک پینگ لیجاتے تھے۔ اور پھر بختیار کی آنکھوں میں وہ لمحہ زندہ ہو گیا۔ جب بختیار اور بیگماں دونوں پہلی بار اس پینگ پر جھولے تھے اسیطرح دوپہر کا وقت تھا۔ اور ابا نیچے بیلوں کو پانی پلانے ندی پر چلے گئے تھے، اور بیگماں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اپنا ریوڑ چراتی چراتی ادھر آنکلی تھی۔ دراصل ریوڑ چرانے کا تو بہانہ تھا ورنہ ان دونوں نے ملنے کا بندوبست پہلے ہی سے ٹھیک کر رکھا تھا اور پھر بیگماں نے باتوں ہی باتوں میں اپنے چھوٹے بھائی کو نیچے ندی پر بھیجدیا۔ اور پھر وہ کتنی ہی دیر تک پینگ جھولتے رہے تھے۔ اکٹھے۔ ادھر سے اوپر منو کی شاخوں میں جاتے ہوئے بختیار ہلارے کیلئے زور لگاتا۔ اور اُدھر اوپر سے تنے کی طرف آتے ہوئے بیگماں زور لگاتی۔ اور کبھی کبھی وہ دونوں غلطی سے اکٹھے زور لگاتے اور یوں پینگ پر کھڑے کھڑے اُن کے سینے ایکدوسرے سے لگ جاتے، اور بختیار کو ایسا معلوم ہوتا گویا اُسے کسی شعلے نے چھولیا ہو۔ اور بیگماں کا سانس زور زور سے چلنے لگتا۔ اور اُسکی نگاہیں آپ ہی آپ نیچی ہو جاتیں۔ اور اوپر جاتے ہوئے ہلارے میں بختیار گاتا اور نیچے جاتے ہوئے ہلارے میں بیگماں جواب دیتی اور اسطرح وہ دیر تک پینگ بڑھاتے رہے حتیٰ کہ اوپر کے ہلارے میں اُنکے سر منو کی بلند شاخوں میں کھو جاتے۔ اور نیچے آتے ہوئے اُنکا جی بیٹھنے لگتا۔ اور پھر بیگماں نے آہستہ سے کہا بس مجھے ڈر لگتا ہے تو انھوں نے پینگ بڑھانا بند کر دیا۔ اور پینگ آہستہ آہستہ نچلے ہلاروں میں آگئی۔ پہلے بختیار منہ بڑھا کر

منو کی شاخوں سے پتے توڑ لیتا تھا۔ پھر پتے تو کیا شاخیں بھی دور اوپر رہ گئیں۔ اور ہلائے صرف تنے تک رہ گئے۔ اور پھر ہینگ آہستہ آہستہ رُک گئی تھم گئی۔ اور بختیار نیچے اُتر آیا اور اُس نے دونوں ہاتھ بیگماں کی کمر میں ڈال دیئے۔ اور اسے ایک نازک گڑیا کیطرح نیچے زمین پر اُتار کر رکھ دیا۔ بیگماں کے ہاتھ رسّے کو زور سے پکڑنے سے گہرے سُرخ ہو گئے تھے۔ اور کہیں کہیں ہتیلیوں پر چھلے داغ پڑ گئے تھے۔ بختیار اُنھیں دیر تک سہلاتا رہا۔ اور بیگماں ایکطرف گردن جھکا کر ترچھی نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے بنفشے کے ڈھیر سے پھول اکٹھے کر لئے۔ اور انھیں اپنے بالوں میں افشاں کیطرح چُن لیا۔ اتنے میں اُسکا بھائی آگیا۔ اور بیگماں اپنا ریوڑ سنبھالے کچھ کہے سُنے بغیر وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اور دیر تک بختیار ہینگ کے پاس کھڑا رہا۔ اور اسے دیر تک ہلکے ہلکے ہلائے دیتا رہا۔ بختیار کو یہ سب کچھ اسطرح یاد آیا جیسے کل کی بات ہو اور کل ہی کی بات تو تھی ابھی بختیار اور بیگماں کے نکاح کو بارہ نہیں تو پندرہ برس ہو گئے ہونگے۔ آج سے دسویں برس پہلے تو بڑا کال پڑا تھا۔ اور گاؤں کے آدھے سے زیادہ کسانوں کی زمین ساہوکاروں اور زمینداروں نے قرق کرالی تھیں اور خود بختیار کو اپنی جدّی زمین کا ایک ٹکڑا۔ اپنے دھان کے کھیتوں کا سب سے اچھا ٹکڑا فروخت کرنا پڑا تھا۔ وہ کتنے بُرے دن تھے وہ، اناج کہیں ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا، اور کسان کچّی ناشپاتیاں اُبال کر کھاتے تھے ——

پتے تک تو اُبال کے کھا گئے تھے لوگ اور بختیار کو یاد آیا کہ جاگیردار نے مالیہ پھر بھی معاف نہ کیا تھا۔ بختیار کے بھولے بھالے چہرے پر ایک تلخ جذبے کی رو دوڑ گئی۔ دنیا میں جاگیردار سے بڑھ کے کوئی ظالم نہیں ہے۔ پتہ نہیں اللہ نے اُسے کیوں

پیدا کیا۔ کوئی بات ہوگی، خدا جانے، ہاں اس کال میں بھی اُسکا گھر اُسکا ڈیرا سلامت رہا ہاں ٹھیک یاد آیا۔ جب تو بیگماں سے اُسکا بیاہ ہو چکا تھا۔ اور جب تو مرجانی بھی چار پانچ برس کی ہوگی۔ ضرور بیگماں سے نکاح کئے اُسے پندرہ برس ہو گئے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے ابھی ایک پل ہی گذرا ہے یہی پینگ تھی۔ یہی منو یہی دوپہر۔ اب دوپہر جا رہی تھی اور بیگماں ابھی تک کھانا لیکے نہیں آئی تھی۔ آجائیگی اسکا گھر کون یہاں سے نزدیک تھا۔ ڈیڑھ میل سے کم کیا ہوگا اور پھر راستہ کی چڑھائی اب آتی ہی ہوگی۔ مرجانی ساتھ ہوگی، مزے میں باتیں کرتی ہوئی آئیں گی۔ ان عورتوں کو بات چیت کرنے کی کیسی بُری عادت ہوتی ہے۔ ہر وقت گٹاریوں کی طرح چنچم چاخ میں لگی رہتی ہیں، کبھی چُپ چاپ ہو جائیں تو سمجھو مر گئیں۔ جیتے جی تو بات کرنا بند نہیں کریں گی، میں تھوڑی دیر کے لئے سو کیوں نہ جاؤں۔

جب بیگماں اور مرجانی روٹی لے کے منو کے نیچے پہنچیں تو تنے سے ٹیک لگائے بختیار گہری نیند سو رہا تھا۔ بیگماں کا چہرہ دھوپ میں مرل ہو گیا تھا اور مرجانی کے اوپر کے ہونٹ کے کنارے کنارے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں جمع ہو گئی تھیں۔ جو بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔

مرجانی نے کہا۔ "ابا کو جگا دیں؟"

بیگماں نے کہا "ذرا گھڑی دو گھڑی آرام کرنے دے۔ مرد ہے۔ کڑی مشقت کرتا ہے۔"

مرجانی نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا۔ "فکرو کہیں دکھائی نہیں دیتا۔"

بیگماں نے جواب دیا، وہ نیچے دھان کے کھیتوں میں کام کر رہا ہوگا۔ ندی کنارے جا اُسے بُلا کے لا۔ ورنہ وہ خود تو آئیگا نہیں۔ اُسے یہ سُدھ بُدھ کہاں کہ روٹی بھی کھانی ہوگی"۔

مرجانی جلدی سے اُٹھی، اور جانوروں کی گھیل سے اُتر کر ندی کیطرف چلی گئی۔

فکرو اپنے کام سے فارغ ہو کے ندی کے کنارے پتھر پر بیٹھا اپنی کیچڑ سے بھری ٹانگیں دھو رہا تھا۔ ٹانگیں دھونے کے بعد اُس نے اپنا مُنھ دھویا۔ اور پھر مرجانی بھی اپنا مُنھ دھونے لگی اور فکرو نے کہا۔ "ناں"۔

"کیوں؟"

"تمھارے اوپر کے ہونٹ پر جو ننھے ننھے موتی ہیں نا۔ وہ سب ٹوٹ جائینگے"

"تو پھر" مرجانی نے یکدم اپنے مُنھ پر پانی پھینکتے ہوئے کہا۔

فکرو پتھر کی سِل پر جُھک گیا۔ صاف شفاف چمکتا ہوا ٹھنڈا پانی تھا پتھروں کا رنگ ہلکا نیلا، اور پانی کا رنگ ہلکا نیلا اور جہاں جہاں پتھروں پر سبز کائی تھی وہاں پانی کا رنگ اسفدرشاداب سبز تھا جیسے بہار میں مخملیں گھاس کا ہوتا ہے یا دھان کی پہلی پنیری، اور چھوٹی چھوٹی چٹانیں پانی سے باہر اُبھری ہوئی تھیں۔ اور جا بجا پانی کی ننھی ننھی ٹابیں بن گئی تھیں جنکی تہ میں حسین رنگا رنگ سنگریزے بچھے ہوئے تھے اور خوبصورت مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ فکرو پانی پر جُھکا جُھکا دیر تک مچھلیوں کی سبک روی دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھوں سے پانی میں جھپٹا مارا اور ایک مچھلی پکڑ لی۔

"ہائے اسے چھوڑ دو۔" مرجانی بولی: "دیکھو تو کیسے منہ کھول کر ہانپ رہی ہے۔ ننھی سی مچھلی ہائے اسے چھوڑ دو!"

فکرو نے مچھلی پانی میں چھوڑ دی۔ یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہوا۔ مچھلی تھوڑی دیر پانی کے اندر بھی سناٹے میں رہی۔ گم بے سُدھ سی۔

"مر گئی؟" مرجان نے متفکر لہجہ میں پوچھا۔

فکرو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر میں مچھلی پھر تیرنے لگی۔ فکرو ہنسنے لگا۔ مرجانی بھی ہنسنے لگی۔ فکرو نے کہا: "میرا جی چاہتا ہے کہ تم بھی اس مچھلی کی طرح میرے قابو میں آجاؤ۔ ایسے کہ میرے ہاتھوں میں ہانپنے لگو، کبھی جی چاہتا ہے کہ تمھیں اتنا گھونٹوں کہ تمھارا دم نکلنے لگے۔ کبھی جی چاہتا ہے کہ تمھارے قدموں میں سر رکھ دوں۔ مرجان ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

مرجانی نے کہا: "چلو روٹی کھالو ابّا انتظار کر رہے ہیں۔"

"جواب نہیں دوگی؟"

"کیا جواب ہے تمھاری باتوں کا اُوٹ پٹانگ تو باتیں ہیں آج کچھ کام بھی کیا ہے یا دن بھر مچھلیاں ہی پکڑتے ہو؟"

"کوئی اتنا تو کام کر کے دکھائے، ادھر والے سارے کھیت میں گوڑی

"نہیں میں تمھیں اُٹھا کے لے چلوں گا۔"

"آپا پیٹیں گے۔"

"اچھا آدھے رستے تک سہی۔"

آدھے رستے تک وہ اُسے اُٹھائے لایا۔ آدھے رستے میں ٹبنگ کا درخت تھا جہاں اُس نے مرجانی کو اُتار دیا۔ اور پھر پتھر مار مار کر دو تین سوکھے کالے خشک ٹبنگ فکرو نے نیچے گرائے، ایک وہ خود کھانے لگا۔ دو اُس نے مرجانی کو دیدیئے۔ مرجانی کو سوکھے ٹبنگ بہت بھاتے تھے۔ ٹبنگ جب تک رسدار ہوں کھٹے کسیلے ہوتے ہیں۔ بہت پک جائیں تو انمیں مٹھاس پڑ جاتی ہے لیکن پھر بھی کھاتے وقت گلے میں پھندا لگاتے ہیں۔ ہاں جب درخت سے لگے لگے سوکھ جائیں اور رس خشک ہو جائے اور وہ کالے اور سیاہ پڑ جائیں۔ اُسوقت انکے کھانے کا مزہ ہے۔ بالکل خشک انجیروں کا سا مزہ دیتے ہیں فکرو کو تر خشک انجیر بھی پسند نہ تھے۔ مگر نہ جانے مرجانی کو یہ سوکھے سڑے سیاہ ٹبنگ کھانے میں کیا لطف آتا تھا۔

ٹبنگ کھاتے کھاتے وہ لوگ منو کے درخت کے پاس پہنچگئے۔ بیگماں نے دو رکابیوں میں لسی بھر کے رکھدی، پھر مکئی کی روٹیاں نکالیں اور گنہار کا ساگ، اور پسی ہوئی لال مرچیں اور نمک، سالن بہت کم تھا خشک چٹنی بھی بہت کم تھی مگر روٹیاں بہت تھیں۔ اور مٹکا لسی سے بھرا تھا پہلے سب نے لسی پی اور پھر روٹی کھانے لگے۔ مکی کی موٹی موٹی روٹیاں اور گنہار کا ساگ اور لال مرچ کی چٹنی، آہستہ آہستہ اُنکے جبڑے چلتے رہے۔ اور جب وہ تھک

جاتے اور مُنھ کا لُعاب کام نہ کرتا۔ تو وہ لسّی کے دو گھونٹ حلق سے اُتار لیتے
وہ لوگ روٹی کھا رہے تھے کہ چاچا محمدو اور فتح محمد شہر سے پیشی بھگت کے
آن پہنچے اور منو کے نیچے بیٹھ کے سستانے لگے۔

"بسم اللہ کرو" بختیار بولا۔

چاچا محمدو نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور فتح محمد نے بھی فوراً روٹی کی
طرف ہاتھ بڑھایا۔ بیگماں نے مٹکی سے ایک ایک رکابی لسّی کی بھر کے پیش کی

"مقدمہ کا کیا ہوا؟" بختیار نے پوچھا۔

چاچا محمدو بولے "خلاف فیصلہ ہوا۔ ہمارے وکیل نے حرامزادے
بنئے کے وکیل سے ساز باز کر لی"

"پھر؟"

"سوچتا ہوں ایک کھیت بیچ دوں"

"ابھی نہیں۔ قرقی آنے دو۔ قرقی آنے پر بھی ٹالو" بختیار بولا۔ "کوئی
بولی نہیں دیگا گاؤں میں، بنیا سالے کا گلا گھونٹ ڈالیں گے"

"بنیا نہ ہو تو بیج کون دے" فتح محمد نے پوچھا۔

"ہاں بنیا نہ ہو تو بیج کون دے۔ اور بیج نہ ہوں تو فصل کیسے ہو اور جب
فصل ہو تو کچھ بنیا لے جائے کچھ سرکار۔ ہم پھر وہی پھانک کے پھانک۔ یہ چکر سمجھ
میں نہیں آتا۔ مگر کھیت نہیں بیچو گے چچا۔ تمھیں کہے دیتا ہوں۔ ہم سب گاؤں والے
تمھاری مدد کرینگے"

"اللہ رزاق ہے" فتح محمد نے ڈکار لیتے ہوئے کہا۔

کھانا کھا کے وہ حقہ پینے لگے۔ فکرو نے کہا۔ میں بیلوں کو پانی پلا لاؤں
وہ بیلوں کو کھول کے ندی کی طرف لے چلا۔ ساتھ میں مرجانی بھی چلتی گئی۔ چاچا
محمدو، فتح دین اور بختیار خاموشی سے انھیں تکتے گئے۔

"نکاح کب ہے؟" محمدو نے پوچھا۔ اُسکی نگاہیں مرجانی اور فکرو کی پُشت
پر تھیں۔ جواب چلتے چلتے ایکدوسرے کے بہت قریب آگئے تھے۔

"پھاگن میں!" بیگماں بولی۔

"ہاں اب دیر نہ کرو۔" محمدو نے حقہ چھوڑ دیا۔ "اچھا بختیار میٹا چلتے
ہیں۔ خدا تجھے سلامت رکھے بیٹی۔ مرجانی کا نکاح جلدی کر دو۔"

کھانا کھا کے بختیار پھر سو گیا۔ بیگماں اسکے پاؤں دبانے لگی۔ فکرو بیلوں کو
پانی پلا کے لے آیا۔ تھوڑی دیر وہ اور مرجانی باتیں کرتے رہے۔ پھر
مرجانی بھی منو کے ٹھنڈے خنک سائے میں سو گئی۔ اور بیگماں اپنے شوہر کے پاؤں
دباتی رہی اور فکرو نے بیلوں کو ہل میں جوتا اور کھیتوں میں چلا گیا

بیل کھیت میں چلتے گئے۔ ہل بھر بھری مٹی میں گھُستا گیا، اور کھیت فکرو
کے چاروں طرف پھیلتا گیا۔ یہ محض کھیت نہ تھا۔ یہ فکرو کی ساری زندگی تھی۔ اسکی
کل کائنات، وہ اس کھیت کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔ یہاں زمین سخت
تھی وہاں نرم۔ یہاں نشیب ہے وہاں ذرا فراز۔ یہ ایک کھیت نہ تھا۔ ایک بڑے
خاندان کا افسانہ تھا۔ اسکی مٹی میں انسانوں کی محنت کا پسینہ تھا۔ اور لہو۔ اور وہ
سارے خواب جو کسان ہل چلاتے وقت دیکھتا ہے، زندگی کی ساری آرزوئیں
اور اُسکی ساری کی ساری تمنائیں اور اُسکے سارے سُکھ دُکھ عیش غم آرام اسی

جانی پہچانی مٹی میں چھپے ہوئے تھے۔ فکرو اس کھیت کے ذرّے ذرّے کو جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس مینڈھ پر چوہوں نے بل بنائے تھے۔ خرگوشوں کے بھٹ کہاں تھے اور سیہ کے گھر کا منھ کہاں تھا۔ اور باڑھ کے غربی کنارے پر ہاڑیوں کے درختوں کی قطار پر کونسے پرندوں نے اپنے گھونسلے بنائے تھے۔ فکرو بھی ہل چلاتے چلاتے ایک خوبصورت خواب دیکھنے لگا۔

دوپہر کی حدّت میں آسمان کی نیلاہٹ گم ہوگئی تھی۔ آسمان بہت اُوپر چلا گیا تھا۔ صبح کے وقت اور شام کے وقت آسمان بہت قریب آجاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ابھی زمین پر گر پڑے گا۔ ابھی زمین پر گر کے چکنا چُور ہو جائے گا لیکن دوپہر کے وقت آسمان بہت دور اوپر ہوتا ہے اور دھوپ بہت تیز ہوتی ہے۔ اور سورج ساکن سا معلوم ہوتا ہے۔ ساکن اور نقلی، اور سناٹا چاروں طرف پھیلا ہوتا ہے۔ اور جس گرمی سے اسقدر نہیں ہوتا جتنا اس سناٹے سے ہوتا ہے جیسے گلے میں پھندا سا لگ رہا ہو ایسے وقت میں بیل گھومتے جاتے ہیں۔ کسان ہل چلاتا جاتا ہے، اور اس کے خواب پگھل پگھل کر اُس کے تصوّر میں جتنی ہی تصویریں بناڈالتے ہیں۔ فکرو نے بھی یہ تصویریں دیکھیں۔ اور وہ ہل چلاتا رہا۔ حتیٰ کہ دوپہر اتر گئی۔ سہ پہر آگئی۔ پھر سہ پہر بھی ڈھلنے لگی، اور بختیار اپنی نیند سے جاگا۔ اور اُس نے فکرو سے لے کے ہل تھام لیا۔ اور مرجانی نے فکرو کو لسّی پلائی۔ اور خالی مٹکا اور خالی ٹوکری روٹیوں کی ہاتھ میں لیکر بیگماں کے ساتھ گھر چلی گئی۔ اور فکرو آہستہ سے پینگ پر جا بیٹھا۔ اور اسے اُونچا اُونچا بڑھاتا گیا تاکہ گم ہوتی ہوئی مرجانی کو دور تک دیکھ سکے، دیکھتا جائے دیکھتا جائے

پھر مرجانی بیگماں کے ساتھ بہت دُور چلی گئی۔ اور ہولے ہولے فگروگانے لگا۔

اور کھیت میں ہل چلاتے چلاتے بختیار جواب دیتا گیا۔ اور سورج مغرب میں ڈھلتا گیا۔